خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
دسمبر 2013

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

دسمبر 2013
جلد 41 شمارہ 8
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
دسمبر۔ سال رواں کا آخری مہینہ۔
ایک اور سال کا سفر تمام ہونے کو جارہا ہے۔
یہ سال بھی امن کی نوید نہ لا سکا۔ خوف، بے یقینی، رنج و آلام کے سائے منڈلاتے رہے۔ کسی نہ کسی عنوان سے خون بہتا رہا۔ کہیں عقیدے اور مسلک کے نام پر، کہیں حقوق اور آزادی کے نام پر۔ ایک بے مقصد جنگ کا حصہ بنتے اس حال کو آپہنچے ہیں کہ نہ مسافت کا اختتام کوئی، نہ منزل کا نشان ہی نظر آتا ہے۔
سال کا اختتام ہے۔ دعا کیجیے اور احتساب بھی۔ ممکن ہے کہیں کچھ غلطیاں، کچھ دانستہ یا نادانستہ کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں، ان کا اعتراف کرکے تلافی کی کوشش کریں۔ گلے شکوے دور کرکے دل صاف کرلیں کہ زندگی کے یہ پل بہت قیمتی ہیں۔ لوٹ کر نہ آئیں گے۔

سالِ نو نمبر۔ قارئین سے سروے،

حسبِ روایت جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا۔ اور آپ کی شرکت لازمی۔ قارئین کی شرکت کے لیے سروے کے سوال یہ ہیں۔

نام بشیر کس کی نظر گھر کو کھا گئی
سایہ سا بچھ گیا ہے مرے آنگن میں خوف کا

1۔ ملک کے موجودہ حالات کا سب سے بڑا ذمہ دار آپ کسے سمجھتی ہیں؟ اغیار کی سازشیں، ہمارے قومی سلامتی کے ادارے، سیاست دان، میڈیا یا پھر عوام۔ جو اپنے حقوق کے لیے آواز نہیں اٹھاتے؟
2۔ سنہ 2013 میں آپ نے جو تحریریں پڑھیں۔ ان تحریروں کے کون سے کردار تھے جنہوں نے آپ کو متاثر کیا؟ وہ آپ کی یادوں کا حصہ بن گئے؟
3۔ سنہ 2013 میں کی بہترین تحریر اور کس شمارے کا ٹائٹل سب سے اچھا تھا؟
4۔ اب تک کی گزاری گئی اپنی زندگی سے آپ مطمئن ہیں، اگر نہیں تو کیا تبدیلی چاہتی ہیں؟
5۔ سنہ 2013 کے حوالے سے کون سی بات یا واقعہ آپ کے لیے اہم رہا۔ کوئی کامیابی ملی؟ کوئی خوشی؟ یا مایوسی؟
ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 23 دسمبر تک ہمیں موصول ہوجائیں۔

اس شمارے میں،

اس ماہ میمونہ صدف کا طویل مکمل ناول سحر عشرت شامل ہے۔ میمونہ صدف کو لکھتے ہوئے بہت کم عرصہ گزرا ہے اور ابھی ان کے چند افسانے ہی شائع ہوئے ہیں۔ یہ ان کا پہلا مکمل ناول ہے۔ ایک انتہائی حساس اور کسی حد تک مشکل موضوع کو میمونہ نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ ناول پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

- نازیہ جمال کا ناول۔ ہمیں اس کا یقین ہے،
- آمنہ ریاض اور سدرۃ المنتہیٰ کے ناولٹ،
- ثمینہ عظمت، دیا شیرازی، عظمیٰ افتخار اور حنا بشر کے افسانے،
- عنیزہ سید اور عفت سحر طاہر کے ناول۔
- منفرد اسٹائل کی نیوز کاسٹر ثنا مرزا سے ملاقات،
- باتیں فارس شفیع سے۔
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی ازدواجی الجھیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

امید اور اجل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یہ ابن آدم ہے اور یہ اس کی اجل ہے گدی کے قریب۔" پھر آگے کو ہاتھ بڑھا کر فرمایا۔ "اور وہاں تک اس کی امیدیں ہیں۔" (ترمذی)
فائدہ: انسان کی امیدوں کے مقابلے میں اس کی اجل بہت قریب ہے، لہٰذا اس کے استقبال کی تیاری ضروری ہے۔ دنیا میں مشغول ہوکر آخرت سے غفلت انتہائی نادانی ہے۔

معمولی گناہ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔
"اے عائشہ! معمولی سمجھے جانے والے گناہوں سے بچنا اللہ کے ہاں ان کا بھی مواخذہ ہوگا۔" (احمد)

فوائد و مسائل:

1 بعض گناہ عام لوگوں کی نظر میں معمولی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے ہوتے ہیں مثلاً "گالی گلوچ ہنسی مذاق میں جھوٹ بولنا، مرد کا اپنی شلوار، تہ بند اور پاجامہ وغیرہ سے ٹخنوں کو چھپا لینا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنا تہ بند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھنا، اگر یہ نہ ہوسکے تو ٹخنوں تک ضرور اونچا رکھنا اور تہ بند کو (ٹخنوں سے نیچے تک) لٹکانے سے بچنا کیونکہ یہ تکبر ہے۔" (سنن ابی داؤد۔ حدیث ۴۰۸۴)
2 جو گناہ معاشرے میں عام ہوجائے، عوام کی نظر میں وہ گناہ نہیں رہتا، خواہ کبیرہ ہی ہو۔ علماء کو چاہیے کہ ایسے گناہوں سے خاص طور پر منع کریں اور ان کے بارے میں اسلامی احکام کی وضاحت کریں۔
3 جو گناہ واقعتاً "صغیرہ" ہیں ان کے بارے میں بھی احتیاط ضروری ہے کیونکہ صغیرہ گناہ بکثرت کرنے سے مجموعی طور پر گناہوں کی مقدار بہت زیادہ ہوجاتی ہے

جس کی وجہ سے انسان سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صغیرہ گناہوں کی پروانہ کرنے سے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی جرات پیدا ہو جاتی ہے' اس لیے ان سے بھی اجتناب ہی بہتر ہے۔

توبہ میں جلدی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلے' باز آجائے اور (اللہ سے) بخشش کی درخواست کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر مزید گناہ کرے تو سیاہی کا نقطہ زیادہ ہو جاتا ہے (حتیٰ کہ ہوتے ہوتے دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔) یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (اس فرمان میں) کیا ہے۔

ترجمہ : ۔ "یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ پڑ گیا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1 گناہ ہو جائے تو جلد سے جلد توبہ کرنی چاہیے تاکہ دل پاک صاف ہو جائے۔

2 گناہوں کی وجہ سے دل سیاہ ہو جانے کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ نیکی سے محبت اور گناہ سے نفرت ختم ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔

3 روحانی بیماریوں کا علاج اللہ کی یاد' قرآن کی تلاوت توبہ واستغفار اور موت کی یاد ہے۔

نیکیاں غبار میں تبدیل

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں اپنی امت کے ان افراد کو ضرور پہچان لوں گا جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید (روشن) نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ عزوجل ان (نیکیوں) کو بکھرے ہوئے غبار میں تبدیل کردے گا۔" (طبرانی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "اللہ کے رسول ان کی صفات بیان فرما دیجیے۔ ان (کی خرابیوں) کو ہمارے لیے واضح کر دیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں شامل ہو جائیں اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔"

آپ نے فرمایا۔

"وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہاری جنس سے ہیں اور رات کی عبادت کا حصہ حاصل کرتے ہیں جس طرح تم کرتے ہو۔ لیکن وہ ایسے لوگ ہیں کہ انہیں جب تنہائی میں اللہ کے حرام کردہ گناہوں کا موقع ملتا ہے تو ان کا ارتکاب کرلیتے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1 بہت سے گناہ نیکیوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔

2 لوگوں کے سامنے نیک بنے رہنا اور تنہائی میں گناہ کا ارتکاب بے تکلف کرلینا' یہ بھی ایک قسم کی منافقت ہے جس کی وجہ سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

3 تہجد پڑھنا بڑی نیکی ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری تنہائی میں تقویٰ پر قائم رہنا ہے۔

4 اصل تقویٰ یہی ہے کہ انسان اس وقت بھی گناہ سے باز رہے جب اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔

5 نیکیوں کو غبار میں تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول نہیں فرمائے گا' اس لیے وہ بے وزن ہو جائیں گی اگرچہ دیکھنے میں وہ پہاڑوں جیسی عظیم اور سفید ہوں۔

تقویٰ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"کون سا عمل سب سے زیادہ (لوگوں کو) جنت میں داخل کرے گا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تقویٰ اور خوش اخلاقی۔"

سوال کیا گیا "کون سی چیز سب سے زیادہ (لوگوں کو) جہنم میں لے جائے گی؟"

فرمایا "دو کھوکھلی چیزیں منہ اور شرم گاہ۔"

فوائد و مسائل :

1 تقویٰ اللہ سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے کا نام ہے اور خوش اخلاقی انسانوں پر ظلم و زیادتی کرنے سے اور برا سلوک کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اس طرح تقویٰ سے حقوق اللہ صحیح ادا ہوتے ہیں اور خوش اخلاقی سے حقوق العباد۔ ان دونوں کی ادائیگی یقیناً "جنت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

2 منہ کے گناہوں میں حرام رزق کھانا بھی ہے جس کی وجہ سے نیکیاں قبول نہیں ہوتیں اور زبان کے گناہ بھی **مثلاً** "جھوٹ' غیبت' گالی گلوچ وغیرہ جن سے لوگوں میں فساد پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے گناہ بڑے گناہ ہیں۔

3 شرم گاہ کا گناہ زنا ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور معاشرے میں بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہے۔ زبان کے گناہ (غیر محرم سے ناجائز بات چیت وغیرہ) آنکھ کے گناہ (نامحرم کو دیکھنا) ہاتھ کے گناہ (نامحرم کو چھونا' یا خط وغیرہ لکھنا اور فون کرنا) پاؤں کے گناہ (بدکاری کے لیے چل کے جانا) وغیرہ سب اسی بڑے گناہ کے لیے کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

4 منہ اور شرم گاہ کے گناہوں سے بچنے والے کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسرے گناہوں سے بھی بچ جائے گا اور جنت میں چلا جائے گا۔

توبہ کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی اپنی گم شدہ سواری پا کر خوش ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1 حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2 بندے کو جب احساس ہو جائے کہ اس نے گناہ کیا ہے' خواہ وہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا' براہ راست اللہ کے آگے توبہ کرے یعنی اپنی غلطی کا اعتراف کرکے آئندہ کے لیے یہ عزم اور وعدہ کرے کہ وہ اس گناہ سے بچ کر رہے گا۔

3 توبہ اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہیں' البتہ کسی نیک عالم آدمی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرکے نیکی کا عزم کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان اس عالم کی شرم سے گناہ سے بچتا ہے' پھر براہ راست اللہ کی شرم سے گناہ سے بچنے کی توفیق مل جاتی ہے' تاہم یہ ضروری نہیں۔ تنہائی میں توبہ کرکے اللہ سے استقامت کی دعا کرے تو کافی ہے۔

4 جس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے' اس کے ارتکاب کی صورت میں وہ حق ادا کرنا یا صاحب حق سے معاف کروانا ضروری ہے ورنہ توبہ مکمل نہیں ہو گی۔

توبہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں' پھر توبہ کرو تو (پھر بھی اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔"

فوائد و مسائل :

1 یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کرلے' تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو توبہ کرلینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں' وہ معاف نہیں ہوں گے' البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو' صرف زبان سے نہ ہو۔

ندامت

حضرت عبداللہ بن معقل رحمتہ اللہ سے روایت

ہے انہوں نے فرمایا میں اپنے والد (حضرت معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے انہیں سنا' وہ کہہ رہے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ندامت توبہ ہے۔"

میرے والد صاحب نے ان سے کہا "کیا آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ راست) سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ندامت توبہ ہے؟"

انہوں نے کہا "ہاں۔"

فوائدو مسائل :

1 ندامت توبہ کا اہم جزو ہے۔

2 عالی سند کی طلب مستحسن ہے۔

3 اگر کسی چیز میں شک ہو تو استاد سے دریافت کر لینا احترام کے منافی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا رہتا ہے جب تک نزع کا عالم طاری نہ ہو۔" (ترمذی)

فوائدو مسائل :

1 نزع سے مراد روح قبض کرنے کا عمل شروع ہونا ہے۔

2 جب موت کے فرشتے ظاہر ہو جاتے ہیں تو عالم آخرت سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس لیے توبہ کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

3 بندے کو چاہیے کہ جلد از جلد توبہ کر لے' معلوم نہیں کب آخری وقت آجائے۔

گناہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ اس نے ایک (اجنبی) عورت کا بوسہ لے لیا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس گناہ کا کفارہ دریافت کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔

ترجمہ : "دن کے کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز قائم کیجیے ۔ بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔"

اس آدمی نے کہا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ (رعایت) میرے (ہی) لیے ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ میری امت کے ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس پر عمل کرے۔"

فوائدو مسائل :

1 بعض گناہ دوسرے گناہوں سے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا گناہ ہو گا اس کی معافی کے لیے اتنی بڑی نیکی کی ضرورت ہے۔

2 وہ شخص اپنے گناہ پر نادم تھا اور اس کی معافی کے لیے ہر کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا' اس وجہ سے وہ گناہ نماز کی برکت سے معاف ہو گیا۔ جو شخص نادم نہ ہو' گناہ کو معمولی سمجھے اس کا چھوٹا گناہ بھی بڑا ہو جاتا ہے۔

3 آیت کی شان نزول سے اس کا مطلب اور مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت میں مذکور حکم امت کے سب افراد کے لیے ہوتا ہے۔

4 گناہ ہو جائے تو فوراً" کوئی نیکی کرنی چاہیے' مثلاً" نفل نماز پڑھ کر گناہ کی معافی کی دعا کرے یا صدقہ خیرات کرے یا کوئی اور نیکی کرے جو اس گناہ کی معافی سے مناسبت رکھتی ہو' مثلاً" ذکر اذکار' تلاوت اور نفلی روزہ وغیرہ۔

اللہ کا خوف

امام زہری رحمتہ اللہ نے (اپنے شاگرد معمر سے) فرمایا "کیا میں تجھے دو عجیب حدیثیں نہ سناؤں؟" (پہلی حدیث یہ ہے جو) حمید بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی نے اپنی جان پر زیادتی کی (اور زندگی میں بہت گناہ کیے) جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا۔ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا' پھر مجھے (میری لاش کو) پیس کر مجھے (میری راکھ کو) ہوا میں اڑا دینا اور سمندر میں بہا دینا۔ قسم ہے اللہ کی! اگر اللہ نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہیں دیا ہو گا۔"

ان بیٹوں نے ایسے ہی کیا۔

اللہ نے زمین سے کہا۔ "جو تو نے لے لیا ہے حاضر کر دے (ایسے ہی سمندر سے بھی اس کی راکھ کے ذرات جمع کر کے اسے زندہ کر دیا) اچانک وہ (زندہ سلامت) کھڑا تھا۔

اللہ نے اس سے فرمایا "تو نے جو کام کیا ہے اس پر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا۔

اس نے کہا۔ "میرے رب! تیرے خوف نے۔"

"اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے اسے معاف کر دیا۔"

جانوروں سے سلوک

امام زہری رحمتہ اللہ نے (دوسری حدیث بیان کرتے ہوئے) فرمایا اور مجھے حمید بن عبدالرحمٰن نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں چلی گئی۔ اس نے اسے باندھ دیا تھا' نہ اسے کچھ کھانے کو دیا' نہ اسے چھوڑا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی حتیٰ کہ وہ (بھوک سے) مر گئی۔"

امام زہری رحمتہ اللہ نے فرمایا (میں نے یہ دو حدیثیں اس لیے سنائی ہیں) تاکہ کوئی (اپنی نیکیوں پر) بھروسا نہ کرے' اور کوئی (اللہ کی رحمت سے) مایوس نہ ہو۔

فوائدو مسائل :

1 انسان کو اللہ کی رحمت کی امید کے ساتھ ساتھ اللہ کے عذاب سے خوف بھی رکھنا چاہیے۔

2 محدثین کی فقاہت صرف اختلافی فروعی مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ ایمان' اخلاق اور عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

3 اپنی لاش جلانے اور اس کی راکھ اڑانے کی وصیت کرنے کی وجہ موت کے وقت خشیت کی کیفیت کا غلبہ تھی' اس لیے اس کی یہ غلطی بھی معاف ہو گئی کہ اس نے نامناسب وصیت کی۔

4 اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو زندہ کیے بغیر روح سے بھی سوال کر سکتا تھا لیکن اس کو اللہ نے اپنی قدرت اور سطوت کا مشاہدہ کروا دیا۔

5 قبر کے عذاب اور نعمت سے مراد وہ تمام حالات ہیں جو موت کے بعد قیامت تک پیش آئیں گے۔ یہ حالات ہر شخص کو پیش آتے ہیں' خواہ اسے دفن کیا جائے یا اسے جنگلی جانور یا مچھلیاں کھا جائیں یا اس کو خاک سیاہ کر کے اس کے ذرے بکھیر دیے جائیں یا اس کی راکھ کو کسی برتن میں محفوظ کر لیا جائے یا اس کی لاش محفوظ ہو جسے لوگ دیکھ رہے ہوں۔

6 عذاب قبر کا تعلق عالم غیب سے ہے' اس لیے زندہ انسان اس کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔

7 کسی بھی جان دار چیز پر ظلم کرنا بہت بڑا گناہ ہے' خاص طور پر ایسا ظلم جس سے جان دار ایک ہی بار مر جانے کے بجائے تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مرے۔

8 پالتو جانوروں کی ضروریات کا خیال رکھنا فرض ہے بلکہ ایسے جانور جو کسی کے پالتو نہیں' ان پر رحم کرنے سے بھی اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے جیسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے گناہ گار انسان کی مغفرت ہو گئی تھی۔

اُن کے دیکھے سے جو

انشاجی

پچھلے دنوں ہمارے دشمنوں کی یعنی ہماری اپنی طبیعت ناساز رہی تو یہ عقدہ کھلا کہ اب تک جو ہم خلق خدا کو تین قسموں میں تقسیم کرتے تھے' ڈاکٹر' بیمار اور تیمار دار' یہ ناحق کا پھیلاؤ تھا' دنیا کی آبادی کو دو حصوں میں باآسانی بانٹا جاسکتا ہے' ایک بیمار' ایک معالج' کیونکہ تیمار دار کوئی علیحدہ طبقہ نہیں' ان میں آدھے بیمار ہوتے ہیں' آدھے معالج ہوتے ہیں بلکہ ان کی بڑی تعداد تو ایک وقت بیمار اور معالج ہوتی ہے' خود کوزہ و خود کوزہ گر' خود گل کوزہ' ایک ذرا سی مثال دیتے چلیں' پچھلے دنوں حضرت علیا شیر الملت حکیم عبدالسنان اسبغول دہلوی بکریوں والے مشہور ہیں کیونکہ ان کے اجداد بکریوں کا علاج کرتے تھے' اپنے پتے کے علاج کے لیے ایک کلینک میں داخل ہوئے' پتے میں کیا خرابی تھی' ہمیں معلوم نہیں' دراصل پتا مارتے بہت تھے' دن بھر مطلب میں بیٹھتے' کام کرتے' نسخے اور غزلیں بناتے رہتے تھے' وہاں ان کا سابقہ ڈاکٹر ایم بی بی ایس بیگ ایم بی بی ایس سے پڑا' یہ ڈاکٹر صاحب اپنے سابقے اور لاحقے دونوں طرف سے ڈاکٹر معلوم ہوتے ہیں جس طرح دو موہی کے دو منہ ہوں' لیکن فی الواقع ہے ایم بی بی ایس کا مطلب مرزا باقرین سلطان ہے' ڈاکٹری فقط انہیں لاحق ہوئی ہے' خیر کلینک میں ڈاکٹر بیگ ابھی ہمارے حکیم صاحب کا اسٹیتھسکوپ سے امتحان کر رہے تھے کہ انہوں نے ان کی نبض پکڑلی اور کہا۔

"آپ کو تو یرقان معلوم ہوتا ہے۔" مزید اطمینان کے لیے ڈاکٹر صاحب کا قارورہ کلیم صاحب نے لیا اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے انجکشن لگایا' حکیم صاحب نے ان کی فصد کھولی' انہوں نے ان کو کیپسول کھلائے' انہوں نے معجون فلسفہ اور عرق گاؤ زبان سے تواضع کی' دونوں کو اللہ نے صحت دی' کل دونوں نے دیکھے' رنگیں برابر تھیں' لہٰذا یہ بھی خوش' وہ بھی خوش۔

خیر اس وقت بحث اپنی یا حکیم صاحب کی بیماری کی نہیں' تذکرہ تیمارداری کا تھا' ہوا یہ کہ پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی' کس پھڈے میں اڑا کر انہوں نے تڑوائی اس کے ذکر کا یہ موقع نہیں' بہرحال اسپتال میں داخل ہوئے' ڈاکٹر نے پلستر چڑھایا اور پھر چرخی سے باندھ دیا' ہم بھی انہیں دیکھنے گئے' ہمیں تیمارداری اور عیادت کا زیادہ تجربہ نہیں' لہٰذا ان کا حال پوچھا اور یہ کہہ کر ان کے پاس بیٹھ گئے کہ "اچھا جس حال میں رہو' خوش رہو" لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کئی اور لوگ ان سے ملنے آئے' جس سے کھلا کہ تیمارداری میں بھی باون بکسوئے لگتے ہیں' یہ بھی ایک طرح سے علم ہو رہا ہے۔

ایک تیماردار ان میں داروغہ جی تھے' مونچھوں کو خضاب لگائے' کمبل اوڑھے ہائے ہائے کرتے ہوئے' تو وہ کیا ہمارے دوست کی خیریت پوچھتے' اس نے پوچھا۔

"داروغہ جی! کیسے ہیں آپ؟"

وہ ایک ہی کشتہ تیغ ستم نکلے' بولے۔

"کچھ نہ پوچھو' یک بیماری و صد آزار' چار روٹی زیادہ کھالوں تو معدے میں گرانی ہو جاتی ہے' سوتے وقت دو پیالے چائے کے زیادہ پی لوں تو نیند آتی ہے' پر نہیں آتی۔ کان الگ سائیں سائیں کرتے ہیں' سنتا نہیں ہوں' بات مکرر کہے بغیر' ان سب امراض شاقہ پر مستزاد' آنکھ پر گویا بجنی نکل آئی ہے' اس سے تو موت بھلی۔"

ہمارے دوست نے ان سے مناسب الفاظ میں ہمدردی کی' اتنے میں ایک اور غم خوار آنکلے' ہانپتے کانپتے' ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

"میاں! تمہیں دیکھنے آگیا ہوں' ورنہ زندگی حرام ہے' چار کوس پیدل چل لوں تو سانس پھول جاتا ہے' اس بہتر سال کی عمر میں یہ حال ہے تو بڑھاپے میں تو جانے کیا ہوگا۔"

ہمارے دوست نے ان کو بھی تسلی دی' اب ایک اور بزرگ وارد ہوئے' کھانستے ہوئے' آتے ہی آواز لگائی۔

"کہو میاں! ٹانگ ٹوٹ گئی کیا؟" پھر جواب کا انتظار نہ کیا' اپنی کیفیت بیان کرنی شروع کردی۔

"آج پانچواں دن ہے' زکام ہو رہا ہے' چھینکیں الگ آرہی ہیں' گلا خراب ہو رہا ہے' جوشاندہ پیا لیکن مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی۔"

ہمارے دوست نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

"رب العزت! آپ کو جلد اچھا کرے۔"

انہوں نے ایک زور کی چھینک ماری اور آمین کہہ کر تیسری کرسی پر بیٹھ گئے' چوتھے صاحب نے آکر اپنی داڑھ کی تکلیف بتائی اور ہمارے دوست سے خراج ہمدردی وصول کر کے کہنے لگے۔

"اپنی نرس سے ایک پیالہ سوپ کا میرے لیے منگوا دیجیے کہ ڈاکٹر نے ٹھوس غذا سے منع کیا ہے۔"

غرض کہ لوگ آتے گئے اور اپنی اپنی تکلیفوں کی شرح کرتے گئے' ان ہی میں کچھ ایسے تھے کہ ہمارے دوست کی ٹانگ پہ آکر زور سے ہاتھ مارتے تھے اور جب ان کی چیخ نکلتی تو تعجب سے کہتے۔

"اچھا تکلیف ہوتی ہے' پلستر اتار دو' اس پر سوجی کا حلوا باندھو' مجرب ہے۔"

ایک نے لونگ کے تیل کی مالش بتائی' ایک نے جناب رئیس امروہوی صاحب کے مضامین پڑھنے اور تزکیہ نفس کا مشورہ دیا اور کہا۔

"اس سے ٹانگ خود بخود جڑ جائے گی۔"

ایک اور صاحب بولے۔

"نمک سلیمانی کے غرارے کرو' سوزش دور ہو جائے گی۔"

ایک نے تو باقاعدہ ان کو اسپتال سے بھاگ جانے کا مشورہ بھی دیا اور کہا کہ فلاں تکیے پر ایک اللہ والے درویش بیٹھتے ہیں' وہ راکھ کی چٹکی دیں گے' اس ٹانگ کے ٹوٹے ہوئے حصے پر چھڑک دینا' فوراً شفا ہوگی' تھوڑا سا گوند اس راکھ کی چٹکی میں ملانے سے تو کٹی ہوئی ٹانگ بھی جڑ جاتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

یہی تو وہ مرحلہ ہے جہاں آکر بیمار' تیماردار اور معالج سب ہی ایک ذات میں جمع ہو جاتے ہیں' سچ یہ ہے کہ تصوف سے تو ہمیں ایک زمانہ سے لگاؤ تھا اور قوالی کی محفلوں میں سر دھنتے اور لنگر کھاتے بھی ایک عمر ہوئی تھی لیکن وحدت الوجود کے معنی اس روز پہلی بار آشکار ہوئے۔

☼

منفرد اسٹائل کی مالک نیوز کاسٹر

ثنا مرزا سے ملاقات

شاہین رشید

نیوز کے شعبے سے اس بار آپ کی ملاقات ثنا مرزا سے کروا رہے ہیں۔ سلجھے ہوئے انداز میں خبریں پڑھنے والی ثنا مرزا کو اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنانے میں دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ راستے خود بخود ہموار ہوتے چلے گئے۔ مگر کیسے؟ یہ سب کچھ آپ کو پڑھ کر ہی معلوم ہوگا۔

"کیسی ہیں ثنا مرزا اور کیا مصروفیات ہیں آج کل آپ کی؟"

"جی میں ٹھیک ہوں اور مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ کچھ ہی عرصہ پہلے میں کراچی یونین آف جرنلسٹ کی سینئر جوائنٹ سیکریٹری بنی ہوں، جس کی وجہ سے میری مصروفیات میں تھوڑا اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ میرے ذہن میں کچھ ایسے کام ہیں جو میں ینگ جنریشن کے لیے کرنا چاہتی ہوں۔ مثلاً" کچھ ٹریننگ پروگرام اور کچھ ایسے پروجیکٹس جو ہمارے دور میں نہیں تھے۔ خاص طور پر اپنا امریکہ کا تجربہ اپنی نئی نسل جو میڈیا میں آرہی ہے ان میں ٹرانسفر کرنا چاہتی ہوں تو اس کے لیے مجھے ایک پلیٹ فارم چاہیے تھا، جو مجھے کراچی یونین آف جرنلسٹ سے ملا اور ساتھ ساتھ نیوز تو چل ہی رہی ہیں۔"

"ویری گڈ۔۔۔ کب اور کیسے آئیں میڈیا میں اور کن کن مراحل سے گزر کر ایک جگہ پر قدم ٹھہرے؟"

"میں جب کالج کی طالبہ تھی تو ہمارے ایک قریبی جاننے والے صاحب نے کہا کہ ایف ایم میں وائس اوور کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔

ایف ایم 107 پہ ایک ڈرامے کے لیے ایک چھوٹا سا کردار مجھے کرنا تھا۔ چونکہ مجھے اداکاری و صداکاری کا کچھ بھی تجربہ نہیں تھا تو وہ کردار میں نے جیسے تیسے کر دیا۔

لیکن پھر ایک دن ان کا فون آیا کہ ہم صبح سویرے اتوار کے دن ایک مارننگ شو شروع کر رہے ہیں جو فلم انڈسٹری سے متعلق ہے اور پروگرام دو لوگ کریں گے۔ میل آر جے ہمارے پاس ہے۔ فیمیل کے لیے آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔ پروگرام صبح چھ سے نو بجے تک ہوگا۔ تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے تو ریڈیو پہ بولنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ بچپن میں کبھی ریڈیو پاکستان جاتے تھے تو ایک پرچہ ہوتا تھا ہمارے پاس وہ پڑھ کر آجاتے تھے۔ خود سے بولنا تو آتا ہی نہیں ہے مجھے انہوں نے کہا کہ آپ آئیے تو آپ کو اسکرپٹ بھی دے دیں گے اور سمجھا بھی دیں گے کہ کیسے بولنا ہے۔

خیر میں نے ایک شو کیا اور جو صاحب میرے ساتھ تھے۔ وہ اچھے خاصے تجربہ کار آر جے تھے مگر انہوں نے اس شو میں بہت برا پرفارم کیا۔ لہٰذا ان صاحب کو ہٹا کر کسی اور صاحب کو لایا گیا اور ساتھ ہی مجھے بھی مستقل کر دیا گیا۔ ہر اتوار کو وہ پروگرام ہوتا تھا ایف ایم 107 پر میں نے کوئی چار چھ ماہ کام کیا۔ اس دوران مجھے ایک اور چینل سے آفر آئی کہ ہمیں نیوز ڈپارٹمنٹ میں پروڈکشن کے لیے ایک خاتون کی ضرورت ہے آپ آکر جوائن کریں ہمیں پروڈکشن میں کام کرنے کے لیے گئی تھی مگر مجھے کہا گیا کہ آپ نیوز کے لیے بھی آڈیشن دے دیں۔

میں اس وقت اتنی سادہ ہوا کرتی تھی کہ میں سمجھی کہ پروڈکشن کے لیے نیوز کا آڈیشن دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ آڈیشن کے بعد انہوں نے کہا کہ کل سے آپ نیوز اینکر کے طور پر کام کریں گی۔ میں تو بڑی ناراض ہوئی کہ آپ نے تو مجھے پروڈکشن کے لیے بلایا تھا یہ اینکرنگ کیوں کروا رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہمیں پروڈکشن کے لیے بحیثیت اینکر کے آپ کی ضرورت ہے۔

گھر آکر میں نے اپنی والدہ کو بتایا تو وہ تھوڑی سی ناراض ہوئیں کہ ابھی تو تم پڑھ رہی ہو ابھی سے جاب کی کیا ضرورت ہے تو میرے والد (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) نے میری والدہ کو سمجھایا کہ اس کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بہت ضروری ہے اور یہ بات ہے 2004ء کی پھر جناب والد کی اجازت سے میں نے جاب شروع کر دی۔ صبح میں کالج جاتی تھی اور دوپہر سے رات تک میں نیوز چینل پہ ہوتی تھی۔۔۔ اس جاب کو دو سال کیا مگر چار پانچ ماہ کے لیے مجھے اس جاب کو چھوڑنا پڑا کیونکہ میرا داخلہ میڈیسن یعنی ایم بی بی ایس میں ہو گیا تھا۔ تو میری والدہ نے کہا کہ اس کی پڑھائی متاثر ہوگی۔۔۔

ہمارے ایک ٹیم ممبر نے کہا کہ "تم نے میڈیسن پڑھ کر کون سی بہت بڑی ڈاکٹر بن جانا ہے۔ پارٹ ٹائم آجایا کرو۔" گھر والوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے دو تین گھنٹوں کے لیے چلی جایا کرو۔ چنانچہ پھر وہاں دو تین ماہ کام کرنے کے بعد مجھے جیو سے آفر آئی تو میں نے جیو میں جاکر آڈیشن دیا۔ 2005ء کے اینڈ میں مجھے بحیثیت پروگرام اینکر ہائر کرلیا گیا اور یہ سلسلہ ابھی تک چلا آرہا ہے۔"

"راستے ہموار ہوتے گئے آپ آگے بڑھتی رہیں۔ پڑھائی میں بھی اور جاب میں بھی تو کمال کس کا ہے۔ قسمت کا یا آپ کا اپنا؟"

"میرے والد کی سپورٹ نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں آگے آگے قدم بڑھاؤں اور پھر میری والدہ نے اور میری فیملی نے انڈر اسٹینڈ کیا کہ میں بہت کچھ کرسکتی ہوں تو آج جو کچھ میں ہوں' اس میں میری فیملی اور میرے والدین کا تعاون شامل ہے۔"

"اور آپ کی خوب صورتی کا بھی تعاون شامل ہے؟"

(ہنستے ہوئے) "اب تو میں اپنے آپ کو ایک بوڑھی روح سمجھتی ہوں۔ کیونکہ لڑکیوں والے شوق مجھے شاید ہی کبھی زندگی میں رہے ہوں۔ مجھے نہیں یاد کہ پانچ سات سالوں میں میں نے آخری بار کب چوڑیاں پہنی تھیں۔ کب مہندی لگائی تھی۔ ٹی وی میں ہم آپ کو بڑے کلر فل نظر آتے ہیں تو سب سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی پرسنل لائف میں بھی ایسے ہی ہوں گے۔ جبکہ میں تو اپنی پرسنل لائف میں بالکل مختلف ہوں۔ ملنگ طبیعت کی مالک ہوں جس حلیے میں ہوتی ہوں اسی میں چل پڑتی ہوں۔ جو مل گیا کھالیا۔ جو نہیں ملا اس پر ضد نہیں کی۔۔۔ بچپن میں میں ان باتوں کا بہت خیال رکھتی تھی لیکن جیسے جیسے بڑی ہوتی ہوگئی مجھے یہ اندازہ ہوا کہ زندگی میں یہ چیزیں اتنی اہم نہیں ہوتیں بلکہ ہمارا اس دنیا میں رہنے کا کوئی مقصد ضرور ہے یہ دنیا ہم سے کیا چاہتی ہے اور ہمیں بھیجا کس لیے گیا ہے۔۔۔ تو اگر اس مقصد کو آپ حاصل کر لیں تو آپ کی زندگی کا بنیادی ٹارگٹ پورا ہوجاتا ہے اس لیے میری نظر میں اب ان باتوں کی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا مل رہا ہے اہمیت ختم ہوگئی ہے۔

جب سے میں امریکہ کا ٹور کرکے آئی ہوں۔ میں نے یہ سیکھا ہے کہ چاہے آپ کتنے ہی ترقی یافتہ ملک میں چلے جائیں وہ جو حرص و ہوس کی دوڑ چل رہی ہے۔ اس کا کہیں اینڈ نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی ضروریات زندگی کو تھوڑا مختصر کرنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے ایک وقت تھا جب میری والدہ مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ تم کتنے پیسے برباد کرتی ہو کپڑوں پہ' جوتوں پہ اور آج یہ وقت ہے کہ وہ مجھے کہتی ہیں کہ خدا کے لیے اپنے لیے کچھ کپڑے جوتے خرید لایا کرو۔ کیوں اس طرح پھرتی رہتی ہو۔ تو یہ ایک بہت بڑا چینج ہے جو میری زندگی میں پچھلے دو تین سالوں میں آیا ہے۔"

"پھر وہ ایم بی بی ایس کی پڑھائی کا کیا ہوا۔۔۔ ویسٹ ضائع ہوگئی؟"

"نہیں جی۔۔۔ بالکل ضائع نہیں ہوئی کیونکہ میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں لیکن پریکٹس نہیں کرسکی کیونکہ مجھے اپنی پڑھائی کو اس وقت روکنا پڑا جب میں دبئی چلی گئی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کا گیپ آیا مگر کالج والوں نے بھی میرا بہت ساتھ دیا اور اب میرا پروگرام یہ ہے کہ اگر میں پاکستان میں مستقل رہی تو اپنی ہاؤس جاب مکمل کروں گی اس لیے کہ مجھ میں لوگوں کی مدد کرنے کا جذبہ ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ڈاکٹرز بہت حد تک پیسے کمانے والی مشین بن گئے ہیں اور مجھے جو پیسے کمانے ہیں یا میری جو ضرورت ہے وہ میڈیا کی کمائی سے بہت حد تک پوری ہورہی ہے تو اپنی ڈاکٹری کو ان شاءاللہ میں ضرورت مندوں کے لیے ہی رکھوں گی۔"

"آپ دبئی میں ایک ڈیڑھ سال رہیں اور امریکہ بھی گئیں جہاں سے آپ نے "وائس آف امریکہ" پروگرام کیا تو جانے کا اتفاق ہوا یا بھیجا گیا؟"

"جب میں جیو میں آئی تو شروع کے دو تین سال میں نے پروگرام کیے۔ اسپورٹس مارننگ شو جیو نیوز سے کیا۔ جو 2005ء سے لے کر 2007ء تک چلا اس کے علاوہ عید کی اور رمضان کی ٹرانسمشن بھی کی۔ پھر مجھ پر کوئی برا وقت آیا یا میری قسمت میں لکھا تھا کہ جیو نیوز کے ناصر بیگ چغتائی صاحب نے کہا کہ آپ دبئی چلی جائیں۔ اس زمانے میں فیمیل اینکرز کو دو سے تین مہینے کے لیے دبئی بھیجا جاتا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ میں نیوز کی بندی نہیں ہوں۔ میں تو پروگرام کرتی ہوں تو کہا گیا کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس زمانے میں خبریں ریکارڈ ہونے کے بعد آن ایر ہوتی تھیں۔ تو دو مہینے کے لیے میں گئی اور پھر ہوا یہ کہ مجھے پروگرام کرنے سے منع کردیا گیا اور کہا گیا کہ آپ نے نیوز پڑھنی ہیں تو 2007ء سے لے کر آج تک میں نیوز ہی پڑھ رہی ہوں۔۔۔

امریکہ اس طرح گئی کہ جنوری 2012ء میں مجھے اپروچ کیا۔ VOA (وائس آف امریکہ) نے۔ انہیں پاکستان کے کسی بھی چینل کی۔ ایک فیمیل اینکر چاہیے تھی جو وہاں یہ آکر ایک پاکستانی خاکہ ایکٹ کر کے ایک نیا پروگرام لانچ کرسکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے اس کے لیے کتنے لوگوں کو اپروچ کیا۔ لیکن شارٹ لسٹ کرکے مجھے اپروچ کیا تو میں نے ان سے کہا کہ میں بالکل آپ کی پالیسی کے مطابق تو پروگرام نہیں کرسکوں گی ہاں اگر آپ نے ایک مختلف چیز سامنے لے کر آنی ہے تو شاید میں آپ کا پروگرام کرسکوں۔ تب انہوں نے کہا کہ آپ آئیں اور آپ کے ذہن میں جو خاکہ ہے ہم کوشش کریں گے کہ اسی انداز میں کریں۔ یہ ایک اچھی پیشکش تھی اور جیو کے بی ہاف پہ میں پہلی ایسی اینکر ہوں جس کو انہوں نے اپروچ کیا اور پھر باقاعدہ ہائر کیا بہ حیثیت ایمپلائی کے۔ رپورٹرز کی حد تک اور پروڈیوسر کی حد تک تو لوگ گئے ہیں لیکن بہ حیثیت اینکر کے کوئی یہاں سے نہیں گیا۔ میرا دو سال کا کنٹریکٹ تھا تو جیو نے مجھ سے یہ تعاون کیا کہ انہوں نے کہا کہ آپ چھٹی لے لیں اور ہمیں ہی جوائن کیجیے گا۔ وہ ٹرپ میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ پروگرام ٹوٹلی آؤٹ ڈور تھا۔"

"گوروں کا جو ایک تصور ہے پاکستانیوں کے لیے اس کے لیے آپ نے کیا کیا؟"

"اس تصور کو کم کرنا یا ختم کرنا میری اولین ترجیح ہوتی تھی اور اس کے لیے مجھے بہت ہی سخت قسم کے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اکثر لوگ مجھے سمجھتے تھے کہ میں انڈیا سے ہوں اور جب میں کہتی تھی کہ نہیں میں پاکستان سے ہوں تو ایک دم ان کے ایکسپریشن تبدیل ہوجاتے تھے مجھے بڑا افسوس ہوتا تھا۔ پھر میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتی تھی کہ پاکستان ایسا نہیں ہے جیسا آپ سمجھتے ہیں۔ پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا وہ کہ ینگ بچے بچیاں جو ہیں تو پاکستانی لیکن پیدا امریکہ میں ہوئے وہ اپنے آپ کو پاکستانی کہلوانا پسند نہیں کرتے یا جھجکتے ہیں میں نے ان کے ساتھ گھل مل کر آہستہ آہستہ انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ اپنی بنیادی پہچان کو نہیں بھول سکتے اپنے اس مشن میں کسی حد تک میں کامیاب بھی ہوئی ہوں۔ میں وہاں سے ایک مطمئن دل لے کر واپس آئی ہوں۔ ہم مٹی کی پہچان کو تبدیل نہیں کرسکتے۔"

"امریکہ جانے سے پہلے اور اب امریکہ سے آنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے نیوز پڑھنے میں کافی ٹھہراؤ آگیا ہے۔"

"امریکہ سے آنے کے بعد میں نے خود بھی محسوس کیا ہے کہ میری طبیعت میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ پہلے سوچ پختہ نہیں تھی اور میں چھوٹی چھوٹی بات پر ٹمپر لوز کرجاتی تھی۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔"

"دوران نیوز کوئی حماقت' کوئی واقعہ پیش آیا؟"

"ایسے تو بہت سارے واقعات ہیں لیکن میرے ساتھ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میرے تمام میل اینکرز پریشان رہتے ہیں کہ مجھ سے ہنسی کنٹرول نہیں ہوتی اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا کہ میں لائیو ہوں یا نہیں۔ اگر کسی نے میرے سامنے کچھ ایسا کر دیا جس پر مجھے ہنسی آجائے تو مجھ سے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔

"کوئی ایسی نیوز جس کو بریک کرنے میں مشکل ہوئی ہو؟"

"ایسی تو کوئی خبر نہیں ہے لیکن جن خبروں کو پڑھنے میں میں بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں وہ سپریم کورٹ سے متعلق ہوتی ہیں۔ یعنی عدلیہ سے جڑی خبروں کو بہت احتیاط سے پڑھتی ہوں۔ کیونکہ کچھ بھی ادھر ادھر ہو جائے تو خبر کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس طرح کسی کے انتقال کی خبر دینے سے پہلے میں یہ ضرور کہتی ہوں کہ اچھی طرح تصدیق کر لیں۔"

"کوئی بریکنگ نیوز جب آتی ہے تو کیا دل چاہتا ہے کہ میں ہی بریک کروں یا کوئی اور ساتھی اینکر کرے۔ نیوز بریک کرنا بھی تو اعزاز ہوتا ہے؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کریڈٹ کسی اور کے پاس چلا جائے کہ اس نے نیوز بریک کی لیکن اختتام جس نے کیا اور جس انداز میں کیا اس کی اہمیت میری نظر میں ہے۔ مجھے تو اب کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس نے بریک کرنی ہے نیوز اور کس نے نہیں میں کہتی ہوں کہ جس سے کروانی ہو کروالیں۔"

"ہمارے ٹاک شوز میں بھی اب کافی خواتین آگئی ہیں۔ آپ ان کی طرح کا کوئی پروگرام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟"

"ابھی ارادہ نہیں لیکن ہمارے ملک میں "وومن ہیں" شو کہیں نظر نہیں آتا۔ مجھے اب ان پروگراموں سے چڑ ہونے لگی ہے کہ ہم چار مہمان بلا لیتے ہیں اور خوامخواہ کا بحث و مباحثہ ہوتا ہے کہ حکومت کیا کر رہی ہے۔ مجھے تو اب اس concept سے ہی نفرت ہو گئی ہے کہ ہم باتیں کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ پروگرام ایسا ہو جس کے اختتام پہ کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خواتین کے لیے کوئی پروگرام ضرور کروں۔"

"کوئی پروگرام جو یادگار بن گیا ہو اور کیا آؤٹ ڈور پروگرام بھی کیے؟"

"بالکل ہے جی اور میں اس کا ذکر ضرور کروں گی۔ میں نے ملالہ کا انٹرویو کیا تھا اور میں نے پورا ایک دن اس کے ساتھ گزارا تھا۔ ملک میں جب بھی کوئی اہم واقعہ ہوتا تو اس کی رپورٹنگ کے لیے بھی ہمیں بھیجا جاتا تھا۔ جب سیلاب آیا تھا اور عطا آباد جھیل کا واقعہ ہوا تو تقریباً "بیس پچیس دن میں وہاں رہی اور رپورٹنگ کی۔ پھر جب سوات آپریشن ہوا تو اس کے لیے ہم مردان اور چارسدہ میں رہے تقریباً" پندرہ بیس دن اور کیمپس میں کس طرح لوگ زندگی گزار رہے ہیں اس کی رپورٹنگ کی۔ اس طرح کے جو اسپیشل پروجیکٹ ہوتے ہیں اس کے لیے ہمیں آؤٹ ڈور پہ بھیجا جاتا ہے۔"

"باتیں تو اور بھی ہوں گی لیکن تھوڑے سے نجی سوال بھی ہو جائیں۔ آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟"

"میرے والد لائر تھے لیکن انہوں نے کچھ عرصہ پریکٹس کرنے کے بعد اپنا بزنس اسٹارٹ کر لیا تھا حال ہی میں یعنی مئی 2013ء میں ان کا انتقال ہوا۔ میرے امریکہ سے واپس آنے کی دیگر وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں والدہ اکیلی تھیں حالانکہ میری والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں امریکہ جیسے ملک کو چھوڑ کر واپس آجاؤں مگر والد کے انتقال کے بعد یہاں کی ذمہ داری کو دیکھتے ہوئے میرے لیے مشکل تھا کہ میں والدہ کو تنہا چھوڑ دوں۔ میری دو بڑی بہنیں ہیں کافی عرصہ پہلے ان شادی ہو گئی۔ گزشتہ سات آٹھ سال سے میں اپنے والدین کے ساتھ ہوں بھائی نہیں ہے۔ میرے والد مرزا ہیں ٹیپیکل قسم کے۔ دہلی اور امرتسر سے ان کا تعلق تھا۔ جبکہ والدہ پٹھان ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ کہتے ہیں کہ آپ پٹھان ہیں۔ ویسے دماغ سے بھی میں پٹھان ہوں اور میری تاریخ پیدائش 13 جنوری ہے۔"

"ساتھی نیوز اینکرز میں کس کے ساتھ زیادہ دوستی ہے؟"

"میری سب سے اچھی اور قریبی دوست کرن آفتاب ہے جو کہ دو تین سال سے سماء ٹی وی پہ ہے۔ اس سے میری بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے میں ہر ایک سے دوستی نہیں کرتی کیونکہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ ہر لڑکی یا لڑکے سے میری انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو پاتی۔ لیکن بہ حیثیت کولیگ شاید ہی کوئی ایسی ساتھی ہو کہ جس کے ساتھ میرے کچھ مسائل رہے ہوں۔ ہمارے یہاں جتنے بھی اینکرز ہیں وہ سب بہت پروفیشنل ہیں۔"

"کس مرد اینکر کے ساتھ خبریں پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے؟"

"قہقہہ بڑا عجیب سا سوال ہے لیکن یہ مرد اینکر کی اپنی خصوصیات اور خامیاں ہیں۔ ہر مرد اینکر اپنے ٹیپیکل مائنڈ کے تحت اسٹوڈیو آتا ہے۔ تقریباً" تمام ہی فیمیل اینکرز یہی بات ڈسکس کرتی ہیں کہ جو میل اینکر ہمارے برابر میں بیٹھتا ہے ہم اس کے مائنڈ کے حساب سے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت میں یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ حالات کے تحت اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے۔"

"اور جناب شادی کب کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں نے اپنی والدہ سے کمٹمنٹ کیا ہوا تھا کہ جب میری میڈیسن کی پڑھائی مکمل ہو جائے گی تب میں شادی کروں گی اور اب میں نے اپنی والدہ کو اجازت دے دی ہے اپنی شادی کے لیے مگر میں نے اپنی والدہ سے یہ ضرور کہا ہے کہ میری شادی آپ جس سے بھی کریں اس سے میری اتنی انڈر اسٹینڈنگ ضرور ہو اور اتنی بات چیت ضرور ہو کہ مجھے پتا چل سکے کہ یہ بندہ میرے مائنڈ کو سمجھ بھی رہا ہے کہ نہیں۔ تاکہ مجھے بعد میں مشکلات نہ ہوں اور دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ مجھے ایسا شوہر نہیں چاہیے کہ جو بیوی کو شوپیس بنا کر گھر میں رکھے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میرے ساتھ میری والدہ بھی ہیں اور میں اپنی والدہ کو اس اسٹیج پہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ تو وہ ایسا بندہ ڈھونڈیں جو یہ

انڈر اسٹینڈ کرے کہ ثنا کی والدہ کی اگر طبیعت خراب ہے اور ثنا کہتی ہے کہ مجھے ہفتہ بھر کے لیے اپنی والدہ کے پاس جانا ہے تو اس کو انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ میری ثنا کو سمجھنا چاہیے۔

"گھرداری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"جو ایک سال میں نے بوائس میں گزارا ہے اس میں مجھے صحیح طرح اندازہ ہوا کہ میں کتنی گھرداری کر سکتی ہوں اور کس طرح کی گھرداری کر سکتی ہوں اب یہ تو نہیں کہوں گی آؤٹ اسٹینڈنگ ہوں گھرداری میں۔ پر میری والدہ یہ ضرور سب کو کہتی ہیں کہ میں نے اپنی بچی کو اتنا کھانا پکانا تو سکھا دیا ہے کہ وہ کبھی بھوکی نہیں مرے گی۔"

"اور کوئی خاص بات؟"

"ہاں وہ یہ کہ اگر انسان کو کچھ سیکھنا ہے تو وہ اکیلے سفر بھی کرے اور اکیلا بھی رہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ثنا مرزا سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

نادیہ خاتون

ہمارے نام
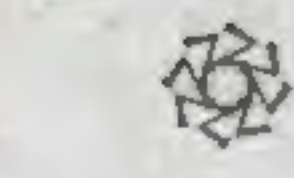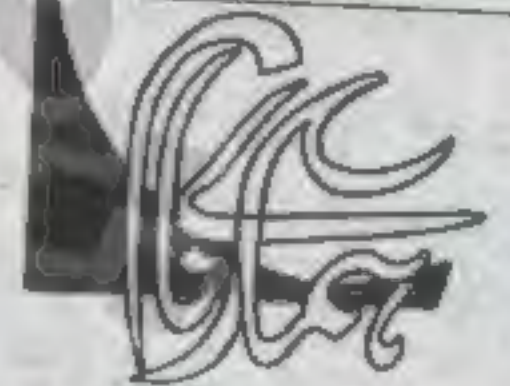
خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نگہت سیما۔ چکوال

خواتین، شعاع اور کرن اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ سائرہ رضا اور سمیرا حمید بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ مجھے "زمین کے آنسو" کے متعلق کچھ کہنا ہے اور قارئین کی محبتوں کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے وہ تمام قارئین جو پندرہ ماہ اپنے قیمتی وقت سے وقت نکال کر اپنی آرا دیتے رہے بذریعہ فون' SMS اور بذریعہ "ہمارے نام خطوط" میں ان سب کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ خاص طور پر سدرہ صفدر کی جنہوں نے ہر قسط کے بعد اپنی رائے مجھے بذریعہ میسج بھجوائی۔ یہ محض ایک تخیلاتی کہانی تھی تمام کردار تخیلاتی تھے ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہاں چار سال پہلے جب میں نے یہ کہانی لکھنی شروع کی تھی تو میں نے اس وقت موجود ایشو کو سامنے رکھ کر یہ کہانی لکھی جیسا کہ میری اکثر کہانیاں کسی نہ کسی معاشرتی ایشو کے پس منظر میں ہوتی ہیں۔ لیکن چار سال پہلے میں نے دو اقساط کا مواد لکھ کر یونہی لکھنا چھوڑ دیا۔ جب تین سال بعد میں نے قلم اٹھایا تو مجھے لگا جیسے میں اس کو اس طرح نبھا نہ سکوں گی جیسا تین سال پہلے مکمل کرتی تو لکھتی بہرحال لکھا۔ آپ نے پڑھا۔ پسند ناپسند کا اختیار آپ کو تھا۔ کہانی کے اندر کہانی کی تکنیک اور کہانی بھی وہ جس میں تاریخ کے الیے تھے۔ آپ نے اس حصے کو بھی پڑھا۔ کچھ نے پسند کیا کچھ نے برداشت کیا۔ سب قارئین کا شکریہ۔

مسز جبین اجمل نے روہڑی سکھر سے مجھے جو ناول لکھنے کا مشورہ دیا ہے وہ میں لکھ رہی ہوں۔ "تیرا ہاتھ" کے نام سے میرے اس ناول کے دو حصے مکمل ہو چکے ہیں' لیکن تیسرا اور آخری حصہ ابھی تک مکمل نہیں کر پائی ہوں۔ دعا کیجیے گا جلد مکمل کر پاؤں۔ بہت دعائیں۔

ج۔ نگہت جی! کامیاب تحریر پر ہماری جانب سے بھی مبارک باد قبول کیجیے۔ قارئین تک آپ کے جذبات پہنچا رہے ہیں۔ ہماری قارئین آپ کی اگلی تحریر کی منتظر ہیں۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

اس دفعہ خواتین انتظار کروائے بغیر ہی درشن دینے آگیا سب سے پہلے "بن مانگی دعا" عفت طاہر کی پڑھی کہانی کے خدوخال ابھرتے جا رہے ہیں۔ "زمین کے آنسو" سپرہٹ تحریر رہی گو کہ "زمین کے آنسو" تو نہ رکے لیکن زمین کا المیہ یہی ہے کہ اس کے آنسو بہتے ہی رہیں گے' لیکن آخری قسط کو بڑی فاسٹ اسپیڈ سے دوڑایا گیا۔ "ماہ تمام" میں ہماری تو ساری ہمدردیاں شفا کے ساتھ ہیں۔ بشریٰ احمد کا ناول بے حد عمدہ کاوش رہی۔ "پہلی ٹھوکر" کئی لوگوں کو صراط مستقیم پر لے آئی ہے۔ "کہیں ایسا نہ ہو" بہت ہی سبق آموز تحریر تھی۔ اس شمارے کی سب سے اچھوتی اور شاہکار تحریر "روزن" جس کو پڑھ کر آنسو نکل آئے ایسا ہر مرد سوچ لے تو کسی بیٹی کو بوجھ اور عذاب نہ سمجھا جائے بلکہ اپنی آخرت کو سنوارنے اور رسول کریمؐ کی محبت پانے کا ذریعہ سمجھا جائے میری طرف سے سعدیہ عزیز آفریدی کو ڈھیروں پھولوں کے ٹرک قبول ہوں۔

ج۔ پیاری ارم! سعدیہ عزیز آفریدی کی یہ کہانی ہمیں بھی بہت پسند آئی تھی اور ہم نے انہیں مبارک باد بھی دی تھی اب آپ کے پھولوں کے ٹرک بھجوا رہے ہیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خواتین ڈائجسٹ کی ہر تحریر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بے حد شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھیں گی۔

شبانہ کوثر۔ نور جمال شمالی

ٹائٹل اچھا لگا۔ خاص طور پر ٹائٹل گرل کی مہندی بہت اچھی لگی۔

کرن کرن روشنی پڑھ کے بہت معلومات ملتی ہے۔ سب سے پہلے پسندیدہ ناول "زمین کے آنسو" کی بات کروں گی۔ نگہت سیما جی آپ نے احمد رضا کو ماں باپ سے ملتے ہوئے کیوں نہیں دکھایا۔ مجھے اتنا تجسس تھا کہ کتنا خوب صورت منظر ہو گا جب احمد رضا اپنے ماں باپ سے ملے گا' لیکن آپ نے صرف سمیرا سے ملوایا اور وہ بھی ہنگامی صورت حال میں۔ رابیل کو آپ نے اکیلا کر دیا نگہت جی ایسا نہیں کرنا تھا نا۔ "ماہ تمام" ویلڈن آمنہ جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ جی یہ بتائیں کہ آپ اتنے الجھے ہوئے تجسس سے بھرپور کردار کیسے لکھ لیتی ہیں؟ اب میں آپ کے اس ناول کے کرداروں کو اپنے اندازے سے ملاؤں گی۔ آگے دیکھیں گے کہ میرے اندازے کتنے درست ثابت ہوئے۔ مجھے لگتا ہے کہ ماری کی ماں ملکہ ظہور ہے۔ سعد کی ماں رابعہ ہے۔ رابعہ ہی شہناز ہے۔ جو دو عورتوں کے درمیان مکالمہ ہے ان میں ایک شہناز ہے مطلب رابعہ اور جو بچہ ہے وہ سعد ہے۔ رضوان الحق ہی رکی ہے جو سارہ سے محبت کرتا ہے اور سارہ بھی رکی سے محبت کرتی ہے۔ یہ صرف میرے اندازے ہیں جی۔

"بن مانگی دعا" عفت سحر جی پہلی قسط ہی بہت جاندار ہے جی۔

ج۔ پیاری شبانہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تمام بہنیں اور دوستیں جن کی طویل فہرست آپ نے لکھی ہے انہیں ہم آپ کا سلام پہنچا رہے ہیں۔ معذرت کہ ہم ان تمام لوگوں کا نام نہیں لکھ سکتے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عنیزہ سید کے ناول کے بارے میں ہمیں ہر ماہ ایسے بہت سے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں مختلف اندازے لگائے جاتے ہیں۔ ہم بھی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں کہ یہ اندازے کس حد تک درست ثابت ہوتے ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

اقرا ملک۔ بہاول پور

"زمین کے آنسو" پڑھ کر آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ بہت بہت اچھی کہانی' اس سے اچھا اختتام۔ میری آپی اور بھابی کو بھی بہت پسند تھا یہ ناول۔ آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ آپ نے "مرلو پیلس" کی جو لوکیشن بیان کی ہے جیسے آپ بہاول پور رہ چکی ہیں یا آچکی ہیں کیا ایسا ہی ہے؟ بشریٰ احمد کا ناول بھی اچھا تھا۔ پہلی ٹھوکر اور ایسا بھی ہوتا ہے دونوں بہت اچھے تھے۔ ایک فرمائش ہے دنیا نیوز کے پروگرام "حسب حال" کے جنید سلیم کا انٹرویو کریں اور آپی بشریٰ سعید کا "سفال گر" کیا کتابی شکل میں آگیا ہے؟

ج۔ پیاری اقرا! بشریٰ سعید کا ناول سفال گر کتابی شکل میں آچکا ہے۔

نگہت سیما چکوال میں رہتی ہیں۔ وہ بہاول پور میں رہی ہیں یا نہیں' یہ تو ہمیں معلوم نہیں البتہ بہت سال پہلے ہم نے نگہت سے سوال کیا تھا کہ آپ لندن امریکا اور دیگر ممالک کے شہروں کے بارے میں لکھتی ہیں تو آپ کبھی گئی ہیں وہاں؟ (اس وقت انٹرنیٹ کی سہولت نہیں تھی۔ اب تو بٹن دباؤ تو ساری معلومات حاضر۔) نگہت نے اس کے جواب میں صرف ایک لفظ کہا تھا۔ "مطالعہ" وہ جس موضوع پر لکھتی ہیں پہلے اس کے بارے میں مطالعہ کر کے پوری معلومات حاصل کرتی ہیں پھر لکھتی ہیں۔

ملہوش طالب۔ لاہور

اس ماہ کا سرورق کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ تحریروں میں "بشریٰ احمد" کا ناول بہترین تھا۔ افسانے ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے۔ خواتین ڈائجسٹ میں اب پہلے سے زیادہ سلسلہ وار تحریریں لکھی جا رہی ہیں۔ گزارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ مکمل تحریروں میں اضافہ کریں۔ میری فیورٹ رائٹرز میں "فاخرہ جبیں اور راحت جبیں" شامل ہیں۔ راحت جبیں کا ناولٹ "ساری بھول ہماری تھی" ہمیشہ یاد رہے گا۔

ج۔ پیاری ماہ وش! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سلسلہ وار تحریریں ہمیں بھی پسند نہیں، لیکن مصنفین طویل تحریریں لکھتی ہیں تو انہیں ایک قسط میں شائع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ راحت جبیں اور فاخرہ جبیں تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ سرورق آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

صائمہ بنگش، ہما مسعود اینڈ حرا مسعود۔۔۔ کوہاٹ سے

اس بار پورا پرچہ ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ "زمین کے آنسو" نگہت آپی کے ناول کی آخری قسط دیکھ کر دل اداس ہوا کہ اب پتا نہیں کب دوبارہ ان کی تحریر پڑھنا نصیب ہوگا۔ آمنہ آپی سے ایک ریکویسٹ کرنا ہے کہ پلیز ماہ تمام کے صفحات بڑھا دیں۔ "من مانگی دعا" عفت آپی کا یہ ناول مجھے پہلی قسط سے ہی بہت پسند آیا ہے البتہ عنیزہ آپی سے ایک بات کہنا ہے کہ پلیز "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" کا ٹیمپو تھوڑا تیز کریں اور ماہ نور اور سعد کو جلد سے جلد ملا دیں۔ خبریں ادریں میں ملالہ کے بارے میں پڑھ کر بہت غصہ آیا۔ آخر ملالہ ہے کیا چیز۔ ایک کالم نگار نے کہا ہے ملالہ ایک اداکارہ ہے جو ایک بین الاقوامی اسٹیج ڈرامے میں کردار ادا کر رہی ہے اور بہترین اداکاری پر اسے بین الاقوامی پروموٹرز اور ڈائریکٹرز کی جانب سے اعزازات سے نوازا جا رہا ہے۔

ج۔ صائمہ، ہما اور حرا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی امی کا بھی شکریہ، وہ ہماری اتنی پرانی قاری ہیں۔ ان سے کہیں، وہ ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ امر بیل کتابی شکل میں آچکا ہے۔ نگہت سیما کی تحریر آپ بہت جلد پڑھ سکیں گی۔ وہ مکمل ناول لکھ رہی ہیں۔ اگر جلد مکمل ہو گیا تو جنوری کے شمارے میں شامل ہوگا۔

شاہ رخ حسن۔۔۔ گوجرانوالہ

موسم بدل رہا ہے، مگر دن عجب ٹھہرے ٹھہرے سے ہیں۔ سردیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ "تمہارے نام" میں سحر خان نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ سیرابونس ہارون کا اک لمحہ بہت اچھا لگا۔ خاموش خاموش سی سب کچھ کہتی ہوئی محبت تھی اس میں۔ بشریٰ احمد شکر اور توکل کا درس دیتی بھا گئیں۔ اس دفعہ شمارے کی سب سے اچھی کہانی "روزن" تھی۔ بہت ہی شاندار کاوش تھی۔ عنیزہ سید بہت ہی باکمال لکھتی ہیں۔ "ماہ تمام" کچھ خاص پسند نہیں۔ "زمین کے آنسو" نگہت سیما کی یہ تحریر مجھے متاثر نہ کر سکی یقیناً" یہ ایک معلوماتی تحریر تھی، مگر بعض اوقات یوں محسوس ہوتا مصنفہ محض واقعات سے آگاہ کرنا چاہتی ہیں۔ کہانی کی بنت اور ربط بعض مقامات پر سمجھ میں نہ آنا اور کرداروں کی بھرمار۔ یہ میری کوتاہ بینی ہے۔ میری خامشی کو بیاں ملے میں زریں گل کو پڑھ کر دل اداس ہو گیا تنہا تنہا سی لگیں وہ، فرقان اللہ کی غزل کا یہ شعر اچھا لگا۔

نہ محبت ہے نا سچ لوگ ہمیں
کیا یہ مضمون اختیاری ہے؟

اکثر خطوط میں اس قسم کے فقرے لکھنے سے منع کیا جاتا ہے کہ ایسا لکھنا گناہ ہے یہ ہے وہ ہے۔ مثلاً "اللہ میاں" کی بجائے نہیں کہنا چاہیے۔ اللہ نے اسے فرصت سے بنایا نہیں لکھنا چاہیے تھا اور اب اس دفعہ شمارے میں اک قاری بہن نے کہا کہ قرآن پاک کو ختم نہیں مکمل کہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ میں صرف یہ کہوں گی کہ یہ انسان کا اپنا ذہن ہے جس طرف مرضی لے جائیں۔ اب قرآن پاک میں لفظ "یداللہ" ہے اس کا لفظی مفہوم اللہ کا ہاتھ نکلتا ہے مگر ہم اسے اللہ کی مدد اور نصرت میں تبدیل کرتے ہیں۔ اب اللہ میاں کی بجائے لکھا تو کائے اللہ ہی کی ہوتی ہے۔ اللہ ہی خالق ہے۔ جیسے عبداللہ۔ اللہ کا بندہ ہوتا ہے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک جگہ اور ایک ملک میں ان کا مفہوم برائی کے معنوں میں لیا جاتا ہے اور کسی دوسری جگہ ان ہی الفاظ کا مفہوم اچھائی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ بات صرف ہماری سمجھ کی ہے۔ آخر میں یہ کہ اللہ آسانیاں پیدا فرمائے ہمارے لیے۔

ج۔ پیاری شاہ رخ! آپ کا طویل خط پڑھا، الفاظ آپ کے ذہن میں اودھم مچائے رکھتے ہیں تو انہیں صفحات پر منتقل کریں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔

"ماہ تمام" اور "زمین کے آنسو" آپ کو متاثر نہ کر سکیں۔ معذرت کی ضرورت نہیں، نہ ہی آپ کی کوتاہ بینی ہے، بلکہ بات صرف اپنی رائے اور پسند کی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک چیز سب ہی کو پسند ہو۔ پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا۔

سلسلہ وار تحریریں کے لیے نوازش۔

حیا فاطمہ۔۔۔ بہاول پور

جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے نگہت سیما کی "زمین کے آنسو" ایک ہلکی سی خلش رہ گئی۔ وہ تھی رابیل کی نارسائی۔ "ماہ تمام" اور "من مانگی دعا" دونوں بہت ہی زبردست جا رہی ہیں۔ افسانوں میں پہلی ٹھوکر کافی سبق آموز تحریر تھی۔

ج۔ حیا فاطمہ! اشعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ ہر ماہ خط لکھیں، ہم آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

خواتین کے سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ ہم تہہ دل سے ادارے کے مشکور ہیں۔ کمی وقت کے باعث ترجمہ و تشریح نہیں پڑھ پائے مگر بہت کچھ خواتین میں پڑھنے کو ملتا ہے اور "زمین کے آنسو" کی آخری قسط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ انہوں نے تاریخ کے جو اوراق پلٹے وہ بہت اچھا لگا، کہانیاں ساری اچھی تھیں۔

ج۔ پیاری عالیہ! آپ نے لکھا ہے کہ عفت سحر پاشا کی کہانی کا پہلا حصہ بھجوا دیں۔ ہم سمجھ نہیں پائے کہ اس کا کیا مطلب ہے کیا آپ کو اکتوبر کا شمارہ چاہیے؟ مگر ایڈریس تو آپ نے لکھا ہی نہیں کس ایڈریس پر بھجوائیں؟

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم احمد۔۔۔ لاوہ

بخار جان ہی نہیں چھوڑ رہا۔ سخت بیمار ہوں اس کے باوجود سارا رسالہ پڑھ ڈالا ہے۔ سب سے پہلے "زمین کے آنسو" کو پڑھا۔ کیا لاجواب آخر ہوا ہے۔ رابیل کے لیے تھوڑا دکھ تو ضرور ہوا مگر اس کی ماں کا انجام پسند آیا۔ سعدیہ عزیز نے بہت کمال کی کہانی لکھی۔ ہر مایوس انسان کی زندگی میں ہانیہ سا روزن ہونا ضروری ہے۔ ہانیہ کے ابا جی بھی بہت اچھے لگے۔ افسانوں میں "کہیں ایسا نہ ہو" بہت پسند آیا ہے۔ بلاشبہ ہم کسی کے اوپر ایک حد تک اپنی محبت کی قید لگا سکتے ہیں۔ "من مانگی دعا" کا پلاٹ پرانا ہے اس لیے کچھ خاص مزہ نہیں آرہا۔ "زندگی تیری" بہت اچھا ناول تھا۔ سارے کردار یعنی سب بہنیں اور ان کے والدین جس قدر صابر شاکر تھے ایسے لوگ بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ بس ایک لمحہ تھوڑا فلمی سا تھا۔ باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج۔ پیاری ارم! بیماری اور بخار کی حالت میں آپ نے خط لکھا۔

اس محبت اور قدردانی کے لیے بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ آمین۔

شاہدہ ظفر۔۔۔ نامعلوم شہر

مسلسل چار ماہ سے کوئی خط شائع نہیں ہوا۔ شکوہ کرنے پر معذرت، مگر ہم دیہاتی بڑی مشکل سے خط پوسٹ کرواتے ہیں۔

نگہت سیما جی کو خراج تحسین کن الفاظ میں پیش کروں۔ پندرہ اقساط پر مشتمل ناول کی کسی قسط نے بوریت کا شکار نہیں کیا۔ "ماہ تمام" میں تقی کے والد اور ساہر کا حد سے زیادہ منفی رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔

ج۔ پیاری شاہدہ! معذرت کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے۔ ہمیں احساس ہے کہ گاؤں میں خط پوسٹ کرانے کے لیے آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

سب سے پہلے ٹائٹل، بہت پسند آیا۔ "زمین کے آنسو" رابیل پر دکھ ہوا، اس کا کوئی قصور نہیں تھا مگر سزا اس کو ملی۔ ایبک کا کردار میرا فیورٹ تھا۔

خبریں ادریں میں صنم بلوچ کو پڑھ کر اچھا لگا، شادی کی مبارک باد۔ باقی ملالہ یوسف زئی کی تو آپ نے تصویر بھی کیوں دی، مجھے ملالہ کے متعلق پڑھ کر بہت غصہ آیا، امریکی ایجنٹ، سلمان رشدی ملعون کی حمایت کی اس بدبخت نے، اور ہمارا میڈیا کیسا ہے جو اس ملعون کو پروموٹ کر رہا ہے۔ جو ہمارے نبی کا نہیں وہ ہمارا بھی نہیں ہے۔

صنم جنگ کو تو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ نفسیاتی الجھنیں، عدنان بھائی کے مشوروں سے ہمیشہ کی طرح مستفید ہوئے۔ "میری خامشی کو بیاں ملے" زریں گل کو پڑھا اچھا

گا' کیا واقعی عورت کے پاس پیسہ' گاڑی اور آزادی ہو تو میاں کی کمپنی کی ضرورت نہیں رہتی؟ حیرت ہے۔ روبینہ صفدر نے بھی اچھا لکھا' روبینہ نام کا مطلب مجھے بھی نہیں معلوم تھا' اب ہو گیا۔ تعلیمی قابلیت پڑھ کر رشک آیا' میں میٹرک پاس ہوں' مجھے بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر اپنا شوق پورا نہیں کر سکی۔ میری والدہ جن کا انتقال پچھلے سال ہوا ہے۔ انہوں نے کبھی اسکول دیکھا تک نہیں تھا' مگر میری والدہ اتنی قابل تھیں کہ کسی بھی موضوع پر بلا جھجک بات کر لیا کرتی تھیں۔ سیاست'

انہیں پڑھنے کا بہت شوق تھا' ہر وقت کچھ نہ کچھ فارغ وقت میں مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ دوران تعلیم ہم جب کسی نصابی مشکل میں پھنستے تھے تو امی کی مدد لیتے تھے اور وہ مسئلہ حل کر دیتی تھیں۔ جوڑوں کے درد سے معذور ہو گئیں تب بھی بیٹھے بیٹھے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ ٹیسٹ لے لیتی تھیں۔ ریڈنگ سن لیتی تھیں۔

ج۔ پیاری عائشہ! اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ محترمہ کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ علم پھیلانا' کسی کو کچھ سکھانا بہت بڑی نیکی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں' تعلیم ڈگری حاصل کرنے کا کام نہیں' ذہانت خداداد ہوتی ہے جسے انسان اپنے شوق اور اپنی محنت سے جلا دیتا ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر جنہوں نے نام پیدا کیا' قوم کی خدمت کی۔ یہ ان کی ماؤں کی تربیت کا نتیجہ تھا جن کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی یہ مائیں بہت پڑھی لکھی یا بڑی ڈگری ہولڈر نہیں تھیں' لیکن اعلا تربیت یافتہ ضرور تھیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

شیریں ظفر۔ ملتان

نظیر فاطمہ کا افسانہ "ایسا بھی ہوتا ہے" پڑھ کر بہت لطف آیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے گھر بھی پیش آیا جب ہمارے پیارے بھائی اپنے کسی دوست کے گھر سے شامی کباب کھا کر آئے اور اس کے بعد ان کی نظر میں بھی کباب نہ جچے۔

"زمین کے آنسو" نگہت سیما جی آپ کے منجھے ہوئے قلم کی ایک زور آور تحریر تھی مگر کہانی میں کچھ ایک جھول بھی تھے۔ آخر میں آ کر حور عین کا کردار جو کہ کہانی میں بڑا پاور فل تھا۔ بودا اور کمزور بھی لگنے لگا۔ دارو سائیں اور اپنی ماں بہنوں کی کہانی کے علاوہ آپ نے تاریخ اور سیاست پر بھی بھرپور روشنی ڈالی۔ پہاڑوں میں رہنے والی سادہ دیہاتی لڑکی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کراچی کے حالات پر بھی کما حقہ روشنی ڈالتی رہی۔ "بلیک ہاؤس" اور "الریان" کے مکین بھی مائرہ آنٹی کو بے نقاب نہ کر سکے۔ رابی کو ناکردہ گناہوں کی سزا وار بنایا گیا۔ اریب فاطمہ کو صرف سادگی اور نیک دلی کا بہت بڑا انعام ملا۔ احمد رضا بھی بڑا بستا مطلب آرام سے اتنے بڑے نیٹ ورک سے نکل آیا۔ موضوع بہت وسیع تھا مگر آپ نے اس کو اتنی وسعت اور لگن سے لکھا نہیں جتنی محنت سے کہانی کی بنت کو شروع کیا۔

"یہ میرا خیال ہے ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔"

سعدیہ عزیز آفریدی نے اپنے اسٹائل سے ہٹ کر لکھا ناولٹ "روزن" شکر ہے کہ مجنت رونی کرائی نہیں تھی نہ ہی گھٹن زدہ کردار تھے' مگر ہیرو کا نام ضرور "ن" پر ختم ہوتا تھا۔ سعدیہ جی کا ہیرو ہو اور اس کا نام "ن" پر ختم نہ ہو یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

سفیان' ذیان' عفان' عرفان' زارون' نعمان' آن بان' شان' یہ ضرور ہی سعدیہ کے ہیرو ہوں گے۔

ج۔ پیاری شیریں! تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ "تمہارے نام" کا سلسلہ آپ لوگوں کی آرا کے لیے ہی ہے۔ تعریف ہو یا تنقید ہمارے لیے دونوں ہی یکساں اہم ہیں۔ آپ کے تفصیلی اور تنقیدی خط ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں "زمین کے آنسو" میں حور عین سادہ دیہاتی لڑکی ضرور تھی لیکن حساس اور ذہین تھی۔ جب اسے حویلی سے اس کے ماموں لے کر آئے تو انہوں نے اسے اسکول میں داخل کرا دیا تھا جہاں اس نے تعلیم حاصل کی۔

اریب فاطمہ کو صرف سادگی اور نیک دلی کا بڑا انعام نہیں ملا بلکہ اس کے ساتھ اس کی ماں کی دعائیں تھیں جنہوں نے پوری زندگی بہت صبر سے کاٹی تھی' اللہ تعالیٰ کو کہیں تو صلہ دینا تھا۔ احمد رضا آرام سے نکل آیا' حقیقی زندگی میں واقعی ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن آپ نے شاید غور نہیں کیا۔ اس کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ وہ کبھی بھی کہیں بھی کسی اندھی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ پھر کہانی اور حقیقت میں اتنا مارجن تو ہوتا ہے۔

سحر صبا۔ فیصل آباد

سچ ہے کہ آپ کے رسالے میں کسی نئی چیز کی گنجائش نہیں نہ صلاح مشورے کی' اور نہ تنقید کی۔ سب بہت پیارا لکھنے والوں کا ساتھ نصیب ہے آپ کو اور یہ ساتھ ہمیشہ رہے۔

مجھے کہنے دیجیے "اپنے شہر اپنے گاؤں کی سیر کراتے خود سے ملواتے' بہت زیادہ تعریف کرتے اور بہت زیادہ تنقید کرتے اور بے لاگ تبصرے والے خط اور پھر ان کو دیے جانے والے آپ کے جواب بہت پسند ہیں۔ لیکن آج کل تو ہر خط میں بس ایک بات پوچھی جاتی ہے اور میں پڑھ کر سوچتی ہوں کہ آپ اس ایک سوال سے کتنا اکتا چکی ہوں گی۔ صرف کہانی کا پوچھا جاتا ہے' کیسے لکھتے ہیں' کہاں بھجوانی ہے پھر چھاپی کیوں نہیں

آپ کا کہنا ہے لائبہ ہٹ دھرم اور ضدی نہیں تھی۔ جبکہ رائٹر ایسا لکھ رہی ہے۔ پھر آپ نے کہا کہ گل نین نے صبر نہیں کیا تو آپ نے شاید اس کی تکلیف نہیں پڑھی۔ کسی بھی لڑکی کے ساتھ مجھے نہیں لگتا کہ اتنی بڑی بات ہو جانے کے بعد وہ صبر سے رہتی؟ پھر آپ نے کہا چور گل نین کے اندر تھا۔ اس کے دل میں چور ہوتا تو جو آگ حمیدہ نے لگائی۔ وہ گل نین کو خود لگانی چاہیے تھی کہ اس کا بدلہ صاف ہوتا۔ وہ ملازمہ نہیں تھی۔ جیسنم نے صرف خان بابا کی نظر میں خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اسے سنبھالا۔ اور آپ چور کہہ رہی ہیں۔ کیا لائبہ کو اس ملازمہ کا منہ نہیں توڑنا چاہیے تھا جو اس کے شوہر کے متعلق ایسی بات کہہ رہی تھی۔ ٹھیک ہے مرد کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور کیا گل نین جیسے کردار زمانے میں نہیں ہوتے تو پھر انہیں کون تحفظ دے گا؟ کم سے کم ان کے لیے دروازے تو بند مت کریں۔ اور پھر جیشم نے نکاح کیا کوئی گناہ نہیں کیا؟ اور کیا زوہیب شادی کر لیتا اور اگر میں گل نین کی جگہ ہوتی اور مجھے کہا جاتا اپنے ہی کن مکار سے شادی کر لو میں تو اس کے منہ پر جوتا بھی نہ مارتی اپنا۔ تھوکتی بھی نہیں۔

لڑکیوں کو صرف بسے بسائے گھر کو بچائے رکھنے کی ہدایات دیا کریں نہ کہ لائبہ جیسے کردار کا ساتھ دے کر انہیں معاشرے میں بگاڑ کی وجہ بنائیں۔

ج۔ پیاری سحر! بانو قدسیہ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا عورت ماں کی شکل میں بھی بہت مضبوط ہوتی ہے اور بیٹی یا بہن ہو تب بھی بہت پیاری ہوتی ہے صرف بیوی کے روپ میں اس کی پوزیشن کمزور ہوتی ہے ذرا سی تیز ہوا سے اس کے آشیانے کے تنکے بکھر جاتے ہیں' اسی لیے وہ ہر وقت خوف زدہ رہتی ہے۔ ہمارا نقطہ نظر اب بھی یہی ہے جوان اور خوب صورت لڑکی کو گھر میں رکھنا جبکہ وہ غریب اور بے آسرا بھی ہو بہت بڑا خطرہ مول لینا ہے ملازمہ ہو یا نہ ہو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے مذہب میں اسی لیے نامحرم سے پردہ کا حکم آیا ہے اور پھر آپ نے خود لکھا ہے کہ مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔

مرد کو بے شک چار شادیوں کی اجازت ہے۔ بہت سی عورتیں بخوشی دوسری بیوی بننا تو گوارا کر لیتی ہیں لیکن اپنے شوہر کی دوسری شادی کوئی بھی عورت خوشی سے برداشت نہیں کرتی۔ مجبوری کی بات الگ ہے۔

صفیہ عباس۔ کروڑ لعل عیسن

نومبر 2013ء کا ٹائٹل پیارا تھا۔ "زمین کے آنسو" میں "مائرہ کو بھی اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ مگر احمد رضا کے سین میں تھوڑی کمی تھی۔ مجھے انتظار تھا کہ ان باپ بیٹے کو ملایا جاتا تو وہ منظر کہیں زیادہ خوب صورت ہوتا۔ "بن مانگی دعا" اپنے نام کی طرح دل میں اتر گیا ہے ابیہا کے ساتھ میری دعائیں ہیں۔

آمنہ ریاض کا ماہ تمام بھی بہت دلچسپ موڑ پہ ہے۔ تقی کو مار پڑی تو سچ میں مجھے بھی رونا آ گیا۔ ساہر کی سوچ بہت گھٹیا ہے۔

ج۔ پیاری صفیہ! آپ کا خط شامل اشاعت ہے ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
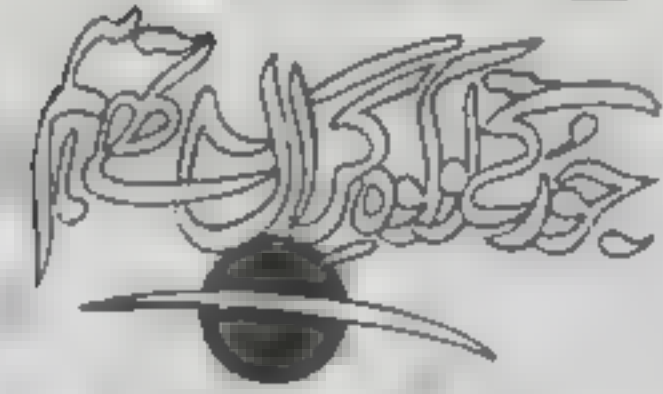
"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"خیر! ایسی۔ حماقت تو میرے بیٹے نے بھی کبھی نہیں کی میرے بی ہاف پر کسی کو امید دلانے کی حماقت۔" وہ بے لچک انداز میں بولے۔ "لیکن تمہیں اس بات کا مارجن دیا جا سکتا ہے کہ تم جن پہلوانوں کی اولاد ہو وہ دماغ کے بجائے معدے سے سوچنے کی جبلت جینز میں پرو کر تمہیں ورثے میں دے گئے ہیں تمہارا ابھی کوئی قصور نہیں۔"

۔۲۱۔
اکیسویں قسط

"جی جی۔ یہ آپ نے ٹھیک کہا۔" ابراہیم ہار جن ملنے کی خبر سن کر اس بات سے متفق ہونے پر بھی تیار ہو گیا۔ وہ ماہ نور کو بلال سلطان سے ملوانے اچانک لے آیا تھا۔ نہ اس نے ان کو پیشگی اطلاع دی تھی نہ ان سے ملاقات کا وقت اور اجازت مانگی تھی اور اب یہ ہی غلطی اس کے لیے مہنگی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ماہ نور سے شرمندہ ہونا چاہتا تھا نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ ماہ نور اور بلال سلطان کی ملاقات ہونے سے رہ جائے۔

"میرے پاس لنچ بریک کے صرف بیس منٹ ہیں اور بیس منٹ کا مطلب ہوتا ہے بیس منٹ یعنی بارہ سو سیکنڈز' میں اپنا لنچ تمہاری حماقت کے سامنے سیکری فائس کر سکتا ہوں کیونکہ تم نے ٹھیک کہا تم مجھے اسی طرح عزیز ہو جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کو ہو سکتا ہے۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

"جی انکل!" ابراہیم کی باچھیں کھل گئیں۔ "جی جی بالکل ٹھیک' میں ابھی اسے بتا کر آتا ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھا اور باہر کی طرف چلا۔ شرمندگی سے بچ جانے کی خوشی اور بیس منٹ یعنی بارہ سو سیکنڈز کے اعلان کے دباؤ میں وہ باہر نکلتے نکلتے پہلے ایک چھوٹی تپائی اور پھر صوفے کی ٹانگ سے بری طرح ٹکرایا۔

ماہ نور کو بلال سلطان کے وقت اور اصول کے متعلق بتا کر اسے ان کے پاس بھیجنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر اپنی چوٹ کھائی ٹانگ اور بند جوتے کے اندر سے پاؤں نکال کر انگوٹھے کا زخم سہلاتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرا نام ماہ نور ہے اور میں لاہور میں رہتی ہوں۔"

"لاہور میں رہتی ہو تو یہاں اسلام آباد میں کیا کر رہی ہو؟"

"میں یہاں آپ کے بیٹے سعد سلطان سے ملنے آئی تھی۔ پتا چلا کہ وہ تو یہاں نہیں ہے تو سوچا آپ سے مل لوں۔"

"سعد سے کس سلسلے میں ملنے آئی تھیں؟ اور میں بتاتا چلوں کہ میں سعد سلطان کا باپ ضرور ہوں لیکن اس کا متبادل ہرگز ثابت نہ ہو سکوں گا۔"

"میں آپ کو اس کا متبادل سمجھ بھی نہیں رہی' میں آپ سے اس لیے ملنے آئی ہوں کہ مجھے آپ سے ملنا تھا' آپ کو بتانا تھا کہ یہاں سے خاصے فاصلے پر لاہور سے آگے ایک گاؤں میں ایک خاتون رہتی ہیں' جو آپ کو خوب اچھی طرح جانتی ہیں' نہ صرف جانتی ہیں بلکہ آپ کے ذکر پر تڑپ تڑپ کر روتی بھی ہیں۔"

"بلیک میلنگ ہتھکنڈے۔" انہوں نے ابرو چڑھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "نہیں چلیں گے' ایک کاروباری انسان ہونے کی حیثیت سے میں ان کا عادی بھی ہوں اور ان سے نمٹنا بھی جانتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں آپ کو بلیک میل کرنے نہیں آئی' نہ ہی وہ خاتون کبھی ایسا چاہیں گی جو آپ کو جانتی بھی ہیں اور آپ کا ذکر سن کر تڑپ تڑپ کر روتی بھی ہیں ان کا نام رابعہ ہے' مولوی سراج سرفراز کی زوجہ رابعہ جو گاؤں میں بھین جی کے نام سے بلائی جاتی ہیں۔"

مسلسل حرکت کرتی ریوالونگ چیئر ساکت ہوئی اور اس پر بیٹھے شخص کے چہرے کا رنگ لمحہ بھر کے لیے بدل گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی اور وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بیس' پچیس' تیس' ایک گھنٹہ' دو گھنٹے اور ان کے آگے نجانے کتنے ہی اور منٹ بھی گزر گئے' بلال سلطان اور ماہ نور کی ملاقات ختم ہونے میں نہیں آئی۔ باہر بیٹھا ابراہیم منتظر نظروں سے اس کمرے کے دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے اور اس کا ذہن یہ سوچ سوچ کر گھومنے لگا تھا کہ بلال سلطان کی لنچ بریک ختم کیوں نہیں ہو رہی تھی۔

لاحول ولا...!" چوہدری سردار کے حلق میں جیسے زہر سا گھل گیا۔ "یہ خاتون آج بھی ویسے ہی بے ہنگم حلیے میں ہیں جیسی کئی سال پہلے ہوا کرتی تھیں۔ زمانہ بدل گیا' زمانے کے سارے رنگ ڈھنگ بدل گئے مگر یہ نہیں بدلیں۔ عمر کا بھی لحاظ نہیں ہے انہیں' بڑے بڑے رنگ برنگ پھول پتوں والا جمپر اور وہی شوخ رنگ قمیص' دوپٹے کے نام پر کپڑے کی دھجی سی سر پر ٹکائے ابھی بھی ویسی ہی کم عمر بننے کی کوشش فرما رہی ہیں جیسی اس وقت تھیں جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زندگی میں بہت سی خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا کچھ بہت باذوق' کچھ سادہ سی' کچھ بے ذوق بھی مگر یہ خاتون اپنی طرز کا واحد نمونہ ہیں۔ اتنے سالوں میں فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ ان کے بالوں کا جھنڈ سفید ہو گیا۔ باقی تو۔" انہوں نے سوچتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

چوہدری سردار اپنے فارم ہاؤس کے مہمان خانے میں آئی خاتون کو شرف ملاقات دینے ادھر آئے تھے اور اس وقت مہمان خانے سے ملحق طویل راہداری کے درمیان کھڑی شیشے کی دیوار کے پار بیٹھی مہمان کو دیکھ کر ٹھٹکے کھڑے تھے۔

"اور یہ ان کو اتنے برسوں بعد ادھر کا پتا کس نے تھما دیا اور جو یہ آج بھی اتنی ہی مردمار ٹرا کا اور غصیلی ہوئیں تو پھر ان کی مہمان داری کون کر پائے گا بھلا۔" انہیں یاد آ رہا تھا کہ کئی برس پہلے ان خاتون کا مزاج کیسا تھا۔

"اب نہ جانے یہ یہاں آئی کس لیے ہیں' کیا پوچھیں گی' کیا کہیں گی' ان کے تو مزاج کے بارے میں کچھ بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔" انہیں وہم بھی ستا رہے تھے۔ "چلو بھئی' چوہدری سردار اس اوکھلی میں سر تو دینا ہی پڑے گا' ان کے آگے تو کوئی بہانہ بھی چلنے والا نہیں۔ ملنے کے ارادے سے آئی ہیں تو ملاقات کیے بنا ٹلیں گی نہیں' بہانہ بنایا تو کیا پتا یہیں قیام پذیر ہو جائیں کہ جب تک ملاقات نہیں کرو گے جانے والی نہیں میں۔" وہ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے کھنکھار کر اپنی آمد کی اطلاع دیتے مہمان خانے میں داخل ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ذات کے میراثیوں کے ہاتھ شرفا کا شجرہ لگ جائے تو وہ اسے کیسے توڑ اور کس طرح موڑ سکتے ہیں۔ اس کا تذکرہ صرف سنا ہی تھا۔ اب ذاتی تجربہ بھی ہو رہا ہے۔ سنا ہے میراثیوں میں ایک بات پر بہت اکڑ ہوتی ہے کہ گاؤں کے طرم خان چوہدری بھی ان کے پاس اپنے خاندانوں کے شجرے بطور امانت رکھواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باراتوں بیاہوں میں جب وہ دولہا یا دلہن کے رشتہ داروں پر جگتیں کسنے لگتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کے بخیے بڑی آسانی سے ادھیڑ لیتے ہیں۔" بلال سلطان نے کہا اور یہ بات کہتے ہوئے ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی' جیسے انہیں کسی بات سے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔

"مگر بھین جی تو بہت اللہ والی' ایمان دار اور متاثر کن شخصیت کی مالک ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایسی بد دیانتی کر سکتی ہیں۔" ماہ نور نے جواب دیا۔

"تمہیں اپنی نظر کا معائنہ کرانا چاہیے لڑکی!" بلال سلطان کا لہجہ مزید سنجیدہ ہوا۔ "ضروری تو نہیں کہ سامنے والا جو بات کہہ رہا ہو' وہ لازمی سچ ہو۔"

"لیکن ان کی باتوں کی سچائی کا ثبوت تو یہ بھی ہے نا کہ آپ ان کی تائید کر رہے ہیں۔" ماہ نور نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ اسے بلال سلطان سے زیادہ خود زعم شخص پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ نہ صرف خود زعمی میں مبتلا تھے بلکہ خود پسند بھی تھے' اس نے ان سے گفتگو کے بعد فیصلہ کیا تھا۔

"میں نے واقعات کے ظہور پذیر ہونے کی تائید ضرور کی ہے' لیکن یہ تو نہیں کہا کہ وہ ویسے ہی ظہور پذیر ہوئے جیسے تمہیں بتایا گیا ہے۔"

مغیز میں یہ تو نہیں جانتی کہ حقیقت میں وہ کس طرح ظہور پذیر ہوئے، لیکن مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ سعد کو ان ساری باتوں سے بلاوجہ لاعلم رکھا گیا۔ اس لاعلمی نے اسے کس ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا، اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے۔ آپ نہیں جانتے" وہ اپنے اندر کی اذیت کو دبانے کے لیے کیسے قریہ قریہ بستی بستی خوار ہوتا رہا۔ کبھی ایک روپ میں، کبھی دوسرے روپ میں اس امید کے ساتھ کہ شاید کہیں کسی قریے میں، کسی بستی میں، کسی پنڈال میں، کسی روپ میں، کسی بہروپ میں اسے کوئی ایسا سرا ہاتھ لگ جائے جس کے سہارے ساری گتھی سلجھ جائے۔ آپ کیسے باپ ہیں، جو آپ کو اس کی اس اذیت کا اندازہ ہوا نہ اس کا مداوا کرنے کا خیال آیا۔" وہ جذباتی ہونے لگی۔

بلال سلطان نے چونک کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی کی آنکھیں اور ناک شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں اس کے چہرے پر گہرا دکھ تھا۔ ان کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی تھی۔

"تم ابھی کم عمر ہو۔" انہوں نے پہلے کی نسبت نیچی اور نرم آواز میں کہا "نا تجربہ کار بھی ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ زمانے بھر کے ڈیٹیکٹوز (سراغ رساں) جب ایک انسان کو مجرم ثابت کرنے پر تل جائیں، ان کے دستانہ پوش ہاتھ ایک کے بعد ایک ایسا کلیو اٹھا کر سامنے لاتے جائیں جن کے مطابق واردات کے سارے ثبوت ایک ہی بندے کی طرف جا رہے ہوں اور حقیقت یہ ہو کہ وہ بندہ، سرے سے مجرم ہی نہ ہو تو اس کے لیے خود کو بے گناہ ثابت کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، مشکل کیا ناممکن ہوتا ہے۔" ان کے لہجے کی سنجیدگی سے ایک بے بسی کی بے چارگی ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماہ نور نے نظریں جھکالیں اسے لگا، اس ایک لمحے میں وہ بلال سلطان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

"میں نے اس ناممکن کا زہر پیتے عمر گزار دی۔ وہ میرا بیٹا ہے، مگر اس کے اور میرے درمیان ناممکن کا ایک لفظ دو موہی برچھی کی طرح گڑا ہے۔ دائیں حرکت کرو تو برچھی چیرے، بائیں حرکت کرو تو برچھی چیرے، اس لیے میں نے خود کو سیدھا اور ساکت رکھا، اس لیے کہ ذرا سی جنبش سے ناممکن کی یہ برچھی میرے اور اس کے رشتے کو کاٹ سکتی تھی۔"

ماہ نور نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"تم جانتی ہو کہ ایک رشتے سے وہ پہلے ہی محروم تھا، میں اسے دوسرے رشتے سے محرومی کے دکھ سے بچانا چاہتا تھا۔ مگر زمانے کے یہ ڈیٹیکٹوز اپنے اپنے کھرے اٹھائے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں پھر بھی اس سے ٹکرا گئے۔ یقیناً" ہر کسی نے اپنا کھرا اسے دکھاتے ہوئے کہا ہو گا کہ دیکھ لو کھوج کی لکیر تو تمہارے اپنے گھر کی طرف جا رہی ہے، ایسی صورت میں اس نے اور کیا کرنا تھا۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"اپنے باپ کو ماں کے قاتل کے روپ میں ملنے کے بعد دو طریقے ہو سکتے تھے یا تو وہ طیش کے عالم میں باپ کو قتل کر دیتا یا پھر وہ کرتا جو اس نے ابھی کیا، باپ کی نظروں سے دور چلا جاتا نہ اس کو دیکھتا نہ اپنی شکل دکھاتا۔ اس نے شاید یہ بہتر راستہ اختیار کیا۔" انہوں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے دیکھا۔ بنا کوئی جنبش کیے، سوال جواب کے بغیر، ارادے اور نیت کی کسی لغزش کے بغیر بھی ناممکن کی یہ برچھی اپنا کام دکھا کر رہی، مگر میں خوش ہوں۔" انہوں نے اپنی آنکھوں کے اندرونی کناروں کو دو انگلیوں سے دبایا اور پھر ماہ نور کی طرف دیکھ کر بولے۔

"وہ مجھ سے دور چلا گیا، جتنا میں اس کو جانتا ہوں، وہ خود کو اذیت میں مبتلا کر کے اپنے تئیں مجھ سے انتقام لینے کی کوشش کر رہا ہے، مگر تم جانتی ہو، میرے جیسے انسان کے لیے اس نے بدترین انتقام منتخب کیا ہے، میرے اعصاب، جذبات، ہمت، طاقت، حوصلہ، سب کی آزمائش ہے یہ اور یہ گھڑی مجھ پر آنی بھی چاہیے تھی کیونکہ اتنے برس

میں اس سے محفوظ رہا جو ہوا، اس میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ میری بے احتیاطی، میری کوتاہی، میری بزدلی اور کم ہمتی بھی تو قصوروار تھی پھر ایسا کیوں ہو کہ مرنے والے دنیا سے چلے جائیں، کمزور اور بے بس لوگ ٹھکانے سے بے ٹھکانا ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے خود کو ایک مشترکہ دشمن کے وار سے بچاتے پھریں اور میں محفوظ رہوں، میں عیش کرتا رہوں، واقعات کا ایک کردار میں بھی تو تھا، کڑی کی گھڑی مجھ پر بھی تو آنی تھی اور یاد رکھنا۔"

انہوں نے انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "آزمائش کی سب سے سخت گھڑی وہ ہوتی ہے جب آپ ذہنی طور پر خود کو اس سے محفوظ تصور کر رہے ہوں اور وہ اچانک آپ کو آن دبوچے۔ اللہ محفوظ رکھے بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے یہ بڑی سخت۔" انہوں نے اپنے کان پکڑے۔

"ہونہہ!" ماہ نور نے سر جھٹک کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "تو گویا آپ خود کو آزمائش میں گھرا محسوس کرتے ہیں یہ آفس یہ اسٹیٹس جو آپ کا ہے، یہ شان و شوکت جس کے آپ مالک ہیں۔ آپ کی بزنس ایمپائر ہر بڑے شہر میں آپ کے گھر، آپ کی گاڑیوں کے فلیٹس، آپ کا اپنا چھوٹا طیارہ جس میں آپ سفر کرتے ہیں۔ آپ کے ڈھیروں سب آرڈینیٹس۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی آپ آزمائش میں ہیں۔"

اس نے ابرو چڑھا کر سوالیہ انداز میں بلال سلطان کی طرف دیکھا اور تلخی سے ہنس دی۔

"جائیں سر! آپ بھی خوب۔ آپ کے گمان بھی خوب۔" اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، وہ اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اپنا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

پھر خود پر قابو نہ پاتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولی۔

"ارے آزمائش میں تو وہ ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے "جو اتنی عمر ایک ذہنی اذیت کے ساتھ جیتا رہا اور اب کے بعد کی عمر میں شاید جسمانی اذیت بھی سہے گا۔ آئی ایم سوری مجھے کہنا پڑے گا آپ ایک پتھر دل انسان ہیں، ایک پتھر دل باپ، جسے اپنا کلین امیج ہر رشتے سے زیادہ پیارا ہے، چاہے وہ خونی رشتہ ہو یا صرف انسانی۔"

"اوہ!" بلال سلطان اسے حیرت سے یوں روتے ہوئے دیکھتے رہے پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولے "لڑکی! میں نے کہا نا تم ابھی کم عمر ہو اور ناتجربہ کار بھی، یہ بات ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کہ آزمائش کی گھڑی نے دراصل کس کو آن دبوچا ہے۔" انہوں نے اپنے ٹیبل پر رکھا ٹشو پیپر باکس ماہ نور کی طرف بڑھایا۔ ماہ نور ٹشو پیپر نکال کر۔ آنسو پونچھنے لگی۔

"اوہ! بھئی" بلال سلطان کی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر پڑی "میرے پاس تو بہت کم کوالٹی وقت ہوتا ہے لڑکی! تمہاری گفتگو کی وجہ سے میں ایک اہم میٹنگ کینسل کر چکا ہوں، لیکن اب ایک اور میٹنگ کا ٹائم ہونے والا ہے، میرا خیال ہے، اب یہ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچ جانی چاہیے۔ میں نے ابراہیم کو بیس منٹ کا کہا تھا۔ بیس منٹ یعنی بارہ سو سیکنڈز مگر ان گنت سیکنڈز گزر چکے۔"

"بالکل ٹھیک؟" ماہ نور نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی اب یہاں مزید رکنا نہیں چاہتی۔" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ غصے میں تھی۔ اس کو دکھ تھا اور غم بھی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ جسم لرز رہا تھا اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا بیگ اٹھا کر اس کا اسٹریپ کندھے پر ڈالا، آنسوؤں کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ بلال سلطان کو خدا حافظ کہے بغیر تیزی سے مڑی۔

"ایک منٹ!" پیچھے سے بلال سلطان کی آواز آئی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"اگر تم وہ لڑکی ہو جو سعد کی کوئین آف ہارٹ (دل کی شہزادی) ہے تو میرے پاس تمہاری کچھ امانتیں رکھی ہیں۔"

"چھن!" ماہ نور دل میں کچھ اور بھی ٹوٹا اور اس کا زخمی دل رسنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بے بسی سے بلال سلطان کو دیکھا۔ اس کی قوت گویائی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

"نہیں۔" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی "میں وہ لڑکی نہیں ہوں۔ وہ کوئی اور ہے۔" ہزاروں کی تعداد میں ادھر سے اڑتے آتے نیزے اس کے زخمی دل میں آرپار پیوست ہو چکے تھے۔ اسے لگا بلال سلطان دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"غور سے دیکھ لو یک طرفہ عشق میں مبتلا لوگوں کا چہرہ اور حالت میرے جیسی ہوتی ہے۔" اس کی نظروں نے بلال کو پیغام دیا۔ "وہ خوش نصیب جس کا تم پوچھ رہے ہو وہ تو کہیں بلندیوں میں رہتی ہے اور میں تو زمین کی مخلوق ہوں لیکن میں تمہیں کیوں بتاؤں وہ کون ہے۔ وہ عشق جس میں وصل کی راہ میں حائل شخصیت سے حسد اور اس پر رشک شامل نہیں وہ عشق ادھورا ہوتا ہے اس میں نقص ہوتا ہے اور کمی بھی۔"

اس نے دوبارہ دروازے کی طرف رخ موڑا اور اسے کھول کر باہر نکل آئی۔

"او مائی گاڈ ماہ نور! تم کہاں رہ گئی تھیں؟" اس کے انتظار میں بیٹھے ابراہیم نے اس کی شکل نظر آنے پر اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے کہا اور پھر شاید اس کی سرخ ناک اور آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

"خیر تو ہے نا انکل نے تمہیں مارا ہے کیا؟" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ خیر ہے۔" ماہ نور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ ایک بری ملاقات تھی حد سے زیادہ بری۔"

☆ ☆ ☆
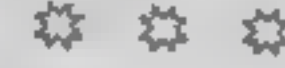
"تمہارے پاس جو گاگلز ہیں ان کے فیچرز زبردست ہیں۔ مجھے بھی ان کو خریدنے کا شوق تھا لیکن یہ بہت مہنگے ہیں میں ان کو خرید نہیں سکتا۔" وودن زادے نے اپنے پاکستانی دوست کے گاگلز باکس کے پیچھے چھپی ان کی خصوصیات پڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا واقعی!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کیا تمہیں معلوم نہیں؟" وودن کو لگا۔ وہ جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم نے دیکھے بغیر انہیں خرید لیا ہو۔"

"شاید تم یقین نہ کرو لیکن ایسا ہی ہے۔" وہ اسی بے نیازی سے بولا جو وودن زادے کو بناوٹ لگ رہی تھی۔

"یہ جو پاوڈر باول جیکٹ اور رد بیکون پینٹس ہیں یہ ڈفی گلوز تورواک سکیز اور سنو بورڈ شوز یہ سب تم نے دیکھے بغیر خریدے ہیں؟" وودن کو اس کی اس بناوٹ پر بے وجہ طیش آنے لگا۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔" وہ اپنی بات پر مصر رہا۔

"تم جانتے ہو یہ ایک نارمل سکی گیئر کی نسبت کتنے زیادہ مہنگے ہیں جو صرف ایک پروفیشنل کا انتخاب ہی ہو سکتے ہیں وہ بھی ایسا پروفیشنل جس کی جیب میں اندھا پیسہ ہو۔" وودن زادے کا موڈ آف ہو گیا۔ اس کی بناوٹ بھری بے نیازی نے اس لڑکے کا تاثر خراب کر دیا تھا۔

"میں ایک پیشہ ور کھلاڑی نہیں ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے یہ سب زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے آرمیڈ کمپنی کو ایک میل لکھی تھی کہ مجھے بہترین سکی گیئر مہیا کر دیں انہوں نے مجھے مختلف گیئرز کی فہرست بھیجی جس میں سے میں نے اس کا انتخاب کر لیا یقین جانو میں نے یہ دیکھنا نہ جانچا کہ ان سب کی خصوصیات کیا ہیں؟"

"اور تم نے ڈالرز میں قیمت چکائی؟" وودن نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں سپاؤنڈز میں۔"

"جو پاؤنڈز تم نے ادا کیے ان کو اپنے ملک کی قابل رقم کرنسی میں تبدیل کر کے دیکھا تھا تم نے؟"

"نہیں۔" اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"مجھے یقین نہیں آیا کہ ایک شخص جو پیشہ ور ڈائیور (Diver) نہیں ہے وہ صرف شوق کی خاطر اتنا پیسہ خرچ کر دے جبکہ اس کا تعلق تیسری دنیا کے ایک غریب ملک سے ہو۔" وودن نے سر ہلایا۔

"تیسری دنیا کے غریب ملک کے ارب پتی تم نے دیکھے ہیں کبھی؟" سعد نے اس سے سوال کیا۔

"پہلے نہیں دیکھے تھے اب دیکھ رہا ہوں۔" وودن نے کہا۔

"اچھی طرح دیکھ لو وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جاہل شوقین انہیں کسی بھی چیز کا کچھ پتا نہیں ہوتا وہ بس پیسہ لٹانا جانتے ہیں میری طرح۔" اس کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری جس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسا کیا کرے جو پیسے سے اس کی جان چھوٹ جائے۔"

"پیسے سے جان چھڑانا چاہتے ہو؟" وودن نے چونک کر دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن جتنی جان چھڑاتا ہوں یہ اتنا ہی اور بڑھ جاتا ہے نفع کے کھاتے میں پہلے سے چوگنا پیسہ آجاتا ہے میں نہیں جانتا اس سے کیسے جان چھڑاؤں۔"

وودن زادے اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص سنکی تھا یا سرپھرا وہ سوچ رہا تھا۔ جس پیسے کو کمانے کی خاطر وہ سارا سال مشین بنا رہتا تھا اسی پیسے کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی خواہش کر رہا تھا۔

"تم خیراتی ادارے کھول لو وہاں خرچ کرو۔" وودن نے تجویز دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا۔" وہ تیزی سے بولا "اور مجھے لگتا ہے کہ ان ہی کی وجہ سے بڑھ رہا ہے اسی لیے تو میں نے تعیش پر فضول کاموں پر خرچ کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ یہ مجھ سے روٹھ جائے۔"

"تم نادان ہو احمق بے وقوف!" وودن بلند آواز میں بولا "تم جانتے ہو کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔"

"تم نہیں جانتے کہ یہ کبھی کبھی کتنا بڑا عذاب بن جاتا ہے۔" وہ اسی تیزی سے بولا۔ "یہ ہی پیسہ لوگوں کو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر لگا دیتا ہے پستول کے نشانے پر لوٹنے لٹوانے لگتا ہے یہ ہی پیسہ ہائی فائی نینس بن کر پوری دنیا میں گردش کرتا قوموں کی تقدیریں بدلنے کے کام آتا ہے غریب قوم کو غریب تر اور امیر کو امیر ترین بنا دیتا ہے۔ یہ ہی پیسہ جو بنتا ہے اور جرم و گناہ کے نجانے کتنے مرکز چلاتا ہے یہ ہی پیسہ عزتیں بکواتا اور خریدتا ہے رشتوں کے احترام گنواتا ہے اور انسانوں کو آدمی بنا دیتا ہے دلوں کے سکون چھینتا ہے اور راتوں کی نیندیں بھی۔"

"تم نے اتنا کمایا ہی کیوں پھر اگر اسے سانپ ہی سمجھتا تھا۔" وودن زادے کو اس کی ہر دلیل پر غصہ آرہا تھا۔

"میں نے نہیں کمایا۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا "یہ خود سے خود آتا گیا جیسے پانی کسی ایک راستے کا انتخاب کر کے اسی طرف بہنے لگتا ہے نا یہ اسی طرح میری طرف بہنے لگا اور بہتا چلا آتا ہے۔ جب تک میں انجان تھا میں نے اس پانی میں خوب ہاتھ دھوئے لیکن جب سے باخبر ہوا ہوں اس کے سوتے سکھانے کی کوشش میں مصروف ہوں مگر وہ سوکھنے کا نام نہیں لیتے ایک سوراخ بند کرتا ہوں دس اور پھوٹتے ہیں۔ تم نہیں جانتے وودن!" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ نہ ہو تو بھی عذاب یہ ہو تو بھی عذاب۔"

وودن زادے کے دل میں سعد سلطان کی بناوٹ بھری بے نیازی پر غصے کا جو ابال اٹھ رہا تھا وہ لمحہ بھر میں بیٹھ گیا۔ یہ لڑکا بناوٹ کا شکار نہیں تھا اس کا مسئلہ یقیناً کچھ اور تھا۔ کچھ ایسا جو خاصا پیچیدہ تھا اور جسے سمجھنے کے لیے وودن کو وقت درکار تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں میں بے وجہ تلخ ہو گیا۔" وودن نے اپنی آواز نیچی رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے بھی اپنا موڈ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری بات کا جواب دیتے ہوئے میرا لہجہ تیز ہوا۔"

"کیا تم کسی وقت مجھے خود سے ملاقات کا موقع دو گے؟" وودن نے پوچھا۔

"یقیناً۔" وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ "بشرطیکہ میں اپنے بارے میں خود جان لوں کہ بات کیا ہے۔"

"میں انتظار کروں گا اور اس وقت تک تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گا۔" وودن بھی مسکرایا۔

"اچھا تو ان گلز کی کیا خصوصیات ہیں، مجھے بھی بتاؤ۔" اس نے وودن سے سوال کیا اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

"ان میں ایچ ڈی کیمرہ اور میوزک سسٹم موجود ہے ایک سو ستر ڈگری کا زاویہ بنا سکتا ہے یہ کیمرہ اور اوکلے کمپنی کے دستیاب گلز میں سے یہ گلز سب سے قیمتی ہیں، اتنے قیمتی کہ ایک عام پیشہ ور سکی ڈائیور ان کا صرف خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔" وودن زادے نے کہا۔

"یہ تم رکھ لو وودن! اور مجھے اپنے والے دے دو۔" اس کے پاکستانی دوست نے انتہائی سادگی سے کہا۔

"کیا؟" وودن اپنی جگہ سے زیادہ نہیں تو ایک فٹ تو ضرور اچھلا ہو گا۔

"ہاں!" وہ نرمی سے بولا "میں تو ایک اناڑی سا بندہ ہوں، مجھے سکی ڈائیونگ کی الف ب بھی ابھی سیکھنی ہے، اس بار یہاں چلا آیا ہوں، اگلی بار شاید مجھے اس کا خیال بھی نہ آئے، یہ سب سامان بے کار جائے گا۔ یہ تم رکھ لو تم تو ایک شوقین سکی ڈائیور ہو، یہ تمہارا شوق ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا، تم ہر سال کہیں نہ کہیں اسے پورا کرنے کے لیے جاتے رہو گے، یہ تمہارے کام آئے گا اسے تم رکھ لو۔"

وودن زادے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سامنے نظر جماتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں گے، پہلے تم کل کی تیاری کر لو، تم نے لفٹ کے ٹکٹس سنبھال رکھے ہیں نا!"

"ہاں!" اس کا پاکستانی دوست اس کے یوں موضوع بدل دینے پر مسکرا کر بولا تھا۔

"کل میں پہلی بار سکی ڈائیونگ کے لیے جاؤں گا۔"

"اللہ تمہارا حامی ہو" وودن نے اسے دعا دی اور دونوں ہنسنے لگے۔

"میں نے حل سوچ لیا ہے اس مولوانوں کے لمڈے کے مسئلے کا۔"

"ارے واہ! مولا خوش رکھے، مجھے معلوم تھا جتنی سیانی تم ہو کوئی نہ کوئی حل ضرور ہی سوچ لو گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر"

"مگر کیا؟ ارے بولو بھی۔ منہ لٹکا کر چپ کیوں ہو گئیں۔"

"مگر"

"اب بول بھی دو، اتنی لمبی سوچ میں کیوں پڑ گئیں۔"

"مگر یہ کہ اس حل پر عمل نہیں ہو سکتا تمہاری مرضی کے بغیر۔"

"ہیں میری مرضی کے بغیر، ارے بی بی! میری مرضی اتنی اہم کب سے ہو گئی کہ اس کے بغیر کوئی کام رک جائے ہوتے ہوتے۔"

"ہاں، واقعی ویسے تو ایسا کوئی کام نہیں ہے دنیا میں، مگر یہ کام ایسا ہی ہے، جو تمہاری مرضی ہو تو یوں ہو جائے چٹکی بجاتے میں اور جو ہو جائے تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں اور جو تمہاری مرضی شامل نہ ہو تو پھر بہت سے مسئلے نئے سرے سے آ کر ناچنے لگیں گے۔"

"خیر ناچنے نچانے کا کام تو آج تک ہم نے کیا ہے نہ کرایا ہے، نہ آئندہ ہونے دیں گے، چاہے وہ اللہ مارا طیفا مر کٹنے ہی الزام کیوں نہ دھرتا پھرے ہم پر۔ تم یہ بتاؤ ایسا کیا ہے جس میں مجھ کمین ذات کی مرضی درکار ہے۔"

"بتا دوں، لیکن پہلے وعدہ کرو میراثیوں والی گالیاں نہیں دو گی۔"

"اچھا تو گالیوں والی بات ہے، نہیں بی بی، تمہیں گالیاں دینے کا بوجھ یہ زبان نہیں سہار سکتی۔"

"دے بھی لو گی تو کیا فرق پڑے گا، تمہاری گالیاں بھی پھول بن کر لگیں گی۔"

"ارے مولا بھاگ لگائے رکھے سدا تمہیں اور تمہارے دولہا کو۔ تم اب بتا بھی دو مسئلے کا حل۔ ادھر وہ حبشی سانڈ، ٹین ڈبہ سنبھالے جانے کو تیار کھڑا ہے، آج کی رات تو مشکل ہی ہے نکالے یہاں۔"

"چپ کرو بے ادب! خبردار جو ایسے برے برے ناموں سے پکارا، کیوں بھول جاتی ہو کہ اس کے سینے میں قرآن محفوظ ہے، مجھ سے تم سے کہیں زیادہ باعمل مسلمان ہے وہ۔"

"ہائے! میں بھول گئی تھی۔"

"کوئی فائدہ نہیں اب کلے پیٹنے کا، توبہ کرو توبہ اور منہ سے دوبارہ ایسی بات یوں بھی نہ نکالنا اور ووں بھی نہ نکالنا۔"

"ووں کیا مطلب؟"

"مطلب یہ میری عزیز از جان سہیلی! کہ میں نے سوچا ہے شام سے ادھر ادھر تمہارا نکاح مولوانوں کے اس لمڈے سراج سرفراز سے پڑھوا دیا جائے۔ اس سے میں نے صلاح لے لی ہے۔ وہ تو راضی ہے مگر تم۔ ہائیں ارے تم یہ کھڑے قد سے گر سی کیوں گئیں۔"

"ہائے ہائے، تمہاری زبان ذرا سی بھی نہ لڑکھڑائی یہ بات کرتے ہوئے، شاباش ہے تمہاری عقل کو، سلام تمہاری سوجھ بوجھ کو۔ مولا کرم کرے تمہاری تدبیروں پر۔ اے بی بی، مجھے جیتے جی دھکا کیوں نہیں دے دیتیں ماسی صغراں کے تندور میں۔ وہ بھلی بات ہو گی۔ میں سی کیے بغیر چپ چاپ سہ جاؤں گی مگر ان دیہاڑے یہ ظلم، ارے کیسی سہیلی ہو جو ایسی منحوس بات دھڑلے سے کہہ گئیں۔"

"دیکھا۔ لگیں نا فوراً ہانپنے اور چابک بھی الٹا کوچبان پر چلانے لگیں اگر تو مصلحت کے معنی سمجھتی ہو تو جانو وہ اسی بات میں چھپی ہوئی ہے اور بات یہ بتاؤ کہ انسانوں کو اچھا برا، منحوس مارا کم بخت، شہزادہ اور من کا راجہ بنانے کا اختیار ہمارے تمہارے پاس کہاں سے آگیا۔"

"کیوں کیا ہم انسان نہیں ہیں، ہمارے اچھے برے کا کوئی معیار نہیں، ظالم ہو تم جو خود تو ایک خوبرو شہزادے کی بیوی بن بیٹھیں اور میرے لیے انتخاب کیا وہ حبشی سانڈ میں خوب سمجھتی ہوں ذات اور خاندان کا گھمنڈ آج بھی تمہارے اندر سے نہیں نکلا، مجھے سمجھا ناں وہی ذات کی میراثن اور نیچ خاندان کی اولاد۔"

"استغفار پڑھو، لاحول پڑھو، شیطان تمہارے کندھے پر سوار بیٹھا نظر آ رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ تمہیں میری تجویز پسند نہیں آئی نہ سہی مگر ایک بات سوچ کر رکھو۔ میں اور تم نہیں جانتے کہ سراج سرفراز کس خاندان کا چشم و چراغ ہے، لیکن جو آج تک اس نے ہمارے لیے کیا ہے، محلے والوں کی گالیاں سنیں اور اپنا تمسخر اڑوایا ہے، جیسے اس روز وہ طیفے لاٹر کے سامنے سینہ سپر ہوا، بڑے بڑے خاندانی لوگ کسی کے لیے اس طرح ڈھال بننے سے گھبراتے ہیں۔ اب بیٹھی سوچ کیا رہی ہو۔ جاؤ جا کر سراج سرفراز سے کہہ دو، اپنا بوریا بستر باندھے اور چلا جائے جہاں کو قدم اٹھتے ہیں۔"

"جاؤ، اب اٹھتی کیوں نہیں۔"

"اور جو آج ہی اس کے یہاں سے چلے جانے کی خبر لے کر رات کو طیفا لالا ئز پھر گھس آیا تو؟"

"تو گھس آنے دو، جو ہو گی دیکھی جائے گی، چھریوں اور خنجروں کے سائے میں بیٹھے ہیں انجام خدا جانے۔"

"نہیں جائے گا سراج سرفراز یہاں سے میں نے کہہ دیا۔"

"کیسے نہیں جائے گا، وہ کہہ چکا ہے ہماری خاطر جان لٹا سکتا ہے، مگر اس کے یہاں رہنے سے محلے بھر میں ہمارے لیے بھی تھو تھو ہے، لوگ پہلے ہی باتیں بنانے میں کم تھے کیا کہ یہاں سے سرشام ساز اور آواز کا شور اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ جو ایک ہٹے کٹے جوان مرد نامحرم نے یہاں مستقل ڈیرے ڈال لیے، ابھی تو کئی میرے اور منے کے ابا کے نکاح کو بھی نہیں مانتے۔ دل چاہتا ہے اپنے ہی کیسے سے سر ٹکرا کر مر جاؤں۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے، شہر میں جہاں کوئی ذی روح آنکھ اٹھا کر میرے خاندان کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسی شہر میں ہر انگلی اپنی طرف اٹھی محسوس ہوتی ہے۔ عزت کی چادر اوڑھ لینے کو نکاح کیا تھا، اس کے بچے کی ماں بھی بن گئی عزت کی چادر سر پر تننے کے بجائے تار تار ہوئی جاتی ہے۔"

"تو اس میں کس کا قصور ہے، اس کا ناں جو تمہیں عزت کی چادر اوڑھانے کے بجائے پیسہ کمانے کے میدان میں قدم جمانے میں ساری توانائی خرچ کر رہا ہے، کب سے بہلاوے دے رہا ہے کہ بس چند دن اور گزر جائیں ہم لوگوں کو اس محلے سے شفٹ کراتا ہوں نہ وہ چند دن گزرتے ہیں نہ ہماری اس محلے سے جان چھوٹتی ہے۔ کیا اس کو نہیں معلوم کہ ہمارے دن، رات کس خوف کے سائے میں گزر رہے ہیں میرا نہیں، تمہارا نہیں تو اپنے بچے کا احساس کر کے ہی اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں۔"

"اس کی نیت پر مجھے کوئی شک نہیں ہے، تمہیں سب پتا ہے۔ وہ کیسے صفر سے سفر شروع کر کے یہاں تک پہنچا ہے کہ ہم کچھ نہیں کرتے اور ہمارے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا بندوبست کر جاتا ہے، خود بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھاتا سفر کرتا ہے مگر ہمیں سواری کے لیے پرانی ہی سہی گاڑی لے کے دے رکھی ہے، اسے معلوم ہے خوب معلوم ہے طیفا لالا ئز کیسے چھریاں لہراتا پھرتا ہے مگر یہاں سے شفٹ کرنے کے لیے اس شہر میں کوئی نیا محلہ نیا مکان ڈھونڈ لینے سے طیفا ہماری جان نہیں چھوڑے گا، وہ اپنی چھریاں لہراتا وہاں بھی پہنچ جائے گا، ہم سے پہلے اس کے گلے پر چھری پھیرے گا، آخر اس کا رقیب روسیاہ وہی تو ہے۔"

"کر لو اس کی وکالتیں، تمہارا حق بنتا ہے، ہائے ہمارے مقدر، جان چھڑانا چاہتے ہیں پر چھوٹتی نہیں۔"

"اچھا پھر جاؤ اس بے چارے سراج کی جان کی تو خلاصی کراؤ وہ خوامخواہ اس چوکھی میں آن پھنسا ہے۔ نہ اسے ساز و آواز سے کوئی لینا دینا تھا نہ حسن و نزاکت سے، وہ بے چارہ دو وقت کی روٹی لینے اور کھانے کی شرم میں جان پھنسا بیٹھا، نمک حلالی بہتری کر لی اس نے۔ اس سے کہہ دو کہ جہاں پناہ ملتی ہے لے جا کر توبہ ہے کیسی زمین پکڑ کر بیٹھ گئی ہو، جاتی کیوں نہیں۔"

"نہیں جا رہی میں اسے بھیجنے کو یہاں سے۔ کیسے بھیج دوں نام کا یہ آسرا بھی نہ رہا تو کریں گی کیا ہم دو نہتی عورتیں۔"

"ڈرتی ہو؟"

"ہاں ڈرتی ہوں، کیسے نہ ڈروں چمچماتی چھریاں تمہاری طرف بڑھتے دیکھ چکی ہوں خود اپنی آنکھوں سے، میرا تو کم بخت گلا گھونٹنے کو ہی تھا۔"

"ایسا کرو۔ سراج کو تو بھیجو ہی بھیجو، خود بھی خوف اور موت کے ان سایوں سے دور بھاگ جاؤ، تمہارا اپنا پیشہ تمہارے لیے دو وقت کی روٹی کمانے کو کافی ہے، تمہارے وہ چھینٹ کے لباس اور انگلیوں کے چھلے، ناک کا بلاق اور چٹیا کے چھن چھناتے پراندے سنبھالے پڑے ہیں نا، چھتی پر ان سے دوبارہ دوستی کر لو پتنگ کی گڈی البتہ میں

تمہیں نئی لے دیتی ہوں، بجاتی پھرنا گاتی پھرنا، روپیہ دو روپیہ، آٹھ آنے چار آنے، شام تک اچھی خاصی دولت جمع ہو جایا کرے گی رہنے کو سڑک کنارے بنی بستیوں میں جگہ مل ہی جائے گی، تمہارا مستقبل روشن ہے، جاؤ اسے ہاتھ میں لے لو، مجھ کرموں جلی کو اپنی کرنیوں کے بھوتوں کا سامنا کرنے کے لیے ادھر اکیلی پڑی رہنے دو، جو چھری میرے نصیب ہے میری ہی گردن پر پھرے، ہم اور سراج مفت میں کیوں مارے جاؤ۔"

"اُف! اب روتی کیوں ہو، جو سب سے آسان حل ہے وہ بتا تو دیا تمہیں۔"

"تم نے میرے منہ پر جو طمانچہ مارا ہے، اسے کھا کر روؤں بھی نہیں اب، پل بھر میں مجھے اپنی اوقات اور وہ رات یاد آ گئی جب اپنی عزت بچانے کو تمہاری چھت پر کودی تھی بھولے سے، اس وقت میری اوقات کیا تھی بھلا۔ ایک اٹھارہ انیس سال کی جاہل گنوار گڈی بجانے والی میراثن جو اپنے باپ، ماں اور بھائیوں کے ساتھ محلہ محلہ شادی بیاہ، کھیل تماشوں، میلوں ٹھیلوں میں گنواروں والے گیت گاتی بجاتی، اونچے شملے والوں کو اور دھندے کے فقیروں کو ایک برابر سمجھتی۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی پھرتی تھی کہ سب کو شالا سدا جیویں، بھاگ لگے رہیں، مولا خوش رکھے، اونچی پگڑی اور بھی اونچی ہو جائے، اونچے چوباروں کو بھاگ لگے رہیں کے نعرے مارتی، جنج کی روٹی اور ولیمہ کی دعوت کے کھانوں سے اپنے ٹبر کا پیٹ بھرنے کو چاولوں، روٹیوں اور گوشت کی بوٹیوں سے اپنے کٹورے، کنے بھرتی بھرتی۔ ایک عیار بدمعاش کے زیادہ پیسے دینے کے لالچ میں آ کر ٹبر خاندان، برادری چھوڑ اس کی انگلی سے لگی اس کے ساتھ آ گئی۔ اس کے ہاتھوں اپنی عزت پر ہاتھ پڑنے پر اس کو جل دے کر نکل تو بھاگی مگر جاتی تو جاتی کہاں، شہر نیا، علاقہ نیا، محلہ اجنبی، چھت کے ساتھ چھت، دیوار کے ساتھ دیوار ملی ہوئی، نہ راستہ سوجھے نہ ہی کوئی جائے اماں، جو چھت پھلانگوں تو پراندے کے گھنگھرو اور کانوں کی ان گنت مُرکیاں بج اٹھیں، لوگ باگ شش شش کرتے پیچھے بھاگنے کو تیار، پھولے سانس اور بے ہمت جسم کے ساتھ جو تمہاری چھت پر کودی تو پھر اٹھ نہ سکی۔

ہائے میری بہن کیسے تم نے دھول مٹی میں اٹے میرے وجود کو اٹھا کر اپنے صاف ستھرے پلنگ پر ڈالا تھا۔ کیسا میرا منہ کھول کھول کے چمچوں سے میرے حلق میں پانی ٹپکایا تھا۔ میں تھی یا وہ ادھ مری بلبل جسے ہم دونوں نے ایک بار مرتے سے بچایا تھا۔ تمہارا حسن سلوک، تمہارے موہنی صورت، تمہاری محبت، توجہ، شائستگی، عقل، سلیقے سبھاؤ، تمہاری لوچ دار آواز نے کیسا جکڑا مجھے، جو میں تم سے کہہ بیٹھی "بی بی اب میں یہاں سے جانے کی نہیں، مجھے اپنے ساتھ ہی رکھ لو۔" اور تم کیسی محبت کی پکی تھیں جو مجھے تم نے منع نہیں کیا بلکہ مسکرا کر بولیں "میں تو اصول کے معاملے میں بڑی سخت ہوں اور تم ٹھہریں آزاد فضاؤں میں رہنے والی میرا تمہارا نباہ کیوں کر ہو گا۔" "ہائے میری بی بی، اس دن دل میں فیصلہ کر لیا تھا جیسے تم نے میری جان بچائی ویسے ہی تم پر جان نہ لٹا دی تو ناچے میراثی کی آل میں سے نہیں۔"

"بس کرو بس، دیکھو اب تو ہچکی بندھنے لگی ہے تمہاری۔"

"ہائے نہ بی بی! آج نہ روکو مجھے، مجھے اپنی اوقات بھول چلی تھی اسے یاد کر لینے دو آج یاد کرنے دو وہ دن جو تم نے مجھ گنوارن، جاہل، منہ پھٹ، بے سلیقہ، بدتمیز کو انسان بنانے میں گزارے، میں جو خود کو مسلمان کہتی تھی صرف نام ہی کی تو مسلمان تھی، کلمہ تک تو آتا نہیں تھا مجھے۔ کیسے تم نے مجھے لفظ لفظ سکھا کر آگے بڑھایا، قرآن پڑھایا، نماز سکھائی، ہاتھوں پیروں اور سر سے میل چھٹا کر صاف ستھرا رہنا سکھایا، میں اجڈ، جاہل گنوار جو میرے تیرے کے تھالوں سے جھپٹ کر کھانے کی عادی تھی، چولہا چوکا، باورچی خانہ، کھانا پکانا، جس کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ تم نے مجھے مسالے پیاز کی الف بے سے لے کر کیسے کیسے نوابی کھانے بنانے تک سکھا ڈالے۔ ہائے میں کم ظرف کیوں اپنی اوقات بھول گئی، میرے دماغ میں علم گھس گیا اور میرے معدے کو گھی کی تری کیا لگی

میں بھول گئی کہ میں نے تو خود جانور سے انسان بننے کا سفر تمہارے ساتھ چلتے چلتے تمہاری انگلی پکڑ کر طے کیا تھا۔ میں کیوں فلاں کو برا اور ڈھمکاں کو بھی ذلیل سمجھنے لگی۔ ہائے بی بی! میں کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتی ہوں اور تمہارے سامنے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں لو مجھے معاف کردو اور میرے حق میں دعا کرو کہ اپنی اوقات بھول جانے کا خمار میرے آگے نہ آجائے۔"

"اچھا اچھا بس کرو اب دیکھو تمہاری آواز بھی بیٹھنے لگی ہے' مت چلا چلا کر روؤ۔ اب چپ کر جاؤ۔"

"ہائے! میں کیسی بدنصیب ہوں جان لٹانے کا عہد کر کے بھول گئی تھی بی بی! ایسا کرو چھرا پکڑو اور میرے سینے میں اتار دو۔ ایسی احسان فراموشی کی سزا یہ ہی ہونی چاہیے۔ میں سی بھی نہ کروں گی۔"

"بس کرو۔ میں نے کہا نا بس کردو' اوقات یوں یاد آگئی تمہیں کہ بین بھی میراثیوں کی طرح شروع کر دیے۔ خبردار جواب آواز آئی مجھے تمہاری۔"

"بس بی بی! مجھے معاف کردو' تم دل سے معاف کردو' کہہ دو تم نے مجھے معاف کیا۔ تم معاف کرو گی ہی تو اللہ بھی مجھے معاف کردے گا۔"

"ہاں اللہ تمہیں معاف کرے۔"

"اور جو تمہاری اور میرے لاڈلے منے کی سلامتی اس میں ہے تو بلاؤ نکاح خواں کو اور پڑھاؤ نکاح میرا سراج سرفراز کے ساتھ۔ یہ ہی میری اوقات ہے۔ بی بی! یہ ہی میری اوقات ہے۔"

"نہیں' جو تمہارے دل کو قبول نہیں اسے میں تم پر کیسے مسلط کر سکتی ہوں۔"

"تمہیں منے اور اس کے ابا کی جان کی قسم ہے میری بہن! منع نہ کرنا اب۔ یہ نکاح آج ہی ہونا چاہیے' یہ آج ہی ہوگا' تمہیں جانے دوں کل سراج سرفراز کو کہیں۔ زمانہ اسے نامحرم کہتا ہے ناتو آج اندھیرا ہونے سے ادھر ادھر ہی وہ محرم بن جائے گا۔ پھر دیکھتی ہوں کون اس کی داڑھی اور ہمارا چونڈا پکڑ کر ٹھٹھا لگا سکے گا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے بی بی لو میں تمہارے پیروں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔ نکاح پڑھوا دو مولوی کو بلا کر۔"

"اچھا اچھا۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں' مجھے مزید سوچ لینے دو۔"

"سوچنا وچنا کیا ہے اب بی بی! بس میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو' یہ ہے کدھر سراج سرفراز' ارے میں دیکھتی ہوں' کہیں چپکے سے نکل نہ لے کم بخت۔ ہائے میرا مطلب ہے کرموں والا۔"

"پاگل ہو تم بھی رابعہ بی بی! بالکل پاگل۔ زبان پر قابو پانا سیکھ لو اب تو۔"

☼ ☼ ☼

اس نے تیزی سے نظریں دائیں بائیں گھمائیں۔ اس کا ذہن ایک ہی نقطے پر الجھا ہوا تھا اور تیزی سے نظریں دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ اسی ایک نقطے کے مختلف پہلوؤں پر سوچ رہی تھی۔ بلال سلطان کے ساتھ اس کی ملاقات کوئی مثبت نتیجہ برآمد کرانے میں ناکام رہی تھی۔ اسے اس شخص کا جو سعد سلطان کا باپ تھا ہر انداز مبہم اور غیر واضح لگا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ شخص دنیا بھر میں کسی دوسرے شخص سے نہیں خود اپنے آپ سے خوف زدہ تھا اور اس خوف کو دنیا کی نظروں میں آنے سے بچانے کی خاطر اور خود کو ایک مضبوط انسان ثابت کرنے کے لیے اس نے بے نیازی' خود پسندی' اکھڑ پن اور سرد مہری کا خول پہن رکھا تھا۔ اس خول کے پار کوئی اسے دیکھ سکتا تھا نہ ہی اس خول کے باہر اس سے کوئی لڑ سکتا تھا۔

اس کا خیال تھا آپا رابعہ والی خبر سن کر وہ چونک جائیں گے' گھبراہٹ کا مظاہرہ کریں گے یا اشتیاق ظاہر کریں گے لیکن جس پرسکون انداز میں انہوں نے وہ ساری بات سنی تھی اور پھر مزید جاننے کے لیے سوال کرتے رہے

تھے لیکن نہ تو ان کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سب ان کے لیے نیا تھا نہ ہی یہ کہ وہ سن کر پریشان ہوئے تھے اور کیسے سب سن کر انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ آپا رابعہ کی بتائی باتیں حقائق کی مسخ شدہ تصویریں تھیں۔

"ہونہہ!" ماہ نور نے تلخ ہوتے ہوئے سر جھٹکا جیسے میں ان پر تو یقین کرلوں گی۔ اور ان کے دلائل تو دیکھو ذرا' اگر بات کا پتا چل جاتا تو اور لوگوں کی طرح سعد بھی خون کی لکیر کے پیچھے چلتا اپنے ہی گھر تک آپہنچتا۔ اف کیسی الجھی ہوئی اور پیچیدہ باتوں کے درمیان پھنس گئی ہوں میں۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں "نہ اختر سے کوئی سراغ ملا نہ ہی بلال سلطان سے۔" اس پر مایوسی چھانے لگی اختر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دینے کی بات کی اور بلال سلطان اس کا پیچھا نہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ پتا نہیں کیسے باپ ہیں' جوان کو اپنے بیٹے کی خواری ستاتی ہے نہ ذہنی انتشار کا خیال آتا ہے' ایک میں ہوں کہ۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

"مجھے شاید پتا بھی نہیں چلتا کب دن ہوا' کب رات ہوئی ہر وقت آکٹوپس کی طرح تمہارا خیال میرے ذہن کو' میرے دل کو اور میری آنکھوں کو جکڑے رہتا ہے نہ اور کچھ سوچا جاتا ہے نہ محسوس کیا جاتا ہے نہ ہی دیکھا جاتا ہے۔" اس نے تصور میں بیٹھی سعد کی شبیہہ کو مخاطب کیا۔ "میں تمہارے پیچھے تمہارے شہر میں آئی اور تم شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب بتاؤ' اس سے آگے کہاں جاؤں جو تم مل جاؤ۔" اس نے اس شبیہہ سے سوال کیا۔

"شاید اس دل کے پاس جس میں' میں رہتا ہوں۔" تصور میں بیٹھی شبیہہ نے جیسے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ دل' جس میں تم رہتے ہو۔" اس نے زیر لب دہرایا "وہ دل تو میرا ہے' جس میں تم رہتے ہو۔"

"ارے نہیں۔" وہ شبیہہ مسکرائی۔ "تم نے تو زبردستی مجھے اپنے دل کا مکین بنا رکھا ہے۔ میں اس دل کی بات کر رہا ہوں' جس میں' میں اپنی مرضی سے رہتا ہوں۔"

"اپنی مرضی سے۔" ایک ازلی اور ابدی منحوس حقیقت نے اس کے ذہن پر دستک دی۔

"اوہ۔" اس شبیہہ کے عقب سے جھانکتی ایک اور شبیہہ کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے الفاظ نکلے "ہاں تمہیں تو میں بھول ہی گئی تھی اختر اور بلال سلطان کے علاوہ تم بھی تو ہو جسے علم ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں چلا گیا اور کیوں چلا گیا۔"

"تم مجھے بھول گئی تھیں ماہ نور؟" وہ نئی شبیہہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "نہیں تم مجھے بھول نہیں سکتیں۔ ہاں بھلانے کی' نظر انداز کرنے کی' ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش ضرور کرتی ہو لیکن دیکھ لو۔ میں ہوں' ہمیں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور رہوں گی' اس سے کتنی قریب اس سے کتنی مانوس۔" وہ ماہ نور کے دل میں بسی شبیہہ کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" ماہ نور نے شکست خوردگی کے ساتھ سر نہوڑاتے ہوئے تسلیم کیا "تم ہو اور واقعی ہو۔ میں ہی احمق ہوں جو تمہاری موجودگی کو جھٹلانے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"ابراہیم! کیا تم مجھے اس لڑکی سے بھی ملوا سکتے ہو جس کا نام سارہ ہے۔" اس شام ماہ نور نے ابراہیم سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اُفوہ ماہ نور!" جواب میں ابراہیم جھنجلا کر بولا تھا "یار! یہ تو وہ ہی لوگ ہیں جن کے پاس میں خوار ہوتا رہا اور مجھے کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اختر اور انکل کے بعد تم سارہ سے مل کر بھی اسی طرح مایوس ہو گی۔"

"جہاں اتنی مایوسیاں مل گئیں وہاں ایک یہ بھی سہی' سارہ سے ملنے کے بعد میرا خیال ہے کہ میں لاہور واپس چلی جاؤں گی۔"

"بس! ہمت ہار گئیں؟" ابراہیم نے کہا۔

"ہارنے کے لیے میرے پاس تھا کیا جو ہاروں گی ابراہیم! مجھے تو واپس جا کر اپنا سمسٹر جوائن کرنا ہے۔"

"چلو ایسا ہے کہ اس ویک اینڈ پر میں تمہیں لے جا سکتا ہوں سارہ کے پاس' اس سے پہلے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" ابراہیم نے کہا۔

"ٹھیک ہے' ویک اینڈ کون سا دور ہے' دو ہی تو دن ہیں درمیان میں۔" ماہ نور نے فون بند کرنے سے پہلے جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو یہاں دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے' لیکن ایک عجیب سی حیرت کا احساس بھی ہے۔" چوہدری سردار نے اپنے سامنے بیٹھی مہمان سے کہا۔

"جب ہی آپ حیرت سے کھلا منہ بند کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔" مہمان نے ان پر چوٹ کی۔

"شاید!" چوہدری سردار محظوظ ہوئے تھے۔

"برائے مہربانی آپ منہ بند کر لیں کیونکہ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے' اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔" مہمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"سنجیدہ ہو جانے پر تو اس کے چہرے پر پڑی عمر کی لکیریں واضح ہونے لگتی ہیں' اسے چاہیے یوں سنجیدگی خود پر طاری نہ کیا کرے۔" چوہدری سردار نے دل میں سوچا۔

"جی جی میں ہمہ تن گوش ہوں۔" انہوں نے بھی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ یقیناً مجھے پہچان تو چکے ہوں گے۔" انہوں نے چوہدری سردار کی طرف دیکھا "اور شاید آپ کو یاد آگیا ہو کہ آپ کے پاس میری ایک امانت موجود ہے۔"

"امانت؟" چوہدری صاحب نے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں دیکھا۔ "آپ نے میرے پاس کوئی امانت رکھوائی تھی کیا؟"

"میں نے نہیں رکھوائی تھی۔ آپ خود ہی اٹھا لائے تھے۔" وہ ایسے بولیں جیسے انہیں جتا رہی ہوں' دیکھا تم نے کتنا غلط کام کیا تھا۔

"جو میں خود اٹھا لایا تھا' وہ امانت تو نہیں کہلائی جا سکتی۔"

"چوری تو کہلائی جا سکتی ہے۔" وہ ترچھی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں ضرور' لیکن چوری کا کوئی پرچہ کٹا کیا' کوئی ایف آئی آر' کوئی مدعی' کوئی گواہ؟"

"آپ جانتے ہیں میں کس قسم کی چوری کی بات کر رہی ہوں چوہدری صاحب۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولیں۔

"میرے پاس چوری کا کوئی ثبوت ہے نہ اغوا کا' نہ ہی امانت میں خیانت کا' میرے پاس صرف ایک بات ہے' ایک سوال!" انہوں نے ابرو چڑھاتے ہوئے چوہدری سردار کی طرف دیکھا "ایک ایسی بات جو صرف آپ سمجھ سکتے ہیں' ایک ایسا سوال جس کا جواب صرف آپ کے پاس ہے۔"

"آپ جانتی ہیں بیگم صاحبہ! میں ایک سیدھا سادہ دیہاتی سا آدمی ہوں' میری سمجھ ہلکی اور سوچ چھوٹی ہے' آپ بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں میری سمجھ میں اسی وقت آ سکتی ہیں جب آپ انہیں میرے قد کے مطابق

سلیس کر کے بیان کریں۔ میری بات آپ سے مختلف ہے' میرا جواب آپ کا من پسند نہ ہوا تو آپ کیا کریں گی؟"

"آپ کچھ بھی نہیں' صرف میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" خاتون اشتعال میں آتے ہوئے بولیں "آپ کو سب معلوم ہے اور آپ کو سب یاد بھی ہے' لیکن یہ جو آپ سلیس کر کے سنانے کو کہہ رہے ہیں تو لیں۔ میں آپ کا یہ شوق بھی پورا کیے دیتی ہوں۔" انہوں نے پہلو بدلا۔

"آپ کو میرے ساتھ ہونے والی وہ ملاقات تو یاد ہی ہو گی جو اظہر نوریز کے گھر پر ڈنر کے موقع پر ہوئی تھی آج سے تقریباً" پچیس سال پہلے۔"

"اسی ملاقات کی وجہ سے تو آپ مجھے یاد ہیں۔" چوہدری صاحب مسکرائے۔ "یقین کیجیے' اتنے سالوں کے لمبے عرصے نے اپنے بہت ہی کم نشان آپ پر چھوڑے ہیں' بخدا میں نے آپ کو اسی لیے تو ایک نظر میں پہچان لیا۔"

"اظہر نوریز کے گھر پر میری پینٹنگز رکھی تھیں۔ کچھ مکمل' چند ادھوری۔" مہمان نے کمرے کی دیوار پر لگی پینٹنگز کی قطار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں خوب یاد دلایا۔" چوہدری سردار نے یوں تاثر دیا جیسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو "آپ کا تعارف یہ ہوا تھا کہ آپ ایک مصورہ تھیں' جو نامور ہونے جا رہی تھیں۔ کیا بھلا سا نام تھا آپ کا۔" انہوں نے مہمان کی طرف دیکھا "معاف کیجیے گا بڑھتی عمر نے حافظے کے چند خانے مکمل طور پر ہی بند کر دیے ہیں۔"

جواب میں مہمان نے چوہدری سردار کو یوں دیکھا جیسے ان کی بات پر انہیں بالکل یقین نہ آیا ہو۔ وہ جزبز ہوتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھیں اور آہستہ قدموں سے چلتی پینٹنگز سے سجی دیوار کے قریب پہنچیں اور پینٹنگز پر نظر ڈالتے ہوئے ایک پینٹنگ کے قریب رک گئیں۔

"سیدھے سادے دیہاتی چوہدری صاحب!" انہوں نے اس پینٹنگ کے سامنے کھڑے ہو کر چوہدری سردار کو مخاطب کیا "اظہر نوریز کے گھر سے آپ نے میری یہ ادھوری پینٹنگ بغیر اجازت کے اٹھائی' یہ تو آپ کو یقیناً" یاد ہو گا۔"

چوہدری صاحب نے جیب سے چشمہ نکال کر پینٹنگ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا' اب بھی ان کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"چلیں' اس بات پر بحث نہیں کرتے کہ بغیر اجازت کیوں اٹھائی۔" انہوں نے پینٹنگ کے سامنے کھڑے کھڑے بازو کمر کے پیچھے لے جا کر قینچی کی شکل میں دیوار سے ٹکائے اور اپنی کمر ان کے ساتھ ٹکاتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ سوال ضرور کروں گی کہ صرف یہ پینٹنگ ہی کیوں اٹھائی اور اس وقت سے لے کر اب تک جب بھی آپ نے اس کو دیکھا ہو گا' اس پر موجود میرے دستخط تو آپ کو نظر آئے ہی ہوں گے' پھر بھی آپ پوچھتے ہیں کہ میرا نام کیا ہے؟"

"آپ تو خاصی جینئس ہیں بیگم صاحبہ!" چوہدری سردار نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

"ادھوری پینٹنگ کے یہاں تک پہنچ جانے کی سن گن لیتے پچیس سال لگا دیے آپ نے' اتنے عرصے بعد آپ اگر اس کی چوری کا پرچہ کٹوائیں گی بھی تو نہیں کٹ پائے گا۔"

"مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ!" مہمان نے کمر کے پیچھے سے بازو نکال کر سینے پر باندھتے ہوئے کہا اور اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکا لیا "اب بتائیے میرا نام کیا ہے؟"

"واہ!" چوہدری سردار نے کہا۔ "یہ تو وہی لطیفہ ہو گیا کہ بلو کے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں جبکہ پپو کی ایک بہن اور ایک بھائی ہے' اب بتائیے میری عمر کیا ہے؟"

"اگر آپ میرا حوصلہ آزما رہے ہیں تو شوق سے آزمائیے' میں بہت ڈھیٹ ہوں' آپ نہیں جانتے۔"

"پتا نہیں آپ ایک دم ایک کرخت اور سخت گیر استانی کا سا رویہ کیوں اختیار کر رہی ہیں۔ برائے مہربانی تشریف رکھیے اور پہیلیاں بجھوانے کے بجائے سیدھی سیدھی بات کیجئے تاکہ اگر میں آپ کے کام آسکتا ہوں تو بصد شوق آسکوں۔" چوہدری سردار کو اچانک احساس ہوا کہ وہ حق میزبانی میں کوتاہی کرتے ہوئے مہمان کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔

"میں بہت لمبا سفر کر کے آپ تک پہنچی ہوں چوہدری صاحب! میری بات کو سمجھیں اور میرے سوال کا جواب دے دیں' آپ کے پاس میری ایک امانت ہے' میں اس کی خاطر یہاں آئی ہوں۔" وہ چوہدری صاحب کے تشریف رکھنے کی پیشکش پر غور کیے بغیر بولیں۔

"کیا آپ نے کسی امانت کے سلسلے میں لکھا پڑھی کر رکھی تھی میرے ساتھ۔" چوہدری صاحب نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنی وہ فون کال بھی یاد ہوگی جس میں آپ نے۔۔۔" وہ بلند آواز میں بولیں۔

"اور آپ کو بھی یاد ہوگا کہ آپ نے اس فون کال میں میری عرضداشت سننے کے بعد اس پر غور کرنے کے بجائے مجھ سے کہا تھا کہ میں بدحواس ہو کر آپ پر الزام لگا رہا ہوں۔" چوہدری سردار نے مہمان کی بات کو درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ نے یہ بھی کہا کہ میں۔" چوہدری سردار نے انہیں بات کرنے کے لیے منہ کھولتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا "خدانخواستہ آپ کی ممکنہ ترقی اور شہرت کو دیکھتے ہوئے آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کا نام آسمان مصوری پر چمک نہ سکے۔ میں آپ کو اسکینڈلائز کر کے کسی اور ابھرتے ہوئے مصور کا کارجیبن بن کر اسے سامنے لانا چاہتا ہوں۔"

چوہدری صاحب نے دیکھا۔ ان کی بات سن کر دم بھر کو ان کی مہمان پر خاموشی چھا گئی تھی۔

"یاد ہے بیگم صاحب سب یاد ہے۔ حرف حرف یاد ہے۔ بلاکم بلاکاست یاد ہے۔" چوہدری سردار نے سانس لینے کے بعد نیچی آواز میں کہا۔ "وہ دھند بھری صبح بھی بہت اچھی طرح یاد ہے جب بس اسٹاپ پر رک کر چائے کے کھوکھے سے چائے کا ایک کپ پینے کی خاطر گاڑی روکی تھی اور آپ کو اس دھند بھری سرد صبح کی خاموشی اور تنہائی میں وہ کرتے دیکھ لیا جس کا آپ جیسی نامور خاتون سے میں سیدھا سادہ دیہاتی تو کیا آپ جیسا پڑھا لکھا دانشور بھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔"

مہمان نے کرب کی شدت کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"بوڑھا ضرور ہو رہا ہوں بیگم صاحب! لیکن جوانی سے لے کر اب تک نہار منہ مغز بادام کھانے کی عادت نہ چھوڑنے کے باعث حافظہ میرا کمزور نہیں ہوا ہے' کسی بات سے نظر چرانا اور انجان بننا چاہوں تو اور بات ہے۔"

"آپ نے دیکھا' آپ کو یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو۔" مہمان نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کے بعد کہا۔ اس کی آواز میں لرزش اتر آئی تھی۔ "لیکن آپ نے اس کو وہاں سے اٹھا تو لیا۔ آپ نے اٹھا لیا نا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے چوہدری سردار کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ میں اسے وہاں سے اٹھا نہیں پایا۔" چوہدری صاحب نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "دیکھنے اور یقین کر لینے کے درمیان وقفہ اتنا لمبا ہو گیا کہ میرے آگے بڑھنے سے پہلے ہی اسے کوئی اور اٹھا کر لے گیا۔"

مہمان خاتون نے بری طرح چونک کر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی اور چہرے کی وحشت بڑھ گئی تھی۔

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ' غلط کہہ رہے ہیں' ایک دم جھوٹ۔" وہ بلند آواز میں چلا کر بولیں۔ "آپ نے

خود مجھے اس فون کال میں کہا تھا کہ آپ نے وہ سب دیکھا۔"
"میں کب کہہ رہا ہوں کہ نہیں دیکھا۔" چوہدری سردار نے تحمل سے کہا۔
"میں تو وہ سب دہرا چکا ہوں جو میں نے دیکھا مگر یہ سچ ہے کہ۔۔۔"
"نہیں یہ سچ نہیں ہے' وہ اور بھی بلند آواز میں چلائیں۔ "یہاں آکر آپ مکر کر رہے ہیں' جھوٹ بول رہے ہیں' آپ نے خود کچھ ہی دن پہلے کسی کو بتایا کہ آپ اسے وہاں سے اٹھا لائے اور اب تک وہ آپ کے پاس ہے۔"
اب کے چونکنے کی باری چوہدری صاحب کی تھی۔
"میں نے کہا' میں نے کس کو بتایا؟" وہ بھونچکا ہو کر مہمان کو دیکھ رہے تھے "کیا وہ لڑکا آپ کے پاس جا پہنچا۔ کیا وہ آپ کو جانتا تھا؟" الفاظ بے اختیار ان کے منہ سے نکلے۔
"اتفاق سے" اس بار مہمان کی آواز نیچی تھی "اتفاق سے وہ مجھے جانتا تھا۔ اتفاق سے وہ اس کہانی کے چند اور کرداروں کو بھی جانتا تھا۔"
"اس نے مجھے تو نہیں بتایا۔" چوہدری سردار اب تک ششدر تھے۔
"اس نے مجھ سے بھی کچھ نہیں پوچھا' وہ ایک خاموش سامع کی طرح آپ سے سن کر چلا گیا اور ایک خاموش نقیب کی طرح مجھے بتا گیا' بغیر کوئی ریفرنس دیے' بغیر کوئی سوال کیے۔"
"وہ؟" چوہدری صاحب نے بڑبڑا کر پوچھا "وہ کون تھا؟"
"آپ نہیں جانتے کیا!" مہمان نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بلال سلطان کا بیٹا ہے۔"
چوہدری صاحب کا منہ کھلا اور کھلا ہی رہ گیا۔
"اور یہ کون ہے؟" سوال ایک مرتبہ پھر چوہدری سردار کے منہ سے پھسلا۔
"یہ بھی بلال سلطان کا بیٹا ہے۔" مہمان نے نیچی آواز میں کہا۔
"اور آپ کون ہیں اس سارے میں؟" چوہدری سردار نے شاید ہی کبھی اتنے تواتر کے ساتھ کسی سے سوال کیا ہو۔
"میں اس سارے میں کوئی نہیں ہوں' میں صرف فلزا ظہور ہوں۔" خاتون نے سرد آہ بھرنے کے بعد کہا۔ "ایک گمنام مصورہ' جس کی ناموری کا راستہ دوسروں کے راز رکھنے کی گرد سے اٹ گیا۔"
"بہت خوب' اب بھی آپ میں گناہ کے اعتراف کا حوصلہ نہیں آپایا۔" چوہدری سردار انکشافات کی دہشت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ "اب بھی جب کہ آپ میرے علاوہ ایک کل کے بچے تک کے سامنے ایکسپوز ہو چکی ہیں۔"
"حوصلہ تو میں تب کروں چوہدری صاحب! جب گناہ میرا ہوتا' گناہ تو بلال سلطان کا تھا' بھگتنا مجھے پڑ گیا۔" مہمان خاتون' جس کا نام فلزا ظہور تھا' تھکے قدموں سے چلتی واپس صوفے کے قریب آئیں' اور ہارے ہوئے سپاہی کی طرح چوہدری سردار کے سامنے بیٹھ گئیں۔
"میں آپ سے کسی تفصیل سننے کا مشتاق نہیں ہو رہا ہوں بیگم صاحب!" چوہدری سردار نے فلزا ظہور کی طرف کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ "مجھے بہت زیادہ پڑھے لکھے دانشوروں کے سفاک اور پتھر دلوں کی داستانیں سننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہتر ہے آپ یہاں سے چلی جائیں' وہ جیسا ہے' جس بھی حال میں ہے' ایک مسرور اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے' اگرچہ بے خبر ہے لیکن میں اسے آپ کی اور بلال سلطان کی سفاکی اور بے رحمی کی خبر دے کر اس کے سکون' چین' بے فکری اور خوشی کو آگ نہیں لگا سکتا۔"

"میں ایسے یہاں سے جانے کے لیے نہیں آئی چوہدری صاحب' میں اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھے اس کی خبر' اس کا پتا نہیں دیتے۔" غرا کر بولیں۔
"نہیں تو کیا کریں گی آپ؟" چوہدری سردار نے چہرہ واپس موڑ کر ان کی طرف دیکھا "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کچھ نہیں کر سکیں گی' اس جگہ کے سب رہنے والوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے پہچاننے کی کوشش کرنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ۔ سو دفعہ کریں' میں آپ کو اس کے متعلق ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ آپ اپنی پہچان آزمالیں ہو سکتا ہے' آپ کا خون روایتی جوش مارے اور آپ اسے سینکڑوں کے ہجوم میں بھی پہچان جائیں۔"
"میرا خون؟" فلزا ظہور نے سوالیہ نظروں سے چوہدری سردار کی طرف دیکھا "میرا خون کیسے جوش مار سکتا ہے چوہدری صاحب! خون تو اس کا جوش مارے گا جس کا وہ ہے' میں تو میں نے کہا نا اس ساری کہانی میں کوئی بھی نہیں ہوں۔"
"مت کہیں بیگم صاحب! کہ وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے جسے آپ ایک گناہ کی پوٹ کی شکل میں آوارہ کتوں اور بلیوں کا نوالہ بننے کے لیے وہاں چھوڑ کر چلتی بنی تھیں۔" چوہدری سردار کا لہجہ ایک مرتبہ پھر درشت ہو گیا۔
"مجھے کہنے دیں چوہدری صاحب! کہ وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ تو بس اس آدمی رات کا ثمر ہے' جو میں نے جنت میں گزارنے کی خواہش کی تھی۔"
فلزا ظہور نے کہا تھا' اس کے لہجے میں شکستگی' درد اور اضطراب کے علاوہ ایک اور چیز بھی نمایاں تھی اور وہ چیز "سچائی" تھی۔

✡ ✡ ✡

ایک نحیف' زردی مائل رنگت والے ہاتھ نے دروازے کو پکڑا' کچھ دیر وہیں ٹکے رہنے کے بعد وہ ہاتھ آگے بڑھا اور کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ رکھے چیسٹ آف ڈرارز پر آکر ٹک گیا' اگلے مرحلے میں اس ہاتھ نے ڈائننگ چیئر کو اپنی گرفت میں لیا اور پھر آگے بڑھ کر کھانے کی میز کے کنارے پر جم گیا۔ ماہ نور کی نظریں مسلسل اس ہاتھ کی حرکات و سکنات پر جمی تھیں۔ اس ہاتھ نے کھانے کی میز کا کنارا پکڑا اور پھر اسی ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے وہ وجود اس کے سامنے آکر کھانے کی کرسی پر بیٹھ گیا جو اس نحیف' زردی مائل رنگت کے حامل ہاتھ کا مالک تھا۔
"معاف کرنا میں بہت تیزی سے چلنے سے قاصر ہوں۔ اس لیے مجھے یہاں آنے میں تھوڑا وقت لگا۔ تمہیں انتظار کی زحمت تو اٹھانی پڑی ہو گی۔"
وہ اس کے سامنے بیٹھنے کے بعد نرمی سے معذرت خواہانہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ماہ نور نے نظریں اٹھا کر اس چہرے کو دیکھا ہاتھ ہی کے جیسا زردی مائل رنگت کا حامل چہرہ جو صاف ستھرا تھا اور جس پر گہری بھوری آنکھیں ذہانت اور زندگی کی چمک لیے سجی تھیں اس کے بھورے سیدھے بال جو شانوں سے ذرا نیچے تک آتے تھے کھلے تھے اور اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ بالوں کی چند لٹیں چہرے کے دائیں بائیں بھی بکھری تھیں ان بکھرے بالوں کو سر کے اوپر جمے سیاہ ہیئر کیچر نے جکڑ رکھا تھا۔ اس کی ناک تیکھی اور ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ ہونٹ ہلکے گلابی رنگ کے تھے جن میں جھلکتی سفیدی خون کی کمی کا احساس دلا رہی تھی۔
"ہمارے شاعر بھی کیا خوب لوگ تھے۔ اچھی خاصی پیاری شکلوں کے حامل لوگوں کو بھی رقیب روسیاہ قرار دے دیتے تھے۔" اس نے دل میں سوچا۔
"اور اس بے چاری کو تو میں نے زبردستی رقیب روسیاہ کا مقام دے رکھا ہے۔ جبکہ محبوب تو جی جان سے صرف

اس کا ہے۔ میرا تو وہ کسی دن کے ہزارویں لمحے میں بھی نہ ہو سکا۔" اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔

پھر اپنے ذہن سے سب بے کار خیالات کو جھٹکتے ہوئے بولی "نہیں تمہاری یہ صورت حال تو بہت پوزیٹو اور پرامسنگ ہے۔" تم اپنے قدموں پر چلتی یہاں تک آئی ہو جبکہ آخری بار جب میں تم سے ملی تھی اس وقت تم بستر پر ہمہ وقت لیٹا ایک کمزور سا وجود تھیں بس۔"

"ہاں مجھے اپنے قدموں پر چلنے کا حوصلہ عطا ہوا۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا

"عطا!" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے دہرایا "کیا تم جانتی ہو کہ عطا ہونا کیا ہوتا ہے؟"

ماہ نور نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اپنا دھیان بالکنی میں کھلنے والے کھلے دروازے سے پار دور تک نظر آتے پہاڑوں کی طرف مبذول کرلیا۔ پہاڑوں پر سورج کی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی اور ان کی برف پوش چوٹیاں اس روشنی میں سر اٹھائے چمک سی رہی تھیں۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے، میرا خیال نہیں تھا کہ کبھی تم دوبارہ یہاں آؤ گی؟" سارہ نے اپنے سوال کا جواب نہ پانے کے بعد اپنا خیال ظاہر کیا۔

"کیوں؟" ماہ نور نے پہاڑوں پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا "تم نے ایسا کیوں سوچا۔"

"اس لیے کہ مجھے لگا' پہلے بھی تم یہاں آکر خوش نہیں ہوئی تھیں۔" سارہ نے صاف گوئی سے کہا۔ "ایسے جیسے تمہیں زبردستی لایا گیا ہو۔"

"کسی کو کہیں زبردستی کیسے لایا جا سکتا ہے؟" ماہ نور نے کہا۔

"لانے والے پر ڈی پینڈ کرتا ہے' جو لا رہا ہو' ہو سکتا ہے اس کی حیثیت اتنی ڈومیننٹنگ ہو کہ لایا جانے والا انکار نہ کر سکتا ہو۔" ماہ نور کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی۔

"تو بھئی' بچیوں چائے پیو۔" سیمی آنٹی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئیں "آج روزانہ کی نسبت سورج میں قدرے حدت ہے' چاہو تو میں چائے بالکنی میں لگا دوں۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے' جسم کو کچھ تو حدت پہنچے گی میں تو ہیٹرز کی آگ سینک سینک کر تنگ آچکی۔"

ماہ نور کے بجائے سارہ نے کہا۔ سیمی آنٹی چائے کی ٹرے بالکنی میں لے گئیں اور وہاں لگی میز اور کرسیوں کی ترتیب درست کرنے لگیں۔

"آؤ ماہ نور! بالکنی میں چلتے ہیں۔" سارہ نے اپنا نحیف و نزار ہاتھ کرسی کی پشت پر جما کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دینا چاہا۔ سارہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں خود چل سکتی ہوں۔" ماہ نور نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے سرہلایا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کے زندگی سے مات کھائے ہوئے انداز کے سامنے کوئی دلیل' کوئی مثال کام نہیں کرتی تھی۔

"تم نے سارہ کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے' کیا سارہ ہمیشہ اسی طرح ہمارے بیڈ پر پڑی رہے گی۔"

"کم از کم اس وقت تک جب تک وہ خود پر یقین کرنا نہ سیکھ لے گی۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے' اس میں کتنا وقت لگے گا۔"

"ایک عمر بھی لگ جائے تو پروا نہیں۔"

گزرے وقت کے دریچوں سے گزر کر ایک پرانی بات یاد آئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سارہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دو قدم خود سے اٹھانے کے بعد کسی چیز کا سہارا لیتی چلتی بالکنی کی طرف جا رہی تھی۔

"ایک عمر بھی لگ جائے تو پروا نہیں۔"

ایک عمر بھی۔

ایک عمر

ایک عمر

الفاظ بازگشت کی طرح اس کے اردگرد گونجنے لگے۔

"دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ممکن ہو جاتی ہیں جن کو اکثر لوگ ناممکنات میں شمار کر کے داخل دفتر کر چکے ہوتے ہیں۔" یہ بھی سارہ کے بارے میں اس نے کہا تھا جو یقیناً "اتنی سچی نیت سے ایک عمر سارہ کے ساتھ گزارنے اور اس کا سہارا بننے کا عہد کر چکا تھا کہ ایک عمر کے بجائے کچھ ہی وقت آگے سرکا تھا اور وہ سارہ جو ہمہ وقت ہمارے بیڈ پر پڑی رہتی تھی' اس کی نظروں کے سامنے خود اپنے پاؤں پر چلتی کمرے سے باہر نکلی تھی اور اس وقت میز پر رکھی چائے کی ٹرے میں سے کپ پلیٹیں' چمچ' چائے کے لوازمات اور چائے دان نکال کر میز پر سجا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت نارمل تھی اور ان میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

"معجزہ!" اس کے ذہن میں یہ منظر دیکھتے ہوئے خیال آیا "کیا یہ معجزہ ہے؟ صرف محبت اور نیت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ایسے ایسے معجزے رونما کرا سکتی ہے؟"

"ماہ نور! آؤ نا' یہاں آجاؤ۔" سارہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری وہ دوست کیا کر رہی ہے آج کل جو تمہارے ساتھ سید پور کلچر فیسٹول دیکھنے آئی تھی اور یاد ہے کہ اس نے میوزیکل نائٹ پر بھرے کراؤڈ میں چلا چلا کر ایک سنگر کو مخاطب کرتے ہوئے نیوز بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

شاہ بانو کے بھائی عبید نے اس سے پوچھا۔ شاہ بانو ان دنوں ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کے پاس چند دن گزارنے اسلام آباد آئی ہوئی تھی۔

"وہ۔۔۔! وہ تو آج کل کچھ بھی نہیں کر رہی' اس نے اپنا ایک سمسٹر بھی مس کر دیا۔ اس کی ممی اس کی وجہ سے خاصی پریشان رہتی ہیں کیوں؟ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

"یونہی مجھے اس فوک میوزیکل نائٹ کی خبر پڑھ کر وہ یاد آگئی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے آج تک حیرت ہے کہ اس سنگر کی تمام وڈیوز میں سے وہ حصہ کیسے ایڈٹ ہوا اور کسی بھی سائٹ پر آنے سے رہ گیا جس میں تمہاری دوست اس پر چلا رہی تھی۔ یا تو تمہاری دوست کے کانٹیکٹس بہت اسٹرانگ ہیں یا پھر۔" عبید کہتے کہتے رک گیا۔

"یا پھر؟" شاہ بانو نے سوالیہ انداز میں عبید کی طرف دیکھا۔

"یا پھر اس سنگر لڑکے نے خود اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے وہ حصہ کہیں بھی سامنے آنے سے رکوایا۔"

"لیکن وہ ایسا کیوں کرتا؟" شاہ بانو نے حیرت سے کہا۔ "ایسے لوگوں کے لیے اس قسم کے واقعات تو شہرت چمکانے کا ذریعہ ہوتے ہیں' وہ اس کو اپنی مقبولیت کی علامت بنا کر بھی تو پیش کر سکتا تھا۔"

"یہی بات تو میرے لیے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہے۔" عبید مسکرایا۔ "تم تو نہیں مانو گی لیکن مجھے ایسا لگتا ہے تمہاری دوست یونہی اس کو دیکھ کر نہیں چیخی تھی۔ اس کے چیخنے چلانے اور اس سنگر کے درمیان کوئی تعلق ضرور تھا' جب ہی موصوف نے اسے اپنی مقبولیت کی علامت بنانے کے بجائے بالکل غائب ہی کروا دیا۔" وہ دوبارہ اپنی توجہ اخبار کی طرف منتقل کرنے سے پہلے بولا۔

حمید اخبار میں مگن ہو چکا تھا مگر شاہ بانو کا ذہن کئی پرانی باتوں میں الجھ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"برسوں تک مجھے اپنے کام میں مصروف و مگن رہتے ہوئے اچانک کسی چیز کا ایک مانوس سا احساس ہوتا تھا ایک ایسا احساس جو میرے اردگرد پھیل جاتا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا سکون اتر جاتا تھا۔ سکون کی اس کیفیت کو میں خود اپنے سامنے بھی بیان نہیں کرپاتی تھی۔ لیکن میں اتنے برس اس مانوس احساس کے ساتھ ہی پلتی بڑھتی رہی۔ اب اتنے برسوں بعد' جب میرے دل و دماغ اور بہت سی بڑی بڑی باتوں کو سمجھ لینے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں اب جاکر بہت ہی اچانک مجھے پتا چلا کہ وہ مانوس احساس کیا تھا۔

تم سنو گے تو یقیناً "بہت ہنسو گے" اسے میرا وہم قرار دو گے' یہ بھی کہو گے کہ میں ایک وقتی کیفیت کے زیر اثر ہوں اسی لیے ہر نئی بات کا تعلق اس سے جوڑ رہی ہوں لیکن میں تمہیں بتاؤں چندر شکھر اور اے کہ میں اس احساس کی حقیقت کے بارے میں اتنی ہی پر یقین ہوں جتنی اپنے اس وقت زندہ ہونے کے بارے میں ہوں۔ وہ مانوس احساس' میری سماعت میں ایک انجانی سی آواز آنے پر اترتا تھا۔ میں اس آواز کو اور اس میں کہے الفاظ کو شاید کبھی سمجھ پائی نہ ہی میں نے اس کی طرف دھیان دیا لیکن لندن کی سنٹرل مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے جاتے ہوئے پارک روڈ پر ریجنٹس لاج میں داخل ہوتے ہوئے وہ انجانے الفاظ اپنے ساتھ وہی مانوس احساس لیے میرے کان میں پڑے' اس بار میں انہیں آواز کی بلند ترین سطح پر سن سکتی تھی۔ وہ الفاظ عربی زبان میں ادا کیے جا رہے تھے اور وہ اذان کے الفاظ تھے۔"

نادیہ نے چندر شکھر کو میل لکھتے لکھتے رک کر سامنے دیکھا اور ایک بار پھر اس پر کیف کیفیت کو یاد کیا اور مسکراتے ہوئے میل کا اگلا حصہ لکھنے لگی۔

"اذان کی آواز جس سے تم بھی یقیناً "مانوس ہو گے۔ تمہارا دیس' جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا دیس ہے وہاں تم نے مندروں اور کلیساؤں میں بجتی گھنٹیوں' بلند آواز میں اشلوک پڑھنے نوا کار امنتر (جین مذہب) کو ہرائے جانے کی آوازوں' نیا نفو (بدھ مذہب) کی آوازوں' گرو گرنتھ صاحب پڑھنے اور بھجن گائے جانے کی آوازوں کے درمیان اکثر مسجدوں سے اٹھتی اذان کی بھی سنی ہوگی' لیکن تم جتنا چاہو' اس حقیقت کا اقرار کرنے سے بھاگو' میں جانتی ہوں کہ تمہارا دل یقیناً "مندروں کی گھنٹیوں' اشلوک اور بھجن کی آواز کی طرف کھنچتا ہو گا کیونکہ لاشعوری طور پر تم ان ہی سے زیادہ مانوس ہو۔ اب یہ آوازیں برسوں بعد بھی سنو گے تو تمہارے اندر وہی مانوس احساس جاگے گا جو اس وقت جاگتا تھا جب تم اپنے دیس میں موجود تھے۔"

وہ رکی اور کچھ سوچنے کے بعد کی پیڈ کی کیز دوبارہ سے دبانے لگی۔

"میں جانتی ہوں یہ الفاظ پڑھتے ہوئے تم یقیناً "ہنس رہے ہو گے' لیکن میرا مشورہ ہے' کبھی جو میں نے کہا ہے اسے ضرور آزمانا' میں نے آزمایا نہیں لیکن یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہو چکی ہے کہ پوری دنیا میں' میں جس مانوس احساس نے ہمیشہ میرے دل کو ایک سکون آمیز کیفیت عطا کی وہ ان انجان الفاظ کے اندر بند تھا جنہیں میں شاید ابھی بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکی ہوں۔ ہاں سمجھنے کے مراحل سے ضرور گزر رہی ہوں اور یقین جانو۔ صرف ایک کوشش کی نیت نے میری زندگی کو آسودہ اور پر سکون کر رکھا ہے میں لندن جیسے شہر میں رہنے کے لیے سوچتے ہوئے ڈرتی بھی تھی کہ میں اس مہنگے ترین شہر میں رہنے کے اخراجات کیسے پورے کرپاؤں گی۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کیسے اور کہاں سے مگر ڈاکٹر رضا حسین کے مقالے کمپوز کرنے کا جو معاوضہ مجھے ملتا ہے' وہ اور ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں آنے والی ایک مخصوص رقم کے ساتھ میں اتنے اچھے طریقے سے اپنی زندگی کی گاڑی کھینچ رہی ہوں کہ مجھے

ہیلسنکی کے وہ مشقت سے بھرپور مشکل ترین دن ایک خواب لگنے لگے ہیں۔ میں نے جو سمجھا ہے اور جو پایا ہے' جو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور جو پالینا چاہتی ہوں' سب نے مل کر میری زندگی میں سکون اور چین شامل کر دیا ہے۔ میرا بہت دل چاہتا ہے شکھر آج کل تم مجھے ملو اور دیکھو مجھ میں اور اس نادیہ بلال میں جو ہیلسنکی میں رہتی تھی کیا فرق آیا ہے۔"

اس نے لکھنے کے بعد اس صفحے پر ایک نظر ڈالی اور ایک بٹن دبا کر وہ مکتوب بھیج دیا۔

☼ ☼ ☼

"آپا رابعہ' سعد کو سردار چچا کے فارم ہاؤس پر ملی تھیں۔ وہ اس روز سے اب تک دم بخود ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ مضطرب' وہ سعد میں سعد کو دیکھ رہی تھیں یا سعد میں آپ کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ تو آپ ہی جانتے ہوں گے لیکن سعد ان میں کچھ بھی دیکھ نہیں پایا۔ اسی لیے ان سے کنارا کرتے ہوئے ان کے سامنے سے ہٹ گیا۔ سعد تو آپا رابعہ کو نہیں پہچانتا تھا مگر آپا رابعہ' آپ سمجھ سکتے ہیں ان کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی سعد کو دیکھ کر۔"

ان کے کانوں میں اس لڑکی کی آواز گونج رہی تھی جو ابراہیم کے توسط سے ان سے ملنے آئی تھی۔ جبکہ ان کی نظریں سامنے موجود ہوم تھیٹر' ٹی وی کی بڑی اسکرین پر جمی تھیں' جس پر وہ اپنے بیٹے کی تصویریں دیکھ رہے تھے ایک کے بعد ایک تصویر اس سلائیڈ شو میں محفوظ ترتیب کے ساتھ اسکرین پر آتی اور گزرتی جاتی تھی۔ ان کا جسم آرام کرسی پر جھول رہا تھا اور دماغ میں کئی قسم کی سوچیں گردش کر رہی تھیں۔

"آپا رابعہ اور مولوی سراج سرفراز' ہمارے آبائی گاؤں میں رہتے ہیں۔ مولوی سراج سرفراز گاؤں کی جامع مسجد میں تعینات ہیں اور آپا رابعہ گاؤں والوں کی طرف سے پیش کردہ ایک چھوٹے سے کچے مکان میں رہتی ہیں' ان کی بیٹی سعدیہ گاؤں کے قریبی قصبے کے اسکول سے میٹرک کر رہی تھی کہ اچانک نجانے دونوں کو کیا خیال آیا جو جھٹ پٹ سعدیہ کا بیاہ کھاری سے کر دیا۔ کھاری ایک یتیم' مسکین' ان پڑھ سا لڑکا ہے۔ پھر بھی آپا رابعہ اور مولوی سرفراز نے سعدیہ کا بیاہ کھاری سے کر دیا۔" آرام کرسی تیزی سے آگے پیچھے حرکت کرنے لگی۔

"وہ دونوں بے چارے معذوروں کی طرح ڈری سہمی زندگی گزار رہے ہیں۔ اب تک وہاں انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ دراصل دونوں کہاں کے رہنے والے ہیں۔ طیفے لاٹ' نامی خونی بلا کا روگ دونوں کو ایسا چمٹا ہے کہ دونوں بس سانس لیتے ہیں تو زندہ ہیں۔"

"طیفا لاٹ۔" ان کے چہرے کا زاویہ بگڑا۔

"طیفا لاٹ۔" چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

"طیفا لاٹ۔" ان کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"طیفے لاٹ نامی خونی بلا۔" انہوں نے غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔ ان کے جبڑوں کی ہڈیاں آپس میں سختی سے جڑ گئی تھیں اور رخسار کھنچے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"مولوی سراج سرفراز کو تو پھر بھی لگتا ہے' جس حال میں ہوں جینا آتا ہے کیونکہ وہ غور و فکر کرنے کی عادت جیسی علت نہیں پالتے لیکن آپا رابعہ' وہ بے چاری نجانے اب تک زندہ کیسے ہیں اور پھر ابھی تک تو جیسے تیسے زندہ تھیں بھی سہی مگر۔ سعد کو دیکھ لینے کے بعد نجانے کیسے جی رہی ہیں۔ میں تو ان کی خاطر سعد کو ڈھونڈتی یہاں تک آئی تھی لیکن یہاں آکر سنا ہے کہ یہاں کسی کو بھی سعد کی خبر نہیں' آپ کو بھی نہیں۔"

اس لڑکی کی کچھ اور باتیں یادداشت کے گوشے سے نکل کر ذہن کے پردے سے ٹکرائیں۔ انہوں نے سامنے دیکھا' 100 انچ بڑی اسکرین پر موجود سلائیڈ میں سعد کسی بزنس میٹنگ میں بیٹھا اپنے مخاطب کی بات

سنتے ہوئے مسکرا رہا تھا' پل بھر بعد یہ تصویر غائب ہوئی اور اگلی سلائیڈ اسکرین پر نظر آنے لگی کسی سوئمنگ پول کے کنارے ڈیک چیئر پر نیم دراز وہ ایک آنکھ دبائے تصویر لینے والے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس رہا تھا' اگلی سلائیڈ' ایک فیملی فرینڈ کے ہاں شادی کی تقریب میں سیاہ ڈنر سوٹ پہنے دولہا کے ساتھ کھڑا۔ اگلی سلائیڈ' فرینکفرٹ میں پراڈکٹ کو اسٹی انشورنس کانفرنس میں شریک' گلے میں کانفرنس کے شرکاء کا مخصوص کارڈ لٹکائے ایک گروپ فوٹو میں' اگلی سلائیڈ' یونیورسٹی کے زمانے کی تصویر' کسی اسپورٹس ایونٹ کے اختتام پر ٹرافی وصول کرتے ہوئے۔ اگلی سلائیڈ' اس سے اگلی' اس سے اگلی۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

منظر' چہرے' آوازیں' واقعات' شوران کے اردگرد جیسے ہنگامہ بپا تھا۔

"آپا رابعہ شاید کسی طرح سعد تک پہنچ ہی جاتیں اگر جو وہ چچا سردار کے فارم ہاؤس کے مہمان خانے کی دیوار پر ٹنگی فلزا ظہور نامی ایک مصورہ کی ایک ادھوری پینٹنگ دیکھ کر اچانک وہاں سے غائب نہ ہوجاتا' وہ آخری دن تھا جب فارم ہاؤس میں موجود کسی شخص سمیت میں نے اسے دیکھا تھا۔" اس لڑکی کی آواز سب آوازوں پر بھاری ہونے لگی۔

"آپا رابعہ' مولوی سراج' سرفراز' فلزا ظہور' پینٹنگ...... جگسا پزل کے ٹکڑے' کس کو کہاں جوڑنا ہے' کس کو کس سے ملانا ہے' میرا دماغ تو سوچ سوچ کر ہار مان گیا' مجھے تو زندگی میں کبھی جگسا پزلز میں دلچسپی نہیں رہی۔ میں نجانے کس وجہ سے چند ٹکڑے سامنے رکھے کوئی نامعلوم پزل حل کرنے چل پڑی ہوں۔"

آرام کرسی کے ہلنے کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ اسکرین پر چلتی سلائیڈز اپنا ایک ایک چکر ختم کرکے دوبارہ نئے سرے سے چلنا شروع ہوچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"جنت میں ایک رات گزارنے کا ثمر!" چوہدری سردار نے فلزا ظہور کی طرف دیکھا' کچھ ہی وقت گزرا تھا' محض چند گھنٹے جن کے اندر اندر چوہدری سردار کو وہ کم رو' بدمزاج' بددماغ' مڈل عورت جس کا لباس ہمیشہ سے ہی عجیب و غریب رہا تھا۔ دنیا کی مظلوم' دکھی مگر صابر اور خاموش عورتوں میں سے ایک نظر آنے لگی تھی۔ بے کے پن کی سزا کاٹتی ناکردہ کی مجرم' جس کے پاس اپنے حق میں کوئی ثبوت تھا نہ دلیل تھی۔

"وہ خود کدھر ہے؟" انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔ فلزا ظہور نے جواب تک بول بول کے تھک چکی تھی چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"وہی...... بلال سلطان!" چوہدری صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"خود پر بے اعتنائی' سرد مزاجی اور بے نیازی کا زرہ بکتر چڑھائے زندگی سے نبرد آزما ہے۔" فلزا نے کہا۔ "وہ منحوس حقیقت "پیسہ" ہی تھی نا جس نے اس سے زندگی چھینی' زندگی کی خوشیاں چھینیں' وہ اپنے تئیں اسی پیسے سے انتقام لے رہا ہے۔ اسے کما کما کر' اسے لٹا لٹا کر بے جان' بے مقصد چیزوں پر ضائع کرکے شاید وہ "پیسے" کو بتانا چاہتا ہے کہ در حقیقت وہ کتنا بے وقعت ہے' جس کے پاس ہے اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں' جس پر وہ مہربان ہے' اسے اس کی کوئی قدر نہیں۔ برسوں کی پہنی سرد مہری اور بے نیازی کی اس زرہ بکتر نے اسے شاید شدید مادیت پرست بنادیا ہے۔ وہ شہر در شہر پلازے کھڑے کرنے' ٹاورز بنانے' آسمان سے باتیں کرتے مالز تعمیر کروانے' اندرون و بیرون ملک اپنے بینک اکاؤنٹس بڑھانے اور بڑھاتے چلے جانے میں مصروف شاید اپنا وہ غم غلط کررہا ہے کہ دولت کا یہ ہما اس کے سر پر اس وقت بیٹھا جب وہ اپنا سب کچھ گنوا چکا تھا۔"

"سعد سلطان اس کا بیٹا ہے' مگر وہ یہ سب سن کر سٹپٹایا اور بڑبڑایا کیوں' اس کے لیے یہ سب ایک انکشاف کیوں تھا؟" چوہدری سردار نے پوچھا۔

"سعد سلطان گھمسان کے اس کارزار حیات سے نمٹنے کے بعد بلال سلطان کے ہاتھ لگا واحد مال غنیمت ہے' اس کی سب سے قیمتی متاع۔ اس کے سامنے ماضی کے یہ بھیانک البم کھولنے کی طاقت یقیناً اس میں نہ ہوگی' اس لیے سعد سلطان کے لیے یہ سب نیا تھا۔"

"دیکھ لیجیے بیگم صاحب! پھر انسان کتنا بے بس ہے۔" چوہدری سردار نے کہا۔ "جن حقیقتوں کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کے کس کس کونے کھدرے سے نکل کر سامنے آجاتی ہیں۔"

"سچ ہے۔" فلزا ظہور نے سرہلاتے ہوئے کہا "اس بچے کے بارے میں ادھورا پورا سبھی سعد سلطان نے آپ سے سن لیا' حالانکہ آپ کو قطعی علم نہ تھا کہ جس کو سنا رہے ہیں' وہ واقعہ کا ایک کونا ہے' میری سہیلی فاطمہ ذوالفقار کے توسط سے آپ کی بھتیجی کے ہمراہ وہ مجھ تک آپہنچا' اور پھر کڑی سے کڑی اس کے لیے آپ سے آپ ہی مل گئی۔ واقعی سچ ہے چوہدری صاحب! جو انسان چھپاتا پھرتا ہے وہ خدا کو منظور نہ ہو تو چھپ نہیں پاتا۔" فلزا ظہور نے جواب دیا۔

"کوئی شک نہیں' کوئی شک نہیں۔" چوہدری سردار نے سرہلاتے ہوئے تاکید کی۔

"چوہدری صاحب! اب اگر مہربانی کریں تو اسے بلادیں' شام بھیگنے لگی مجھے لمبا سفر طے کرکے واپس بھی جانا ہے۔"

چوہدری سردار نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر لجاجت سے بولے۔

"میں تو کہتا ہوں بیگم صاحبہ! اسے اس کے حال میں مست رہنے دیں۔ وہ حساس اور جذباتی طور پر کمزور بچہ ہے۔ مجھے ڈر ہے' اس اتنے بڑے انکشاف کا بوجھ سہ نہیں پائے گا۔ وہ جیسا ہے' جس حال میں ہے' بہت خوش ہے۔"

"نہیں چوہدری صاحب!" فلزا نے سختی سے کہا "میں نے جب سے سنا ہے کہ وہ زندہ ہے' سلامت ہے' ابھی تک آپ کی حفاظت میں ہے' میں چین سے بیٹھ نہیں پائی ہوں' پلیز آپ اسے بلادیں' مجھے اسے بتانے دیں میں برسوں پہلے کیے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا!" چوہدری سردار نے بے بسی سے کہا اور اٹھ کر دروازے کے قریب جاکر آواز دینے لگے "او دین محمد! اوئے شفیع کا کا! کدھر چلے گئے ہو او سارے؟"

☼ ☼ ☼

"ہاؤسوں کو تمہاری سکی ڈائیونگ یقیناً پسند آئی ہوگی' کیونکہ وہ واقعی شاندار تھی۔" رات کے کھانے کے دوران وون زادے نے سعد سے کہا۔

"تم یقیناً میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" اس نے تلے ہوئے جھینگے کو کانٹے میں پروتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں کہ پہلی لفٹ کے ڈائیورز میں' میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ میرے پیر سکینز پر جمنے سے قاصر ہورہے تھے اور میری نظر کی انتہائی حد بھی کمزور پڑ رہی تھی۔"

"مت بتاؤ مجھے۔" وون زادے ہنس کر بولا۔ "یہ سب سے کم اونچائی کی سکی ڈائیونگ تھی' جہاں سورج کی روشنی بہت کمزور ہوتی ہے' تمہاری نظر کی حد یہاں کمزور پڑ رہی تھی تو پھر تمہیں اگلی اونچائی پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"وہ تو خیر میں ضرور جاؤں گا' مجھے انتہائی اونچائی پر جاکر سکینگ کرنے کا شوق ہی تو یہاں تک کھینچ لایا ہے اس

کو پورا کیے بغیر تو میں یہاں سے جانے والا نہیں۔" سعد نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر میرے عزیز دوست' پروٹین اور چکنائی والی یہ غذائیں کھانا بند کردو' کاربوہائیڈریٹس لو زیادہ سے زیادہ میری طرح' اونچائی پر تمہارے کام آئے گی۔" وودن زادے نے اپنی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا' جس میں خمیر سے گندھے آٹے کی روٹی کا ٹکڑا اور سبز پتے کی ابلی سبزی رکھی تھی۔

"مذاق مت کرو۔" سعد زور سے ہنس دیا۔ "میرا فشار خون اکثر کم رہتا ہے' میں تمہاری والی غذا کھا کر بستر پر نہیں لیٹ جانا چاہتا۔"

"اور یہ کہ چند دن نہیں' اس کم اونچائی والے ٹریک پر مشق کرو' اس کے بعد ہم اگلی لفٹ پر جائیں گے' اپنی نظر کی حد کو بھی بہتر بنانے کی مشق کرو۔" وودن نے اگلا مشورہ دیا۔

"چند دن اور۔" وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔ "قطعی نہیں" "تم نے موسم کی پیش گوئی نہیں سنی' اگلے دو دن میں اونچائی کی آخری حد پر مزید برف پڑنے والی ہے۔ ہم ان ہی دو دنوں میں سے ایک میں اگلی نہیں بلکہ اس سے اگلی لفٹ پر سوار ہوں گے۔"

"کیا تم جنونی ہو یا یہاں سے کھسکے ہوئے ہو۔" وودن زادے نے کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "برف ایک رات پڑے گی اور اس سے اگلے روز دن میں سورج نکلے گا' زیادہ اونچائی پر برف پر پڑنے والی سورج کی تیز شعاعیں جانتے ہو' کتنی خطرناک ہوتی ہیں۔ ہم کوئی نہیں جا رہے اگلے دو دنوں میں وہاں فی الحال نہیں' مشق ہو گی' بس تم اپنے پانی پینے کی مقدار بڑھاؤ' زیادہ سے زیادہ جوس اور پانی پیو۔"

"آپ فکر مت کریں ابا جان! میں آپ کو ان ہی دو دنوں میں وہاں جا کر دکھانے والا ہوں۔" سعد نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا اور وودن زادے اس کی ہٹ دھرمی پر سر جھٹک رہا تھا۔ یقیناً" وہ اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں کوئی زیادہ قابل اعتبار شخص نہیں ہوں لیکن پھر بھی نجانے کیوں باس مجھے ایک ایسی جگہ کی خبر لانے پر تلا ہوا ہے' جس کے محل وقوع سے میں قطعی واقف نہیں ہوں۔" رازی نے جلدی جلدی چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا' وہ انتہائی عجلت میں نظر آرہا تھا۔

"باس جانتا ہے کہ تم اپنے ذمہ لگائے کام کو بہت اچھی طرح پورا کر سکتے ہو' اور تم یہاں سے۔" ضوفی نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ "جسم کی نسبت زیادہ موٹے ہو' سوال کرنا چاہو بھی تو کر نہیں پاتے اور کسی معاملے کی گہرائی میں بھی تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کام کے لیے تم سے بہتر آدمی کوئی دوسرا ہو بھی نہیں سکتا۔ جتنے سالوں سے تم باس کی خدمت کر رہے ہو' اتنا عرصہ تمہاری وفاداری جانچنے کے لیے بھی کافی ہے۔"

"ہاں!" رازی اپنی شخصیت کا ایسا تجزیہ کیے جانے پر بگڑ کر بولا "حالانکہ باس جانتا ہے کہ تم جیسی چالاک لومڑی میری بیوی ہے۔"

"یہ تو تمہارا پلس پوائنٹ ہے جناب! بے وقوف دوست کا عقل مند ساتھی' باس جانتا ہے کہ پازیٹو اور پازیٹو مل کر روشنی نہیں کرتے' پازیٹو کو نیگیٹو کے ساتھ تعلق جوڑ کر روشنی حاصل کرنی پڑتی ہے' تو اگر نیگیٹو' پازیٹو دوست کی بیوی ہو تو زیادہ بہتر ہے' بجائے اس کے کہ وہ اس کی صرف دوست ہو۔"

"میری چالاک لومڑی! میری سوچ کی حد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں تمہاری سوچ کی حد شروع ہوتی ہے۔ لو پھر میں چلا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا حافظہ ذرا کمزور ہے' میں نے احتیاطاً" ان لوگوں کے ناموں کی لسٹ بنا کر تمہاری جیکٹ کی جیب میں رکھ دی ہے جن کے بارے میں تمہیں پتا کرنا ہے۔" ضوفی اٹھ کر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے بولی۔

"ہوں" رازی نے توصیفی نظروں سے ضوفی کی طرف دیکھتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے لسٹ والا کاغذ نکال کر دیکھا۔ "مولوی سراج سرفراز' رابعہ کلثوم زوجہ مولوی سراج سرفراز' چوہدری سردار خان ... ارے ڈارلنگ یہ تو صرف تین لوگ ہیں' تین نام یاد رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تمہارے لیے یقیناً" مشکل ہے' تم مولوی' سراج سرفراز' رابعہ' کلثوم' زوجہ اور چوہدری سردار خان' چھ لوگوں کا پتا لگانے میں مصروف رہتے اگر میں نمبر شمار کے ساتھ یہ نام نہ لکھتی۔" ضوفی نے مسکرا کر کہا۔

"چلو اب جاؤ' دیر ہو رہی ہے۔"

رازی نے تیزی سے ہاتھ ہلایا اور ڈرائیو وے کی طرف چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں سعد نے یہاں آنے کے لیے کہا ہے نا ماہ نور! ہم لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔" سارہ نے سینڈوچز میں سے پنیر کے ٹکڑے نکال کر پلیٹ میں ایک طرف جمع کرتے ہوئے کہا۔ پنیر اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا جبکہ سیمی آنٹی کو پنیر کھانے کا جنون تھا۔

"سعد نے" ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں۔ مجھے اس نے نہیں بھیجا۔" وہ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں بولی "اور وہ مجھے کیوں بھیجے گا' تمہارے بارے میں تو وہ خود براہ راست خبر رکھتا ہو گا۔"

"ہم سے تو بہت دن سے اس کا کوئی رابطہ نہیں۔" سارہ کے لہجے میں دکھ اترا "وہ بہت دن پہلے یہاں آیا تھا' شاید دوبارہ کبھی نہ آنے کے لیے۔"

"کیا مطلب؟" ماہ نور کو دھکا سا لگا۔

"مطلب وہ آخری بار ایسے ہی آیا جیسے دوبارہ اسے یہاں آنا ہے نا ہی ہم سے کوئی تعلق رکھنا ہے۔"

ماہ نور کے اردگرد ہر چیز ساکت ہو گئی۔ نیچے سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کی اور رواں دواں گاڑیوں کی فضا میں گونجتی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ اس کے اردگرد صرف سناٹا تھا۔

"وہ کہاں گیا ہے سارہ؟" بہت لمبے وقفے کے بعد اس نے خود کو کہتے سنا۔

"معلوم نہیں۔" سارہ نے نیچی آواز میں کہا۔

"تمہیں بھی معلوم نہیں۔" ماہ نور نے بے یقینی سے کہا۔ "تم جو اس کی کوئین آف ہارٹ ہو' اس کی زندگی کا مرکزی نکتہ' جس سے وہ کبھی ایک انچ ادھر ہوا نہ ادھر۔"

سارہ اسے منہ کھولے دیکھ رہی تھی' یہ بات وہ لڑکی کر رہی تھی' جس پر اس نے ہمیشہ رشک کیا تھا۔ جس سے اس نے ہمیشہ حسد بھی محسوس کیا تھا۔ وہ جو بلندیوں پر نظر آتی تھی' سعد سلطان کے کندھے سے کندھا جوڑے شاد اور مسرور۔

اس نے بمشکل اپنا کھلا ہوا منہ بند کیا اور سر جھٹکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے لگی پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے اپنی رندھی ہوئی آواز کو حتی الوسع اعتماد کا سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں وہ لڑکی نہیں ہوں ماہ نور! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ وہ لڑکی تو اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ لڑکی تو تم ہو خود۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے دل کے آرپار کیسی چھریاں پیوست ہوئی تھیں یہ صرف وہی جانتی تھی اس کی پسلیوں کے درمیان کہیں اس کا زخمی دل پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔

"میں ان دنوں اتنی سنجیدہ اور پریشان ہوں سارہ! کہ تمہارے مذاق کا ٹھیک سے لطف بھی نہیں اٹھا سکتی میں معذرت خواہ ہوں مجھے واقعی ہنسی نہیں آرہی۔" ماہ نور نے یہ کہتے ہوئے اپنی نظریں سامنے سر اٹھا کر کھڑے پہاڑوں پر جمالیں۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور پہاڑوں کا منظر دھندلانے لگا تھا۔

سارہ نے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکالیا۔

"میں اس کے لیے صرف ایک نیکی ہوں ماہ نور! جس سے اس کا انسان دوست، ہمدرد دل فرار حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ چاہے بھی تو مجھے نظر انداز نہیں کرسکتا کیونکہ میں اس کے ہاتھوں لگا نیکی کا رحم دلی کا "انسان دوستی کا" وہ پودا ہوں، جس کی آبیاری اس نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا "انسان کی فطرت میں اپنے ہاتھوں سے لگائے پودے کی محبت بیٹھی ہے "ایسے کسی پودے کا کوئی پتا مرجھانے لگے" اس پر کسی موسم کے اثر کے تحت پھل کم آئے' یا وہ ناقص پھل دینے لگے' سب سے زیادہ فکر پودا لگانے والے کو ہوتی ہے۔ وہ اس کی نگہداشت اور پرداخت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔" وہ لحہ بھر کو رکی۔

"میں سعد سلطان کے لیے ایسا ہی ایک پودا ہوں ماہ نور! جس کی طرف سے وہ غافل اور لاپروا نہیں ہوسکتا۔" اس نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی "ہوسکتا ہے اتنے سالوں میں میری حیثیت محض ایک ہمدردی' ایک نیکی سے بڑھ کر ایک اچھے دوست میں تبدیل ہوگئی ہو کیونکہ جو سونگ اس نے مجھے ڈیڈیکیٹ کیا تھا' اب میں اس کے الفاظ غور سے سنتی ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے کیسی دوست سمجھتا ہے۔"

اس نے ماہ نور کے چہرے پر استعجاب کے سائے بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"ایک ایسی دوست جس سے اسے اتنی انسیت ہے کہ وہ اس کے لیے "اس کی ایک پکار پر پوری دنیا میں ہر وقت موجود ہے۔ ایک ایسی دوست جسے اسے پکارنے کے لیے صرف نمبر تین تک گنتی گننی پڑے اور وہ حاضر ہوجائے' اور ایسا ہوا بھی۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں جب بھی اس کی غیر حاضری کی وجہ سے پریشان ہوئی اور میں نے اس کو یاد کیا تو وہ اسی روز سہاں آن موجود ہوا' ہاتھوں میں پھول لیے' چاکلیٹس کے ڈبوں اور محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ' مجھے زندگی کے ہونے کا یقین دلانے کے لیے' مجھے گرتے ہوئے دیکھ کر اپنے ہاتھ اور اپنے کندھے کا سہارا پیش کرنے کے لیے' مجھے دنیا میں حوصلے اور عزم کی بکھری داستانیں سنانے کے لیے' مجھے یقین دلانے کے لیے کہ ہاں۔ میں کرسکتی ہوں' میں زندہ ہوں اور جب تک زندگی ہے میں آگے بڑھ سکتی ہوں کسی بھی نارمل انسان کی طرح میں بھی زندگی کے رنگوں کے ساتھ کھیل سکتی ہوں کیونکہ میں ابھی مری نہیں' وہ زندہ ہوں' میری زندگی جو ایک معجزہ ہے' یہ معجزہ مجھے اسے ضائع کرنے کے لیے عطا نہیں ہوا۔

آج جب میں اسے تصور میں دیکھتی ہوں تو بھی مجھے چاروں طرف وہ ہاتھ کے اشارے سے اٹھنے کا' زیرلب بولتے ہوئے ہمت کرنے کا' مسکراتے ہوئے میری کوششوں کو سراہنے کا اشارہ دیتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں اس کی "نیکی کا پودا" ہوں' مجھے زندگی کی طرف لوٹتے ہوئے' زندگی کی سرسبزی سے شاداب ہوتے ہوئے دیکھ کر اس سے زیادہ کون خوش ہوسکتا ہے۔"

اس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں اور اپنے سامنے دم بخود بیٹھی ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"میں بھی کبھی کبھی اس خوش فہمی کا شکار ہوجاتی تھی کہ میں اس پوری دنیا میں سعد کے لیے سب سے اہم ہوں' جس کی ایک پکار پر وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگا چلا آتا ہے' جس کی خوشی کی خاطر وہ پیسہ پانی کی طرح بہارہا ہے' جس کی ایک مسکراہٹ کے لیے وہ گھنٹوں بول سکتا ہے' اور جس کے مسکرا دینے پر وہ جانثار ہوتا نظر آتا ہے"

اس نے دیکھا' ماہ نور کے چہرے پر رشک اور حسد کے سائے لرزنے لگے تھے۔

وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"لیکن۔ میں نے اب جان لیا ہے کہ ایسا محض اس لیے تھا کہ وہ اتنا نیک نیت اور نیک دل ہے کہ اپنی نیکی پر غفلت کا سایہ پڑنا اسے کسی طور منظور نہیں' وہ اتنا محبت کرنے والا دوست ہے کہ دوست کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنا اس کی عادت ہے۔ اس کی مجھ سے متعلق ہر بات ان ہی دو چیزوں سے ان ہی دو جذبوں سے پھوٹتی تھی' ان ہی دونوں جذبوں کا نتیجہ تھی' جب ہی اس نے ایک دوست کو ڈیڈیکیٹ کیے جانے والا سونگ مجھے ڈیڈیکیٹ کیا۔ مگر تم" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا "تم تو اس کے لیے پوری کائنات ہو ماہ نور! اس کی زندگی' جس کے ہونے کا احساس اسے جینے پر مجبور کرتا ہے۔"

"غلط کہہ رہی ہو تم سارہ۔" ماہ نور نے اس کی بات کاٹی "مجھ سے تو اس نے ہمیشہ پہلو تہی کی' مجھے تو ہمیشہ اس نے نظر انداز کیا' بتائے بغیر غائب ہوجاتا تھا۔ میرے جذبے کا اظہار میری باتوں میں ہوا اور وہ اس کا تمسخر اڑاتا رہا جیسے اس کے لیے وہ بہت معمولی سا جذبہ ہو' بے مول' چھوٹا' ناقابل اعتنا۔ اس کے لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔

"جب ہی وہ آخری بار مجھ سے ملاقات کے دوران اتنا غم زدہ تھا کہ تمہارے تذکرے پر اس نے جانتی ہو مجھ سے کیا کہا؟" سارہ نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "اس نے کہا "پلیز اس وقت مجھ سے اس کا ذکر مت کرو" اس وقت میں تعلقات کو پوری سچائی کے ساتھ نبھانے کے موڈ میں ہوں اور ماہ نور میرے سینے کے اندر بہت گہرائی میں گڑا ایک ایسا تعلق ہے جسے میں نے برتا ہے "نبھایا نہیں ہے" ان لفظوں پر غور کرو ماہ نور! تم اس کے سینے کے بہت اندر گہرائی میں گڑا تعلق ہو۔ غور کرو ماہ نور! تمہاری کیا سمجھ میں آتا ہے اس بات سے؟"

"گہرائی میں گڑا تعلق۔" ماہ نور نے الفاظ کو دہرایا۔ "یہ تعلق پچھتاوے کی پھانس اور ناپسندیدگی کی انی بھی تو ہوسکتا ہے' جسے اس نے برتا پسند کیا مگر نبھانا نہیں' جب ہی تو ہر بار بغیر کوئی اتا پتا دیے وہ میری زندگی سے اتنی آسانی سے غائب ہوجاتا رہا کہ اسے اس طرح غائب ہوجانے کا کوئی افسوس ہوا نہ دکھ یوں جیسے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا سو چھڑالیا۔"

"نہیں ماہ نور! تم غلط فہمی کا شکار ہورہی ہو۔" سارہ نے نرمی سے کہا "اس کے جانے کے بعد میں نے بہت دن اس کے اور اپنے تعلق کی نوعیت کا اندازہ لگانے میں گزار دیے میں نے اس کی خود سے کی باتیں یاد کیں "اس کی ایک ایک حرکت اور عمل جو میرے لیے تھا۔ اس نے جو گانے مجھے سنوائے ان کے الفاظ پر غور کیا اور میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مجھے سعد سے متعلق اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کے لیے میں صرف اس کی "انسان دوستی کا لگایا ہوا پودا" ہوں۔ ہاں مجھے خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیے کہ میں آدمیوں کی بستی میں موجود ایک ایسے انسان سے کسی بھی حیثیت میں سہی بہت قریب ہوں' جس کے قریب ہونے پر خوشی اور فخر محسوس کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ صرف ایک انسان نہیں بہت عظیم انسان ہے' میری اس مختصر زندگی کا عظیم ترین انسان۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ماہ کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ "میری بات مانو تو اسی طرح تم بھی اس کے اور اپنے تعلق کی نوعیت جاننے کی کوشش کرو۔ آنکھوں سے غصے اور بدگمانی کی عینک اتار کر اسے یاد کرو۔ اس کی باتیں' اس کا عمل' اس کی فیلنگز جو تمہارے ساتھ وابستہ تھیں' کوئی ایسا سونگ' کوئی ایسی بات جو اس نے خصوصاً "تمہیں سنائی ہو۔ کوئی ایسا لمحہ جب اس نے تم سے خالص اپنے دل کی کوئی بات کہی ہو۔

یاد کرو ماہ نور! یاد کرو۔"
سارہ کہہ رہی تھی اور ماہ نور سامنے پہاڑوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اب وہ سارہ کی بات نہیں سن رہی تھی اب اسے کچھ اور ہی سنائی دے رہا تھا۔ آوازیں 'الفاظ' انداز۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر اسے بہت کچھ نظر آرہا تھا' یکایک اسے بہت کچھ سنائی دے رہا تھا۔
"اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا کرو۔"
"انسان کو اپنی زندگی کے معاملات میں بہت شیور ہونا چاہیے۔"
کبھی چیزیں اتنی ویلیوایبل ہوتی ہیں کہ آپ ان کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے؟" اسے لفظ لفظ یاد آنے لگا تھا۔ وہ لفظ جو یقیناً "کبھی کسی اور سے نہیں کہے گئے تھے۔

"Her eyes her eyes
make the stars look like
they are not shining
Her hair her hair
falls perfectly without her trying
she's so beautiful
And I tell her everyday

ایک ایک کر کے الفاظ' باتیں' جملے اسے سب یاد آنے لگے تھے۔
"اتفاقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔"
"تم جانتی ہو ماہ نور! تم کتنی خوش قسمت ہو۔"
ماہ نور کا سر نفی میں آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ وہ کس چیز کی نفی کرنا چاہ رہی تھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔
IKnow I Know when I Compliment her
She won't beleive me And its so sad
that she dosn'tsee what I see
اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی' چند لمحوں کے اندر اندر اس نے ایک ایسی حقیقت کو پالیا تھا جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔

And when you smile
The whole world stops
and stares for a while
cause girl you are amazing
just the way you are
سارہ نے اسے وہ نکتہ بتایا تھا' جس کا ایک ایک لفظ اس اتنی بڑی حقیقت کو اس کی نظروں کے سامنے آشکار کر رہا تھا جو اس کی مٹھی میں بند تھی اور وہ اس سے بے خبر تھی۔
"سارہ! میں!" اس نے بمشکل ایک ادھوری بات کی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی کمرے کی میز پر رکھی گاڑی کی چابیاں اور اپنا سویٹر اٹھا کر گھر کے بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔

"سارہ! مجھے جلدی ہے' مجھے اچانک ایک بہت اہم کام یاد آگیا ہے۔ مجھے کسی کو کچھ بتانا ہے فوراً" ۔ ابھی۔"
اس نے دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے رک کر بلند آواز میں کہا اور گھر سے باہر نکل گئی۔
اس نے اتنی تیز ڈرائیونگ کبھی نہیں کی تھی' وہ راستہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا جو تنگ بھی تھا اور بل دار بھی۔ برف باری کے سین کو دیکھنے کے شوقین یہاں آنے والوں کی گاڑیوں کی ایک طویل قطار تھی جو بار بار اس کا راستہ روکتی اور اسے رک جانے پر مجبور کر رہی تھی۔
"مجھے سعد سلطان کہتے ہیں۔"
"آئی ایم سوری ماہ نور ہمیں ذرا لیٹ ہو گیا۔"
"کیا آپ یہ اسکیچ بیچنا چاہیں گی؟"
"میں اس کی منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"
"مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میرا دل لگ جائے۔"
"یارڈ اومی عشق آتش لائی ہے۔"
"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ؟"
"عشق!"
الفاظ' گاڑی چلانے' مجبوراً" رکنے' دوبارہ آگے بڑھنے' پھر رکنے کے دوران بھی اس کے اردگرد پھیل رہے تھے۔ آنسو بھل بھل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتی' دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ وہیل گھماتی آگے بڑھ رہی تھی۔
اسے بلال سلطان کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی' اسے انہیں کچھ بتانا تھا' ایک بہت ضروری بات جسے فوری طور پر انہیں بتانا بہت ضروری تھا۔

Yellow diamonds in the sky
Now we are standing side by sids
As your shadow crosses mire
what it takes to come alive
its the way i am feeling I just can't dry

we found love in a hopeless place

we found love in a hopeless place

الفاظ اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ اور اس کا دل اپنی عقل پر ماتم کرنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ بادل جسے وہ چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی جس کی برساتی پھوار میں بھیگنا چاہتی تھی وہ تو اس کے اپنے آسمان پر سجا اس کی کوتاہ نظری کا شکار ہوتا رہا تھا۔ الفاظ 'الفاظ کتنے سچے تھے اُسے محبت وہاں ملی تھی جہاں ملنے کی اسے کبھی بھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

گاڑی بل دار تنگ راستوں سے نکل کر ایک نسبتاً" کشادہ اور سیدھی سڑک پر پہنچ گئی تھی' مگر یہاں ٹریفک جام تھا اور گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ اس سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی کئی دکانیں تھیں اور دکانداروں کے علاوہ چند خریداروں کی موجودگی کے باعث قدرے رونق بھی اسے اپنے آگے موجود گاڑیوں کی قطار پر غصہ آنے لگا تھا۔ اسے پہنچنے کی جتنی جلدی تھی' اتنی ہی اس قطار کی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو' جتنی بار میں نے تم کو دیکھا ہے' اس سے بہت مختلف بہت اچھی۔"

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک ضرور بھیجوں گا۔"

"شاید میں خود کو یا اپنی فیلنگز کو بیان کرنے کا فن نہیں جانتا۔"

"نہیں تم جانتے تھے بہت اچھی طرح جانتے تھے' ایک میں ہی احمق' انجان اور بے خبر تھی۔" انتظار کی کوفت سے بے زار ہوتے ہوئے اس نے ہارن دبایا۔ "یہ سب کتنا عجیب اور ناممکن سا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں' مگر یہ سچ ہے کہ ایسا ہی ہے یہ اتنا ہی بڑا سچ ہے جتنا میرا یہاں ہونا' اگرچہ اس سے زیادہ عجیب اور ناممکن بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی' جب ہی تو مجھے یقین نہیں آرہا' ایسا کیسے ہو سکتا تھا' کیسے؟"

وہ مسلسل خود سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ گاڑیوں کے ہارن کا شور' لوگوں کی آوازیں' اور خود اس کے اپنے خیالات سب گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے۔

یہ دنیا اوٹ پٹانگا کتے ہتھ تے کتے ٹانگا
انھے لگڑی ونڈی بانگا ایدے چکدے پھٹے
یہ دنیا کھیل تماشا یہ تیری میری بھاشا
کنوں سمجھ بچ تن کے شوشا ایدے چکدے پھٹے

اس سارے شور ہنگامے میں کسی دکان پر چلتے ٹیپ ریکارڈر پر لگے گانے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اپنی گاڑی کے ہارن پر مستقل ہاتھ رکھ دیا۔

یہ دنیا مست قلندر تاں لگے بیٹھا بندر
تجھے آپ نوں سکندر ایدے چکدے پھٹے

گانے والا جیسے ماہ نور کے دل کی ساری کیفیت پر پھبتی کس رہا تھا۔ ماہ نور کا ہاتھ ہارن سے اٹھ نہیں رہا تھا۔ اسے جلد سے جلد بلال سلطان کے پاس پہنچنا تھا اور انہیں اس لڑکی کے بارے میں بتا کر جو سعد سلطان کی کوئین آف ہارٹ تھی' اس کی امانتیں وصول کرنا تھیں۔

یہ دنیا داری داری چکدے سارے تار تاری
توں کانوں بنیا بھکاری ایدے چکدے پھٹے

گانے والا اس سڑک کی تمام صورت حال سے بے خبر پوری آواز کے ساتھ چلا رہا تھا۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

دیبا شیرازی

رباب نے آخری برتن ریک میں رکھ کر کچن پر آخری نظر ڈالی۔ سارا کچن لش لش کر رہا تھا۔ پورے ایک گھنٹے کی محنت پل بھر میں وصول ہو گئی۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکل آئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ہر بات میں پرفیکٹ۔ گھر میں ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر ہو جاتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ اس کا گھر ہر وقت صاف ستھرا اور چمکتا دمکتا رہتا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ قرینے سے رکھی ہوئی۔ مجال ہے کبھی کسی چادر پہ سلوٹ نظر آئی ہو۔ ہمیشہ پہلے چادر کی شکنیں درست کرتی' پھر کمرے سے نکلتی۔ آنے جانے والے اس کے سلیقے کی مثالیں بیٹیوں کو دیتے۔

کچن سے مطمئن ہو کر وہ بیڈ روم میں آگئی۔ دروازہ کھولتے ہی اے سی کی ٹھنڈی اور ایئر فریشنر کی مسحور کن خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ یہ بیڈ روم کسی خواب نگر کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ کمرے کی دو آمنے سامنے دیواریں کاسنی رنگ کی جب کہ باقی دو ہلکے نارنجی رنگ میں رنگی تھیں۔

کمرے کے عین وسط میں لکڑی کا خوبصورت بیڈ رکھا تھا۔ جس پر کاسنی اور نارنجی امتزاج والی چادر بچھی تھی۔ بیڈ کی بائیں جانب دیوار میں کھڑکی نصب تھی جس پر خوبصورت پردے لٹکے تھے۔ کھڑکی کے سامنے دو نفیس صوفے رکھے تھے اور درمیان میں چھوٹی سی ٹیبل جس پہ سفید رنگ کے پھولوں کا گلدستہ سجا تھا۔ دائیں جانب ڈریسنگ ٹیبل اور پائینتی کی جانب تین دروازوں والی الماری رکھی تھی۔ کمرے میں جگہ جگہ خوبصورت پینٹنگز اور امپورٹڈ شو پیس اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔

وہ زیادہ امیر نہیں تھی۔ فیصل ایک سیلف میڈ آدمی تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ بچوں کی اسکولنگ' گھر کے اخراجات سے بچا بچا کر وہ کمیٹیاں ڈالتی اور جب پیسے ملتے تو گھر کو سجانے میں لگا دیتی۔ فیصل نے بھی کبھی اس بات پہ اعتراض نہیں کیا تھا۔ الٹا وہ اس کی حوصلہ افزائی ہی کرتا تھا۔ اس کے تعریفی کلمات رباب کو ایک نئی طاقت دیتے تھے اور وہ نئے سرے سے اپنے مشن میں جت جاتی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اپنا سیل فون اٹھایا اور ثمینہ کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف جلد ہی فون اٹھا لیا گیا۔

"کیسی ہو رباب؟" دوسری طرف سے ثمینہ کی شوخ سی آواز ابھری۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ' کیا کر رہی تھیں۔" رباب نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹانگیں سیدھی کیں تو ایک سکون کی لہر پورے وجود میں دوڑ گئی۔

"حمزہ کو فیڈر بنا کے دے رہی ہوں۔ ابھی ابھی کام سے فارغ ہوئی ہوں۔" ثمینہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"اچھا کام ہو گیا سارا۔" رباب نے سائیڈ ٹیبل سے مونگ پھلی کے کچھ دانے منہ میں ڈالے۔

"ہاں یار! آج تو لگتا تھا کام ختم ہی نہیں ہو گا۔ کل سے عامر کی خالہ مع اہل و عیال یہاں مقیم تھیں۔ آج صبح وہ لاہور کے لیے روانہ ہوئی ہیں۔ کھانا بنا کے میری تو کمر ہی دکھ گئی۔ گھر کے دوسرے کام الگ۔ بچوں کو اسکول کے لیے تیار کیا۔ عامر کو ناشتا کرا کے بھیجا۔ پھر مہمانوں کا پر تکلف ناشتا۔ وہ گئے ہیں تو صفائی شروع کی ہے۔ اتوار کی وجہ سے ماسی بھی نہیں آئی تھی۔ مرے پہ سو درے والی بات ہوئی میرے ساتھ۔" رباب توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی اور بیچ بیچ میں ہوں ہاں کرتی جا رہی تھی۔ بچے کے رونے کی آوازیں اب آنا بند ہو چکی تھیں۔ شاید وہ سو چکا تھا۔ ثمینہ چپ ہوئی تو وہ مطلب کی بات پر آگئی۔

"اچھا! تم کل ثروت باجی کے گھر چل رہی ہو نا؟ میں نے یہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں ۔۔۔ کتنا کہہ کے گئی تھیں بے چاری کہ میرے گھر آئیں کھانے پر۔ اب نہ جانا اچھا نہیں لگتا۔ آخر رشتہ داری ہے پرانی ان سے۔"

ثروت' رباب اور ثمینہ کی مشترکہ نانی کی بھانجی تھیں۔ ان کے میاں بینک میں مینجر تھے۔ عرصہ ہوا ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی دونوں کی۔ پچھلے مہینے اتفاق سے انہیں کسی شادی کے موقع پر ثروت باجی مل

گئیں۔ ان کی محبت اور خلوص سے دونوں ہی متاثر ہوئی تھیں۔ جاتے جاتے انہوں نے کھانے کی دعوت دی تو بہت مصروف ہونے کے باوجود وہ انکار نہ کر سکیں۔

"ہاں یار! میں خود بہت تھک گئی ہوں مسلسل ایک ہی روٹین سے۔ پے در پے اتنے مہمان بھگتائے ہیں کہ اب ہر بیل پر یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پھر کوئی نیا مہمان آگیا ہے۔ اچھا ہے، ہم بھی کسی کے مہمان بنیں تھوڑا موڈ چینج ہوگا۔" ثمینہ تو پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔

"اچھا تو پھر میں کل لینے آؤں نا تمہیں؟" رباب نے اپنی تسلی کی۔

"چلو ٹھیک ہے میں عامر سے بات کرکے بتاؤں گی۔ اوکے ٹیک کیئر۔"

"اللہ حافظ۔" فون رکھ کر اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

"فیصل آتے ہی ہوں گے۔" وہ جلدی' جلدی اٹھی۔ چادر کھینچ کے درست کی اور کچن میں آگئی۔ فریج سے سالن نکال کر اوون میں رکھا اور آٹا نکال کر جلدی جلدی پیڑے بنانے لگی۔ ساتھ' ساتھ ایک چولہے پر چاول ابالنے کے لیے رکھ دیے۔ دونوں بچے اور خود وہ چاول شوق سے کھاتے تھے جب کہ فیصل روٹی پسند کرتے تھے۔ بچے بھی ٹیوشن سے آنے ہی والے تھے آتے ہی کھانے کا شور مچنے والا تھا۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلانے لگی۔

☼ ☼ ☼

رباب نے تیار ہو کر آخری مرتبہ آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا۔ اس کی ڈریسنگ سے لے کر جیولری اور میک اپ تک ہر چیز میں نفاست جھلک رہی تھی۔ اس نے بیگ اٹھایا' دوپٹا سر پر لیا۔ گھر پر آخری نظر ڈالی۔ پنکھے لائٹیں بند تھیں۔ وہ چابیاں لے کر باہر آگئی۔

ثمینہ کا فلیٹ قریب ہی تھا۔ پہلے اسے ثمینہ کو لینا تھا۔ بچوں کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ وہ دونوں اطمینان سے وہاں بیٹھ سکتی تھیں۔ ثمینہ پہلے ہی گیٹ سے نکل کر کھڑی تھی۔ رباب نے رکشا روکا۔

"اف۔ تھینکس گاڈ۔" ثمینہ نے سکون کی سانس لے کر بیٹھتے ہوئے بیگ رباب کی گود میں پھینکا اور خود سانس درست کرنے لگی۔ رباب حیرت سے اس کی حرکات دیکھ رہی تھی۔

"ہوا کیا ہے؟ تم تو ایسے آرہی تھیں جیسے کوئی پیچھے ہی پڑا ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آئی ہوں۔" ثمینہ نے اس کے تجسس کو ہوا دی۔

"کون پیچھے پڑا تھا۔ کس سے جان بچا کے آئی ہو؟ کیا اول فول بک رہی ہو۔" رباب اور الجھی۔

"یار! وہ حمیرا آپی ہیں نا ملیر والی۔" رباب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ آج اپنی بیٹی سے ملنے آرہی تھیں۔ یہاں جو سامنے بینگلوز بنے ہوئے ہیں' عائشہ یہاں شفٹ ہوئی ہے۔ ابھی پچھلے مہینے۔" وہ رکی۔

"تو؟" رباب بے تاب تھی سارا قصہ سننے کو۔

"تو انہوں نے مجھے فون کرکے کہا" کہ میں آدھے گھنٹے میں تمہاری طرف آرہی ہوں' یہاں آئی ہوں تو سوچا تم سے ملتی جاؤں۔" میں نے جھٹ کہہ دیا کہ میں رباب کے گھر ہوں۔ انہیں بہت افسوس ہوا کہ مجھ سے ملنے سے رہ گئیں اور میں نے شکر کیا کہ جان بچ گئی۔ بڑی مشکل سے عامر سے آج کے لیے اجازت لی ہے' وہ اتنی دور کی رشتے داریاں نبھانے کے بالکل حق میں نہیں ہیں۔ وہ بھی بیوی کے میکے کی طرف سے۔" ثمینہ بلا تکان بولے گئی۔

"تمہیں بہت شوق ہے نا ہر وقت مہمان نوازی کا' پتا نہیں کس کس کو بلا رہی ہوتی ہو۔ رشتے دار تو ایک طرف پڑوسی اور ان کے رشتے داروں سے بھی پینگیں بڑھانے میں لگی رہتی ہو۔ اب جب اتنا بڑا حلقہ احباب ہوگا تو مہمان تو آئیں گے نا۔" رباب نے الٹا اسے ہی لتاڑا۔

"اچھا۔ اب بس کرو میں ریلیکس ہونے کے لیے نکلی ہوں تمہاری نصیحتیں سننے کے لیے نہیں۔ پہلے ہی بہت [illegible]"

رباب نے رکشا سے اتر کر اطراف سے گھر کا جائزہ لیا۔ کافی خوبصورت اور بڑا گھر تھا۔

"لگتا ہے اب کافی خوش حالی آگئی ہے ثروت باجی کے گھر۔"

گھر پہلے سے کافی مختلف لگ رہا تھا جب انہوں نے دیکھا تھا تب یہ سنگل اسٹوری گھر ہوا کرتا تھا۔ اور آس پاس بھی ویسے ہی عام سے گھر بنے ہوئے تھے۔ لیکن اب تو یہ علاقہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ دروازہ ایک چودہ پندرہ سال کے لڑکے نے کھولا۔

"ثروت باجی ہیں گھر پر؟" رباب نے تصدیق کرنی چاہی' انہیں کافی عرصہ ہو گیا تھا یہاں آئے۔

"جی۔ آپ اندر آئیں۔" لڑکا انہیں لے کر اندر کی طرف بڑھا۔

لاؤنج میں گھستے ہی جو پہلا منظر انہوں نے دیکھا وہ کافی عجیب و غریب تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے دیوار میں فش ایکوریم نصب تھا اور عین اس کے نیچے ایک جہازی سائز مٹکا دھرا تھا جس کے نچلے حصے میں نل نصب تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' جیسے کوئی بات نوٹس کرائی ہو۔ لیکن یہ ایک چیز نہیں تھی وہاں اور بھی عجائبات پڑے تھے۔ جو کسی صورت اس عالیشان گھر سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ لاؤنج کے وسط میں پڑا صوفہ سیٹ سفید چادروں سے ڈھکا ہوا تھا کیوں۔ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک طرف تخت پر دو آڑے ترچھے گاؤ تکیے پڑے تھے۔ وہ تھوڑا آگے بڑھیں۔

کچن کے ساتھ دیوار سے لگی ایک درمیانے سائز کی ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی۔ جو مختلف سبزیوں' پرانے اخبارات' میگزین' مسالوں کے خالی پیکٹ' مختلف ٹیبھز' جائے نماز اور پتا نہیں کس کس چیز سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کرسیاں تھیں تو اس کے گرد کرسیاں نہیں تھیں۔

رباب کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ثمینہ نے اسے ٹھوکا دیا۔ ثروت باجی پسینے میں شرابور کچن سے سیدھی ان ہی کی طرف آرہی تھیں۔ رباب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ یقیناً" اسے گلے لگانے والی تھیں۔ اس سے پہلے کہ رباب کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھتی ثمینہ نے بڑے پرجوش اور والہانہ انداز میں ثروت باجی کو گلے لگایا۔

"ہائے اللہ! کیسی ہیں ثروت باجی! کتنے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔" ثروت باجی تو نہال ہو گئیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم لوگوں نے ہی بھلا دیا۔ ایک ہی شہر میں رہ کر اتنا عرصہ نہ ملیں تو دکھ ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا اپنی آنکھوں پر کہ تم دونوں میرے گھر آئی ہو۔"

وہ باتوں میں اتنا گم ہوئیں کہ انہیں دھیان ہی نہیں گیا کہ رباب ان سے کتنا اوپری سا ملی تھی۔ وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر بیڈ روم کی طرف آگئیں جہاں ان دونوں کی پہلی نظر بیڈ پر پڑی تھی جس کی چادر آدھی بیڈ پر پڑی تھی اور آدھی نیچے لٹک رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی وہاں پر کشتی لڑی گئی ہو۔

ثروت باجی جلدی جلدی آگے بڑھیں اور چادر ٹھیک کرنے لگیں۔

"رہنے دیں آپا! ہم کر لیتے ہیں۔"

ثمینہ نے آگے بڑھ کر مدد کرنی چاہی۔ وہ بھی اس کی دیکھا دیکھی ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ پورے کمرے کا حشر نشر ہوا ہوا تھا۔ سارا کمرا سامان سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ الماری کے اوپر دو تین سوٹ کیس رکھے تھے۔ سوٹ کیسز کے اوپر جائے نماز اور فائلوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ الماری کے ساتھ ہی ٹیبل رکھی تھی۔ جس کے اوپر میلے کپڑے' بچوں کی کتابیں' بیڈمنٹن کے ریکٹ' اخبار۔ ٹوٹا ہوا ٹی وی سیٹ جو ایک کونے میں دیوار میں منہ دیے پڑا تھا۔ ایک پرانا گل دان' جس میں سے تمام پھول غائب تھے مسی ڈیز کا انبار' چابیوں کے گچھے جرابیں' میلا تولیہ۔ ان تمام چیزوں میں ایک ہی کار آمد چیز تھی اور وہ تھی لیمپ ٹاپ جو ٹیبل کے ایک کونے

میں پڑا اس سارے کچرے کو گھور تا انگشت بدنداں تھا۔ ثمینہ نے اس کو کہنی ماری۔

"کیا ہے؟" وہ غرائی "آواز نیچی تھی۔

"ایسے کیا گھور گھور کے دیکھ رہی ہو۔ کیا سوچیں گی ثروت باجی؟" ثمینہ نے اس کی توجہ چادر ٹھیک کرتی ثروت باجی کی طرف دلائی تو وہ سنبھل گئی۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں ابھی آئی۔" ثروت باجی چادر درست کرکے پلٹیں اور انہیں بیٹھنے کا کہہ کر باہر جانے لگیں۔

"پلیز آپا! کوئی تکلف مت کیجئے گا' ہم بس آپ سے ملنے آئے ہیں۔" رباب نے رسماً انہیں تکلف سے روکا۔

"ارے! تکلف کی کیا بات ہے۔ اور میں تم لوگوں کو ایسے تھوڑی جانے دوں گی' اتنے دنوں کے بعد آئے ہو۔ کھانا کھا کر جانا پڑے گا۔ تم لوگ بیٹھو میں بس آرہی ہوں۔" ان کے جانے کے بعد رباب جو اتنی دیر سے ضبط کیے بیٹھی تھی' ایک دم پھٹ پڑی۔

"اوہ مائی گاڈ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کوئی اتنا پھوہڑ ہوسکتا ہے۔ جتنی ثروت باجی ہیں۔"

"شی۔ شی۔ آہستہ بولو' وہ سن لیں گی۔" ثمینہ گھبرا کر بولی۔

"ارے نہیں سن رہیں۔ وہ کچن میں گئی ہیں اور کچن یہاں سے کافی دور ہے۔" رباب نے بے پروائی سے کہا۔

"وہ دیکھو! یہ کوئی جگہ ہے کپڑے ٹانگنے کی۔" رباب نے اس کی توجہ ایک کونے میں بنے وارڈ روب کی جانب دلائی۔ جہاں ایک کونے میں دو پاپ فٹ تھے' اور ان میں ڈھیروں ہینگرز میں کپڑے لٹک رہے تھے اور عین ان کے نیچے نئے پرانے جوتوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ مزید سہولت کے لیے پالش اور برش بھی وہیں رکھ دیے گئے تھے۔ رباب نے جھرجھری لی۔

"اف! میں تو کبھی تصور بھی نہیں کرسکتی اپنے گھر میں اتنی بے ترتیبی کا۔ یہ عورت سانس کیسے لیتی ہے یہاں۔"

"تم نے نیشنل جیو گرافک پر وہ پروگرام دیکھا تھا جس میں لوگوں کو پرانا سامان جمع کرنے کی بیماری ہوتی ہے اور وہ اپنا کمرہ اور پورا گھر غیر ضروری سامان سے بھر لیتے ہیں اور ایک بھی چیز پھینکنے کو تیار نہیں ہوتے۔" ثمینہ نے ایک نئے پہلو کی جانب اس کی توجہ دلائی۔

"تو تمہارے خیال میں ثروت باجی کو بھی وہی بیماری ہے؟" رباب بے یقینی سے بولی۔

"علامات تو ساری وہی ہیں۔ ورنہ ایک اتنے بڑے بنگلے میں رہنے والی خاتون جو تین چار نوکر بھی افورڈ کرسکتی ہیں۔ اتنی گندگی میں کیوں رہیں گی۔" ثمینہ پر یقین تھی۔

"ہوسکتا ہے' انہیں یہ سب کام کی چیزیں لگتی ہوں اور اپنی سستی کی وجہ سے سب کچھ کمرے میں رکھ دیا ہو تاکہ زیادہ تردد نہ کرنا پڑے۔" رباب کی بات ثمینہ نے بیچ میں ہی کاٹ دی۔

"یہ کریموں کی خالی ڈبیاں یا پھٹے پرانے بدرنگ ہینڈ بیگ' جو بوسیدہ ہو کر اکڑ گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ان کے کام کی ہوسکتی ہے بھلا ——— یہ چیزیں ان کے کام کی ہوں یا نہ ہوں۔ انہیں کسی مناسب جگہ پر رکھا جاسکتا ہے۔ تم مانو یا مانو' وہ ایک پھوہڑ اور بدسلیقہ عورت ہیں۔ اب تم اسے کسی بیماری کا نام دو یا کسی اور خوبصورت کوڈ میں چھپاؤ۔ بہرحال میں تو انہیں پھوہڑ پن ہی کہوں گی۔"

رباب نے دو ٹوک بات کرکے ثروت باجی کو پھوہڑ پن کا سرٹیفکیٹ جاری کردیا۔ اسی وقت ثروت باجی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں شربت کے دو گلاس تھے۔ کنجوسی کا ایک اور مظاہرہ۔ آج کل بھلا کون مہمانوں کو شربت پلاتا ہے۔

"کولڈ ڈرنک ہی لے آتیں۔" رباب نے سوچا۔

"میں نے دیر تو نہیں کی۔ تم لوگ بور ہو گئی ہوگی اکیلی بیٹھی بیٹھی۔" وہ معذرت کرنے لگیں۔

"ارے نہیں بالکل نہیں۔" ثمینہ نے شربت کا پہلا گھونٹ لیا جس میں آدھے سے زیادہ چینی گھلی ہوئی تھی۔

"اب چینی گھولنے میں اتنا ٹائم تو لگنا تھا نا۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"کیا کروں' سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ لڑکا ہے تو سہی کام کے لیکن وہ ہی حال ہے' مال مفت دل بے رحم' ایک چیز کی جگہ دس استعمال کرتا ہے' چینی' پتی' دودھ' آئل' ہر چیز کو تباہ کررہا ہے۔ مہینے بھر کا راشن دنوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ سر پہ کھڑے ہو کر کام کرواتی ہوں تو بہانے بہانے سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب کل ہی کی بات ہے۔ جب میں اس سے کھانا بنوا رہی تھی تو مجھ سے کہا۔ "آپا! باتھ روم سے ہو کر آتا ہوں۔" آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ جب آکر دیکھا تو علی کے موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔"

وہ افسوس سے بتانے لگیں۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت اچھا کٹ گیا۔ کھانا لگا دیا گیا تھا۔ کھانے کا مینو ایک مرتبہ پھر انہیں چونکا گیا تھا۔

"یہ پائے میں نے کل بنائے تھے۔ سوچا تمہیں پسند آئیں گے اسی لیے گرم کرلیے۔" جنہیں وہ پائے کہہ رہی تھیں' وہ ہرگز پائے نہیں تھے۔ پیلے سے شوربے میں دو تین ہڈیاں تیر رہی تھیں۔ گوشت کا تو شاید کل ہی صفایا ہوگیا تھا۔ بریانی کی ٹرے میں چاول ہی چاول تھے اور اوپر دو تین بوٹیاں رکھی تھیں۔ ایک برتن میں ساگ تھا اور ایک پیالہ چکن کے کوفتوں کا تھا جس میں چکن اور آلو پیس کر کوفتے بنائے گئے تھے اور شوربے میں بھی آلو کے ٹکڑے ڈلے ہوئے تھے یہ چکن کم آلو کے کوفتے زیادہ کہے جاسکتے تھے۔ یہ تھی ان کی کل دعوت۔ جو بڑے اصرار سے کی گئی تھی۔

"ثروت باجی کو کچھ تو اہتمام کرنا چاہیے تھا۔ آخر پہلی مرتبہ آئے ہیں ان کے گھر۔" ثمینہ سے رہا نہ گیا تو بول پڑی۔ ثروت باجی پانی پینے گئی تھیں۔ رباب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"چپ کرکے کھاؤ اور شرافت سے گھر چلو۔ ثروت باجی اور کون سی بات سیدھی تھی جو تم ان سے کسی اچھی دعوت کی توقع کررہی تھیں مجھے تو گھر کا حال دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ دعوت حسب حال ہوگی۔"

رباب نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے چند نوالے ہی کھائے تھے۔ ثروت باجی آئیں تو وہ دونوں جانے کو تیار تھیں۔

"اچھا باجی! اب اجازت دیجئے بچے اسکول سے آنے والے ہوں گے۔" رباب اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بھئی! اتنی جلدی کیا ہے ابھی صرف ایک بجا ہے۔ بچے بھی آہی جائیں گے۔ تھوڑی دیر تو بیٹھو۔" وہ اصرار کرنے لگیں۔

"ضرور بیٹھتے لیکن گھر جاکر میاں اور بچوں کے لیے کھانا بھی بنانا ہے۔ گھر بھی بکھرا پڑا ہے۔ عامر آجائیں گے تو ناراض ہوں گے۔ انہیں خواہ مخواہ باتیں سنانے کا موقع مل جائے گا۔" ثمینہ نے مجبوری بتائی تو انہیں بھی ہار ماننا پڑی۔

"اچھا بھئی! جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم یہاں آئیں۔ میرا دل خوش کردیا۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔

"ارے یہ تو آپ کی محبت ہے۔ اب آپ کی باری ہے' آپ بھی آئیں کسی دن میرے گھر کھانے پر۔" ثمینہ نے خلوص دل سے دعوت دی۔ رباب ایک لفظ نہ بولی۔

وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلیں رباب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یہ تمہیں کیا شوق رہتا ہے ہر کسی سے دوستی بڑھانے کا؟ بس مل لیا نا ان سے۔ ہوگیا شوق پورا۔ اب انہیں گھر کیوں بلالیا؟" رباب کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اس کی یہ حرکت۔

"رباب! ہم ان کے گھر کھانا کھا کر آئے ہیں۔ کیا یہ اچھا لگتا کہ ایسے ہی کھا پی کر واپس آجاتے؟ انہیں دعوت تو دینی چاہیے تھی نا۔" ثمینہ کو رباب کا ثروت باجی کے بارے میں یوں بولنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"دوستی کے لیے کچھ تو دیکھنا ہی پڑتا ہے' کم از کم مزاج تو ملنے چاہئیں۔" رباب اپنی بات پر اڑی تھی۔

"دوستی کی بات نہیں وہ رشتہ دار ہیں ہماری اور جب وہ اتنے خلوص سے مل رہی ہیں تو ہمیں قدر کرنی

چاہیے ان کی۔"

"خلوص۔ خلوص ہمیں کیا ان کے خلوص کو گھول کے پینا ہے۔" رباب چڑ گئی۔

"بس کرو رباب! تم ہمیشہ لوگوں کو اپنے معیار پہ کیوں پرکھتی ہو۔ تم ہر طرف صرف رباب ہی رباب کیوں ڈھونڈتی رہتی ہو۔ ہر کوئی تمہاری طرح پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں عام لوگ بھی رہتے ہیں میرے جیسے انہیں ان کے معیار کے مطابق زندگی گزارنے دو۔ تمہارے نزدیک جو تم جیسا ہے' وہ اچھا ہے جو تم سے مختلف ہے وہ برا ہے۔ تمہیں شاید ان کے خلوص کی قدر نہ ہو' مجھے ہے۔ میں ان سے تعلق رکھوں گی۔ اب چاہے تمہیں اچھا لگے یا برا۔"

بجائے اس کے کہ رباب اسے سمجھنے کی کوشش کرتی اس نے ثمینہ کی باتوں کو کسی اور معنوں میں لیا۔

"تم میری دوست ہو کر ثروت باجی کو مجھ پہ فوقیت دے رہی ہو۔ بس اتنی سی دوستی تھی ہماری جاؤ جا کر اپنی نئی دوست کو گلے لگاؤ۔" وہ غصے سے کہتی مین روڈ پہ چلی گئی۔ ایک رکشا اس کے قریب آ کر رکا۔

"رکو رباب! میری بات تو سنو۔" ثمینہ اس کے پیچھے بھاگی۔

رباب تب تک رکشا میں بیٹھ چکی تھی۔

پورا رستہ وہ دونوں خاموش ہی رہیں۔ رباب تو ناراض ہی تھی ثمینہ کا موڈ بھی سخت خراب ہو چکا تھا۔ وہ اپنے گیٹ پر اتری تو رباب خدا حافظ کہے بغیر چلی گئی۔ وہ جو موڈ بدلنے کے لیے گھر سے نکلی تھی سخت بے زاری کے عالم میں گھر لوٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ جب سے ثروت باجی کے گھر سے آئی تھی' جلے پیر کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹنے میں مصروف تھی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ثمینہ یہ سب کہہ سکتی تھی۔ ثمینہ اس کے بچپن کی دوست اور کزن تھی۔ اپنی تنگ مزاجی کی وجہ سے رباب اب تک بہت کم دوست بنا پائی تھی۔ جن میں سرفہرست ثمینہ کا نام آتا تھا اور اس دوستی کو چلانے میں ثمینہ کی نرم مزاجی اور سلجھی ہوئی طبیعت کا بڑا ہاتھ تھا۔

عام طور پر ایسے کسی موقع پر ثمینہ بغیر کسی بحث کے ہار مان لیتی تھی اور اس کے اس رویے کی وجہ سے رباب کی خود پسندی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ جو کچھ کہتی ہے وہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔

لیکن ثمینہ کے آج کے رویے نے اسے عجیب احساس سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ آج اسے آئینہ دکھا کر گئی تھی۔

رباب پورے گھر میں ادھر سے ادھر بے مقصد گھوم رہی تھی۔ لاشعوری طور پر شاید اسے ثمینہ کے فون کا ہی انتظار تھا کہ اب وہ فون کرے گی اور اپنی غلطی کی معافی مانگے گی' لیکن تین دن گزر جانے کے بعد بھی ادھر سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔

اس کی الجھن میں اضافہ ہونے لگا۔ گھر کے کاموں سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ کل سے اسے سر درد اور ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

آج صبح سے وہ بستر سے نہیں نکلی تھی۔ ناشتا فیصل نے بنایا تھا۔ بچے اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ خود تیار ہو سکیں۔ تھوڑی بہت مدد فیصل نے کروا دی۔ انہیں اسکول بھیج کے وہ اس کے لیے بھی ناشتا لے آیا۔

رباب کے "نہ نہ" کرتے بھی اسے زبردستی ناشتا کرایا اور دودھ کے ساتھ ٹیبلٹ بھی کھلا دی۔ وہ تیار ہو کر اس کی طرف آیا۔

"او کے جان! اب میں چلتا ہوں' گھبرانا مت' منظوراں بس آنے ہی والی ہو گی۔ کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھے فون کر دینا۔" فیصل چلا گیا۔ نو بجنے والے تھے۔ آج بھی اس کی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔

"یہ منظوراں پتا نہیں کہاں مر گئی ہے۔ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ اگر آج نہ آئی تو سارا کام پڑا رہ جائے گا۔ کل پھر چھٹی ہے۔ ایک دن نہیں آئی تو اتنا نہیں ہوا کہ چھٹی والے دن چلی آئے۔ بالکل احساس نہیں ہے اسے۔ طبیعت کچھ ٹھیک ہوتی تو خود ہی کر لیتی۔

لیکن آج تو اٹھا بھی نہیں جا رہا۔" تھک کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ پتا ہی نہ چلا کب نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس کی آنکھ بیل کی آواز پر کھلی۔ وال کلاک پر نظر ڈالی تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"دو بج گئے۔ میں اتنی دیر سوتی رہی ہوں۔" اس نے جلدی' جلدی چپل پاؤں میں اڑسے اور بالوں کو سمیٹتی دروازے کی طرف بڑھی۔

"کون۔۔؟" حالات کی وجہ سے وہ پوچھے بغیر دروازہ نہیں کھولتی تھی۔

"میں ہوں فیصل۔ دروازہ کھولو۔" فیصل کی آواز سن کر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گیا۔

"ماسی نہیں آئی؟" فیصل نے بریف کیس رکھ کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔

"نہیں۔ آج چھٹی کی ہے۔ کھانا بھی نہیں بنا۔ منظوراں آتی تو اسی سے بنوا لیتی۔" وہ فیصل کے ساتھ ساتھ کمرے میں آ گئی۔

"میں لے کر آتا ہوں کچھ۔ تم کیا کھاؤ گی؟" فیصل نے والٹ میں پیسے چیک کیے۔ پھر اسے اپنی جیب میں رکھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ اپنے اور بچوں کے لیے کچھ لے آئیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ کچن میں چلی آئی۔ چائے کے لیے پتیلی چڑھائی اور خود برتن سمیٹنے لگی۔ سارے گندے برتن ایک طرف کیے اور سلیب صاف کر دی۔

اسی وقت فیصل نے آواز دی تو وہ کچن کو وہیں چھوڑ کر جلدی جلدی باہر آ گئی۔

"آپ نے بلایا؟" وہ گیلے ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتی ہوئی بولی۔

"ارحم آنکھیں نہیں کھول رہا۔ بخار بھی تیز ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ تم میرا والٹ اور گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔" وہ ارحم کو گود میں اٹھاتا اسے جلدی جلدی ہدایات دینے لگا۔

رباب کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ بچوں کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ ان کی تھوڑی سی بھی تکلیف پہ وہ گھبرا جاتی تھی۔ اس کی زرد پڑتی رنگت دیکھ کر فیصل ایک لمحے کو رکا۔

"کچھ نہیں ہو گا اسے' سنبھالو خود کو۔"

"جی!" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ آنسوؤں میں اس کی آواز رندھ گئی۔

وہ سامان لے کر نیچے اتری۔ فیصل اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ راستے سے اس نے نعمان کو فون کر دیا کہ معیز گھر میں اکیلا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔

ارحم بار' بار الٹیاں کر رہا تھا۔ رباب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خدا خدا کر کے اسپتال آیا۔

ڈاکٹر نے فوڈ پوائزن بتایا۔ ارحم کو ڈرپ چڑھا دی گئی۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی ساتھ بیٹھی رہی۔ فیصل انجکشن لینے اسٹور تک گیا تھا۔ ڈرپ ختم ہونے میں ابھی ٹائم باقی تھا۔ رباب نے گھڑی پر نظر دوڑائی گیارہ بجنے والے تھے۔ وہ شام سات بجے سے یہاں تھے۔

رات کے چار بجے وہ گھر لوٹے تھے۔ نیند اور تھکن سے برا حال تھا۔ فیصل کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ارحم کو آرام سے لٹایا اور خود بھی وہیں لیٹ گیا۔ رباب بیگ اور چادر الماری میں رکھ کر پلٹی تو فیصل نے بلا لیا۔

"اب تم بھی سو جاؤ۔ باقی کا کام کل کر لینا۔" اور کوئی وقت ہوتا تو وہ گھر کو سمیٹے بغیر ہرگز نہ سوتی' لیکن آج اس کی اپنی حالت خراب تھی۔ سو چپ چاپ سو گئی۔

☆ ☆ ☆

صبح اس کی آنکھ تھوڑی دیر سے کھلی تھی۔ فیصل ابھی تک سو رہا تھا۔

"دس بج گئے۔ ماسی پتا نہیں کیوں نہیں آئی۔"

اگلے ہی پل ذہن میں جھماکا ہوا۔ آج تو ماسی کی چھٹی تھی۔ ایک ناگوار احساس نے اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ چھٹی کا دن۔ میاں اور بچے گھر پر ہیں' کام کا انبار۔ ایسے میں ماسی کی چھٹی اسے بڑی کھلتی تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی بیل بجی اس نے بے دلی سے "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف رخسانہ تھی۔ اس کی اسکول فیلو۔ اس نے آنے کا مژدہ سنایا۔ وہ ملتان سے کراچی آرہی ہے اور ایک بجے تک اس کے گھر پہنچ رہی ہے۔

رباب کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ گھر کا حشر خراب تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پہ نہیں تھی۔ بارہ ایک بجے کا مطلب صاف تھا' وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جائے گی۔

"کیا کروں۔" اس نے جلدی جلدی فیصل کو اٹھایا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا سامان لینے چلا گیا۔

رباب نے ڈرائنگ روم کی طرف دوڑ لگائی۔ جہاں بچوں نے کل اس کی بیماری کا فائدہ اٹھا کر کشنز سے لڑائی لڑی تھی۔ ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ سارے کشن ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک چھوٹے سے کشن سے روئی باہر لٹک رہی تھی۔ سارے شوپیس' کونوں' کھدروں میں پڑے تھے۔ انہیں اٹھانے وہ آگے بڑھی تو کوئی نوک دار چیز اس کے پاؤں کو کاٹتی چلی گئی۔

"سی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں پاؤں دبائے بیٹھتی چلی گئی۔ نیچے نظر پڑتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کا پیارا سا کرسٹل کا سفید پروں والا گھوڑا ٹکڑوں میں بٹا پڑا تھا۔ اس نے پاؤں سے شیشے کا ٹکڑا نکالا اور لنگڑاتی بینڈیج لینے چلی گئی۔

جب تک رخسانہ آئی تب تک وہ ڈرائنگ روم صاف کر چکی تھی۔ فرائیڈ رائس اور قورمہ تیار کرلیا تھا۔ روٹیاں بازار سے منگوائی تھیں۔ اب صرف کباب تلنے باقی تھے۔ اسے کپڑے بدلنے کا ٹائم بھی نہیں ملا تھا۔

ڈرائنگ روم کے علاوہ باقی سارا گھر ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ معیز اور ارحم بھی کل کے میلے کپڑوں میں کمپیوٹر پر گیم کھیل رہے تھے جنہیں وہ سختی سے ڈرائنگ روم میں آنے سے منع کر آئی تھی۔

وہ خود شرمندہ شرمندہ سی کولڈ رنک لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ خوشبوؤں میں بسی بجی سجائی رخسانہ کے سامنے وہ خود کو بھنگن تصور کر رہی تھی۔ اسے احساس تھا۔ اس وقت اس سے کون سی مہک اٹھ رہی ہوگی۔ اس لیے وہ رخسانہ سے تھوڑا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ سجی تھی۔

رخسانہ کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ باتوں' باتوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ اسکول کے زمانے کے قصے وہ ہنس ہنس کے اپنے میاں اور فیصل کو سنا رہی تھی۔

رباب سے مسکرایا بھی نہیں جارہا تھا۔ اس کی اپنی سوچیں ہی اسے تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ وہ جتنی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لیتی تھی' ہر بات پہ نکتہ چینی کرتی تھی' آج جب اپنی باری آئی تو سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اگر وہ عام انسانوں کی طرح سوچتی تو اپنی دوست کو تمام صورت حال سے آگاہ کرسکتی تھی۔ اس کا بچہ بیمار تھا۔ ماسی چھٹی پر تھی وغیرہ وغیرہ تو شاید رخسانہ اس کی کوئی ہیلپ بھی کروادیتی۔ لیکن اس کی انا آڑے آرہی تھی۔ وہ انا جس کے ہاتھوں اس نے اپنی مخلص دوست کھوئی تھی۔

"رباب! بھئی کھانا لگاؤ' بہت دیر ہوگئی ہے۔" فیصل نے اسے یاد دلایا۔ وہ اٹھنے لگی تو رخسانہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو' میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ کھانا نکالنے میں تمہاری مدد کروں گی۔ ویسے بھی یہاں مردوں میں بیٹھ کر مجھے بور ہی ہونا ہے۔"

"ارے نہیں! تم بیٹھو' میں بس پانچ منٹ میں آئی۔ سب کچھ تیار ہے۔" وہ گھبرا اٹھی۔ گھر کا حشر خراب تھا۔ کچن میں میلے برتنوں کا انبار پڑا تھا۔ معیز اور ارحم بھی تیار نہیں تھے۔ اب تک جو جان مار کر رخسانہ کے سامنے بھرم بنایا تھا۔ وہ پل بھر میں زمین

بوس ہونے والا تھا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے فیصل کو دیکھا۔ اس نے شانے اچکا دیے۔ جیسے یہ تمہارا مسئلہ ہے' خود ہینڈل کرو۔

"تم تو ایسے تکلف کر رہی ہو جیسے میں کوئی اجنبی ہوں' بھول گئی ہو۔ بچپن میں دونوں ایک ہی پلیٹ سے کھانا کھاتے تھے اور ایک ہی رضائی میں سوتے تھے اور ساری' ساری رات باتوں میں کٹ جاتی تھی۔" رخسانہ آج کچھ زیادہ ہی نوسٹیلجیا کا شکار ہو رہی تھی۔ مروتاً کیا نہ کرتی۔ رباب کو ہار ماننا پڑی۔

خوش قسمتی سے کچن اور ڈرائنگ روم کا دروازہ ساتھ ساتھ تھا۔ باقی گھر پہ نظر نہیں پڑتی تھی۔

وہ دونوں کچن میں آئیں۔ رخسانہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

"واہ بھئی! کچن تو بہت پیارا بنایا ہے تم نے۔ یہ تمہارا آئیڈیا تھا یا فیصل بھائی اتنے باذوق ہیں؟" رخسانہ کچن میں لگے مہنگے کیبنٹس اور خوب صورت ٹائلز کو سراہے بنا نہ رہ سکی۔ رباب کے جلتے دل پر ٹھنڈے پانی کی پھوار برسی۔

"یہ سارا میرا آئیڈیا ہے۔ میں نیٹ پہ سرچ کرتی ہوں۔ پھر جو اچھا لگتا ہے ویسا بنوائی ہوں۔ فیصل کو ان باتوں میں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بس سراہتے ہیں' یہی بہت ہے۔" رباب فخریہ بتانے لگی۔

"ہم م م۔ پھر تو تمہارا پورا گھر دیکھنا پڑے گا۔ بھئی میں تو فین ہوگئی تمہاری۔" رخسانہ نے گویا اس کے سر پہ بم پھوڑا ہو۔

اسے بھی آج ہی آنا تھا۔ وہ بھی بغیر اطلاع دیے۔ ایک آدھ گھنٹے کی اطلاع کو وہ گنتی میں نہیں لارہی تھی۔ اتنے وقت میں یا تو بندہ گھر صاف کرسکتا ہے یا کھانا پکا سکتا ہے یا پھر اپنا حلیہ درست کرسکتا ہے۔

"پہلے کھانا لگاتے ہیں۔ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ پھر گھر دکھاتی ہوں۔" رباب کو خود پر رحم آنے لگا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد کروں۔" وہ آگے بڑھی۔

"ہاں ضرور۔ تم یہ برتن اندر رکھ کر آؤ۔ جب تک میں کباب تل لوں۔" رباب نے مصیبت ٹلنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔ کھانے کے بعد اسے رخسانہ کو گھر دکھانا تھا۔

"اللہ کرے رخسانہ بھول جائے کہ اسے گھر بھی دکھنا تھا۔" وہ دعائیں کرنے لگی۔

اس وقت رباب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب کھانا کھاتے ہی رخسانہ کے شوہر نے واپسی کا اعلان کردیا۔ اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ وہ معذرت کرتا بیوی کو لے کر چلا گیا۔ رباب کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ اللہ نے اس کی عزت رکھ لی۔ گو وہ کسی کی نہیں رکھتی تھی۔

ثروت باجی کے گھر سے واپسی پر اس نے جو الفاظ ادا کیے تھے انہیں یاد کرکے وہ شرم سے پانی' پانی ہوگئی۔

آج اگر رخسانہ اس کا گھر دیکھ لیتی تو میکے اور سسرال میں اس کے کیا کیا قصیدے پڑھتی۔ آخر وہ بھی ایک عورت تھی۔ رباب کے قدم خود بخود فون کی طرف اٹھ گئے۔

"ہیلو ثمینہ! میں رباب بات کر رہی ہوں۔ آئم سوری یار! میری وجہ سے تم اتنی پریشان ہوئیں۔" وہ شرمندہ سی اپنی غلطیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے نکلتے فیصل نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ بات جو اتنے سالوں کی رفاقت میں وہ اسے نہیں سمجھا پایا تھا محض ایک چھوٹے سے واقعے نے رباب کو اچھی طرح سمجھا دی تھی۔

سدرۃ المنتہیٰ

میری پیاس

”تو تم نے اس سے بات کی؟“ یہ میری بھابھی کی آواز تھی۔ اس آواز میں میرے لیے کتنی نفرت اور حقارت تھی اس کا اندازہ مجھے بخوبی ہے۔

”نہیں! وہ سو رہی ہے۔“ یہ میرے بھائی کی آواز تھی۔ اس آواز میں میرے لیے اپنایت کا کیسا احساس ہے مجھے اس کا بھی اندازہ ہے۔ یہ لہجہ، یہ آواز پست سہی پر اس لہجے میں مجھے ہمیشہ تحفظ کا احساس ملا ہے۔

”وہ جاگ رہی ہے۔ تمہیں دیکھ کر سوتی بن گئی

ناولٹ

ہوگی۔“ میری بھابھی جان بوجھ کر بلند آواز میں بات کرتی ہے۔ تاکہ میں آسانی سے سن لوں۔

”تم اس کے بارے میں یہ غلط سلط اندازے لگانا کب بند کرو گی؟“ یہ کہتے ہوئے میرے بھائی نے ضرور نظریں چرائی ہوں گی۔

”وہ سو رہی ہے اور اسے بخار بھی ہے۔“ بھائی کی آواز میں تلخی آگئی۔

”تم نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں ولید۔ تمہیں اس کی کوئی برائی برائی نہیں لگتی۔ تمہیں اس کی کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ تم کب تک اس پر پردے ڈالتے رہو گے ولید حسن۔ آخر کب تک؟“

مجھے پتا تھا یہ احتجاج کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ میں قصوروار تھی اور بھابھی کو تو موقع چاہیے تھا۔

اور مجھے پتا تھا وہ ولید حسن ہیں جو مجھے سمندر کی گہرائیوں سے بھی جان کی بازی لگا کر نکال سکتے ہیں۔ انہوں نے اگر ایک دفعہ کہا تھا کہ میں خود سے زیادہ اپنی الماس کا خیال رکھوں گا تو انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا تھا۔ انہوں نے اگر کہا تھا کہ میں اپنی چھوٹی بہن کی ماں ہوں اس کا باپ ہوں۔ اس کا سایہ ہوں تو وہ لمحہ لمحہ میرا سایہ بنے بھی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا اگر دنیا پوری ایک طرف ہو جائے تو بھی میرا رخ اس کی طرف ہوگا۔ میں اس کی ڈھال بنوں گا اسی لیے کبھی انہوں نے مجھ سے کوئی گواہی نہ لی۔ کچھ نہ پوچھا کوئی تصدیق نہ کی تھی۔

پچھلے پندرہ دنوں سے وہ چپکے سے میرے پاس آکر

بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے اگر پوچھتے ہیں تو صرف میرا حال۔ میری ضرورتوں کی لسٹ لکھتے اور پوری کرتے ان کو سالوں بیت گئے ہیں۔ یہ عادت ان کی پکی ہو گئی ہے۔ یہ عادت ان سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔

ابھی بھی چند منٹ پہلے جب وہ میرے پاس آئے تھے تو انہوں نے میرا حال پوچھتے ہوئے ایک نظر بغور میرا حلیہ دیکھا تھا۔ پھر میرا چہرہ' میرا جائزہ لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں پانی تھا۔ اس بار وہ کل کی طرح یہ نہ کہہ سکے تھے کہ

"منی! تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے؟" صبح کی طرح یہ بھی نہ کہا۔

"تم نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔ کھانا کھالو۔" یا یہ کہ "ہم کہیں باہر چلتے ہیں کھانا کھانے۔" مجھے پتا تھا وہ یہ سب کہنا چاہتے ہوں گے۔ مگر لفظ ان کی زبان پر آتے آتے رک گئے تھے۔ جو سب کہنے کے لیے میری بھابھی پوری تیاری کر کے ان کو بھیجتی تھی۔

اس سے پہلے میں خود ان کو یہ ساری باتیں بتانا چاہتی تھی۔ مگر نجانے کیا تھا۔ جب وہ میرے سامنے آتے تھے تو میرا دل چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ لگ کر دل کھول کر رو دوں۔ اتنا کہ آنسوؤں کے ساتھ سارے دکھ بہہ جائیں۔ سارے شکوے دھل جائیں۔ اب بھی میرا دل یہی چاہا تھا۔ مگر نجانے کیوں میں خود پر جبر کیے' خود کو روکے ہوئے چپ تھی۔ کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ان کے اندر تھی' نہ میرے اندر۔ میری آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو جمع ہونے لگے تھے۔ اس لیے نظر چرانے میں پہل میں نے کی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھ گئے۔

بھائی کی خاموشی نہ ٹوٹ سکی تو بھابھی نے شور مچانا شروع کر دیا۔ یہ کام تو بھابھی نے اپنی زندگی میں بہت دل لگا کر کیا تھا۔

"تم کب تک اس کی ناجائز باتوں پر سر ہلاتے جاؤ گے؟ انصاف کرنا سیکھو ولید حسن۔ اس وقت مقابلے میں تمہاری بیوی نہیں کوئی اور ہے۔" وہ اکسا رہی تھی بھائی کو۔

"تم شور کر رہی ہو۔ تاکہ وہ اٹھ جائے اور یہ سب سن لے۔ تمہیں اس کی حالت پر ذرا رحم نہیں آتا شگفتہ! تم کیسی انسان ہو۔"

ایک ناکام کوشش۔ میرا بھائی پھر اپنی بیوی کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگانا چاہ رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے' تمہیں اس کا قصور کبھی نظر نہیں آئے گا۔ تمہاری اسی شہ پر وہ اپنا گھر نہیں بسا سکی۔ ہماری بیٹی پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ وہ بھی ضد اور ہٹ دھرمی سیکھے گی اس سے۔ اسے میرے گھر سے نکالو ولید حسن! میں اس کا سایہ بھی اپنی بیٹی پر پڑنے نہیں دینا چاہتی۔"

پتا نہیں کیوں' اس بار میرے آنسو بے ساختہ نکلے تھے۔

اتنی نفرت بھابھی کے دل میں میرے لیے کیوں تھی؟ میں چاہتی تھی' میں ان کو اتنا احساس ضرور دلاؤں کہ اس نفرت کا سب سے بڑا اثر خود اسی کو تباہ کر رہا ہے۔ اس ضد میں وہ خود اپنا سکون برباد کر رہی ہے۔ مگر اب پتا نہیں کیوں' میرے اندر اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ کتنی تبدیلی آ گئی تھی میرے اندر۔ ان چار سالوں نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا اور میری بھابھی کیسی عورت تھی' جو پچھلے سولہ سالوں سے ویسی ہی تھی ذرا تبدیلی نہیں آئی تھیں۔ اس عورت کے اندر۔ بلکہ اب تو اس میں اور مضبوطی آ گئی تھی۔ اولاد کے جوان ہوتے ہی اس نے بندوق سنبھال لی تھی اور اپنے ہر جائز ناجائز منصوبے کی عملی تکمیل کے لیے وہ بندوق اپنے جوان ہوتے ہوئے بچوں کے کندھوں پر رکھ کر چلاتی تھی۔ میری بھابھی کے پاس بھی یہی مضبوط ہتھیار تھا' جو میرے پاس نہ تھا۔

میرے پاس سوائے اپنے اکلوتے بھائی کی محبت' اس کی ہمدردی اور اس کے اعتبار کے اور کچھ نہ تھا اور بھابھی مجھ سے یہی چھیننے جا رہی تھی۔

ایک دفعہ پھر وہی جنگ چھڑ گئی جو سولہ سال پہلے چھڑی تھی۔ جب میں گیارہ سال کی تھی۔ جب میری بھابھی اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی۔ اس رات سے میرے لیے زندگی تبدیل ہونا شروع ہوئی تھی اسی رات کے بعد زندگی مشکل ہونا شروع ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تو تمہیں یہ لڑکی کیسی لگی؟" یہ میری ماں ہیں جو آئے دن کوئی تصویر لے کر میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں امید کے جلتے دیے میں بھی دیکھ سکتا ہوں۔ کبھی کبھار تھوڑی دیر کے لیے میں ان کی شدید خواہش کے سامنے مجبور بھی ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں ان کی خواہش کے آگے ہار مان لوں مگر میں کیا کروں۔ مجھے پتا ہے' کوئی بھی لڑکی رخصت ہو کر کسی کے گھر جاتی ہے تو اس کے دل میں کتنے ارمان ہوتے ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے گھر آئے اور پہلی رات اسے مجھ سے سننے کے لیے یہی تلخ جملہ ملے کہ "میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ سوائے میرے۔ سوائے میری محبت کے۔" تو اس کے دل کا کیا حال ہو گا۔

مگر میں اپنی ماں کو بھی کیسے سمجھاؤں۔ ان کی اسی ضد کے لیے میں نے اپنے سے چھوٹے زین کی دو سال پہلے شادی کرا دی۔ تاکہ گھر میں بہو آئے تو ان کی خواہش پوری ہو۔

اسی لیے میں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ زین کے ساتھ رہیں۔ تاکہ انہیں تنہائی کا وہ احساس کبھی نہ ہو۔ جو میرے ساتھ رہ کر ہوتا ہے۔

"آپ کی ایک پیاری سی بہو ہے۔ جو آپ کا اتنا خیال رکھتی ہے۔ اب بھی آپ کو بہو چاہیے؟" میں نے ہمیشہ کی طرح تصویر پر سرسری نگاہ ڈال کر ان کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھو تو بلال! یہ کتنی خوب صورت ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھو۔ تمہیں بڑی آنکھیں اچھی لگتی ہیں نا۔" انہوں نے تصویر ایک دفعہ پھر مجھے پکڑا دی۔

میں اب ان کو کیا کہوں کہ جو آنکھیں مجھے اچھی لگتی تھیں ان سارے چہروں میں سے کسی چہرے کے لیے نہیں بنیں۔

میں نے تصویر ان کے ہاتھ سے لے کر ان کے بیڈ کی دراز میں ڈال دی۔ اس کا مطلب ناپسندیدگی نہیں بلکہ خاموش انکار تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں اس تصویر کو میری دراز میں ہونا چاہیے تھا۔

"تم کب میری بات کب سمجھو گے بلال۔ مجھ سے تمہاری تنہائی نہیں دیکھی جاتی۔"

"امی! میں بہت مصروف ہوں۔ میرے پاس ذرا بھی وقت نہیں ان فضول باتوں کو سوچنے کے لیے۔ اب یہ نہ کہیے گا کہ یہ فضولیات نہیں' ضروریات ہیں۔ چلیں کہیں باہر چلتے ہیں۔ کھانا بھی کھائیں گے اور آئس کریم بھی۔" میں نے ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

اس وقت وہ مجھے بے بسی سے گھور کر رہ گئیں۔

کچھ ہی دیر میں ادھر ادھر کی باتیں کر کے میں ان کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مگر ان کے چہرے پر سوچ کے آثار اب بھی تھے۔ مجھے اندازہ تھا' اب وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔

"کاش! میں تمہیں وہ ساری خوشیاں دے سکتی۔ جن پر تمہارا حق تھا۔" ان کے چہرے پر پشیمانی تھی۔

"ماں بذات خود اولاد کے لیے سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔" میں نے ان کو اپنی مسکراہٹ کے ذریعے اپنی بات کا یقین بھی دلایا تھا۔ کیونکہ کچھ باتیں کہنے کی نہیں' صرف سمجھنے ہی کی ہوتی ہیں۔ تاثرات زبان کے محتاج نہیں ہوتے۔ مگر کبھی کبھار ہم تاثرات کو سمجھنے میں بہت سا وقت لے لیتے ہیں یا پھر یہ کہنا درست ہو گا کہ یقین کی صورت نہیں دے پاتے اور تب ہی ہماری زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں بڑی آسانی کے ساتھ رونما ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ وہ تبدیلیاں مثبت بھی ہوتی ہیں اور میری زندگی میں زیادہ تر تبدیلیاں منفی ہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

احساس محرومی کیا ہوتی ہے' یہ مجھ سے بہتر بھلا اور

کون جان سکتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ دو سال کی تھی۔ جب میری ماں میرے باپ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہمیں انہوں نے خود چھوڑا یا ہم کو ان سے چھینا گیا۔ خدا جانے حقیقت کیا ہے۔ مگر یہ تو بہرحال سچ ہے کہ میری ماں نے پلٹ کر ہماری خبر تک نہ لی تھی۔ میرا بھائی ولید حسن، جو مجھ سے ٹھیک بارہ سال بڑے تھے۔ میں نے ان کے منہ سے کبھی ماں کا ذکر نہیں سنا تھا۔ مگر مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ میرے بھائی میری ماں سے شدید قسم کی نفرت کرتے ہیں اتنی نفرت کہ وہ ان کا نام بھی نہیں سننا چاہتے۔ ایک بار میں نے ان کے منہ سے سنا کہ ہماری کوئی ماں نہیں ہے۔ تب میں ان کی بات پر جتنی حیران تھی اتنی ہی مایوس بھی۔

مجھے یاد ہے۔ تب میری عمر سات سال کے قریب تھی۔ میرے ہم عمر بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ اسکول آتے تھے اور چھٹی ہونے کے بعد وہی انہیں لینے آیا کرتے تھے۔ میں بھی بچوں کی اسی قطار میں کھڑی ہوتی تھی۔ مگر مجھے میرے بھائی لینے کے لیے آتے تھے۔ کیونکہ میرے ماں باپ نہیں تھے۔ ماں کی تو شکل بھی مجھے یاد نہ تھی۔ نہ ہی ان کی کوئی تصویر یا نشانی اس گھر میں موجود تھی۔ جس سے ان کے وجود یا رشتے کا احساس میرے اندر جنم لیتا۔ میں سمجھتی تھی۔ میری ماں بھی باپ کی طرح ہماری دنیا سے چلی گئی ہیں۔ ولید بھائی کہتے تھے۔

”ابا بہت اچھی جگہ رہ رہے ہیں۔ ہم سے کہیں زیادہ اچھی جگہ پر۔ اس جگہ کو ہم لوگ جنت کہتے ہیں۔“

ابا کے جانے کے بعد وہ مجھ سے اکثر ابا کے حوالے سے بہت اچھی اچھی باتیں کرتے تھے۔ میری نظر میں ابا کی دھندلائی ہوئی صورت تھی۔ ایک سال کے دوران میں آہستہ آہستہ ان کو بھول رہی تھی۔

میں ابا کے قریب اتنا زیادہ نہ رہی تھی۔ شروع سے مجھے بھائی کے ساتھ کھانا کھانے، سونے اور پڑھنے کی عادت تھی۔ میری کل کائنات ولید بھائی تھے۔ اور یہ ان کی محبت اور بے پناہ توجہ ہی تھی۔ جو مجھے اتنی محرومیوں میں بھی خوش رکھے ہوئے تھی۔

بہت ساری ڈرائنگ بکس، کلرز، گیمز، چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں، ڈھیر سارے بسکٹ، ٹافیاں اور چاکلیٹس کے پیکٹ۔ میرے بھائی نے میرے لیے ایک چھوٹی سی جنت بنائی ہوئی تھی۔ میں ان کے ساتھ خوش تھی۔

چھٹی جماعت میں آکر مجھے نئے دوست ملے تھے۔ جو بہت برے تھے مگر بلال احمد نے اس وقت مجھے سہارا دیا تھا۔ وہ اپنی سائیکل پر بہت دور سے میرے لیے آتا تھا۔ بریک میں مجھ سے ملتا۔ ڈھیر ساری باتیں پوچھتا اور بہت ساری نصیحتیں کرتا تھا۔

بلال احمد مجھ سے تین سال بڑا تھا۔ اس کا تعلق میرے ساتھ بڑے بھائیوں جیسا تھا۔ وہ میری پھپھو کا بیٹا تھا۔ مگر ہمارا ان سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ ان کو اپنے گھر میں، میں نے ایک دو بار ہی دیکھا تھا۔ ابا جب زندہ تھے شاید تب۔ بلال بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ ہم دونوں کزن ہیں۔ تب تو یہ بات میرے ذہن میں نہ سمائی تھی۔ مگر اس کا مجھ سے بار بار ملنا مجھے اس رشتے کا احساس دلاتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے بھائی کو بتا دیا کہ وہ بریک میں مجھ سے ملنے آتا ہے۔

بھائی پہلی بار مجھ پر غصہ ہوئے۔ مجھے بہت ڈانٹا اور دوسرے دن بریک میں آکر بلال کی خوب پٹائی کی۔ پتا نہیں کیوں بھائی کو اپنے رشتہ داروں میں سے کسی سے بھی کوئی تعلق رکھنا گوارا نہ تھا۔ اس کی وجہ مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی۔ اس وقت تو مجھے بھائی پر بہت غصہ آیا تھا۔ انہوں نے بلال بھائی کو بہت بری طرح مارا تھا۔ دیوار سے ٹکرا جانے سے بلال بھائی کے ماتھے سے خون بھی نکلا تھا۔ پتا نہیں کیوں بھائی کو اتنا غصہ آگیا تھا۔ اس کے بعد وہ میرے لیے بہت محتاط ہو گئے تھے۔ مجھ پر کچھ سختی بھی کرنے لگے تھے۔ پہلے کی طرح انہوں نے کہانیاں سنانا اور میرے ساتھ گیمز کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ دن رات وہ اپنی کتابوں میں سر دیے پڑھتے رہتے تھے۔

میں پھر ان ہی محرومیوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ بات بات پر ان سے روٹھ جاتی۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی۔ ان کو تنگ کرتی۔ تب مجھے اندازہ نہ تھا کہ ولید بھائی میری اور اپنی زندگی بنانے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ انہوں نے ابا کا کاروبار پھر سے سنبھال لیا تھا۔ گو کہ یہ دھندا بہت گھاٹے میں جا رہا تھا۔ مگر ولید بھائی کی دن رات کی محنت سے بہتری آتی جا رہی تھی۔ وہ دوہری ذمہ داریوں کا شکار تھے۔ پھر بھی ان کے چہرے پر تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ناامیدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ مسکرا کر بات کرتے تھے۔ وہ پڑھ بھی رہے تھے اور مجھے پڑھا بھی رہے تھے۔ جب ٹیوشن والی ٹیچر کی کارکردگی اچھی نہ تھی تو انہوں نے مجھے خود پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ پڑھائی کے دوران وہ مجھے کئی طرح کی نصیحتیں کرتے رہتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ مگر مجھے اب یہ ساری نصیحتیں زہر لگنے لگی تھیں۔ مجھے بھائی سے شکایت تھی۔ میں نے پڑھائی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ بھائی میری وجہ سے جتنے پریشان تھے، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ میں صرف یہ سوچتی تھی کہ میرے پاس والدین نہیں۔ اور بچوں کے ساتھ ان کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ بھائی اب مجھے پیار نہیں کرتے۔ مجھ پر سختی کرتے ہیں۔ وہ میری باتوں کا اعتبار بھی نہیں کرتے۔ اب وہ مجھے کپڑے بھی کم دلاتے ہیں اور بالکل بھی مجھ سے محبت نہیں کرتے۔

میں یہ کب جانتی تھی کہ میرے بھائی کو بجلی، گیس کے بل جمع کروانے ہوتے ہیں میری اور اپنی فیس دینا ہوتی ہیں۔ ملازم کو پیسے دینے ہوتے ہیں۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہیں پتا تھا کہ میرے بھائی کے پاس کپڑوں کے نام پر چند گنے چنے جوڑے رہ گئے ہیں۔ پچھلی بار بھی وہ اپنے لیے کچھ نہ لائے۔ اس بار عید پر انہوں نے اپنے لیے کچھ بھی نہ لیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ ساری باتیں نہیں بتائی تھیں۔ وہ تو بس مجھے خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ میری عمر تیرہ سال تھی۔ میری ضد اور چڑچڑے پن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بھائی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری مکمل

کرچکے تھے۔ اس وقت ان کی پہلی ترجیح کاروبار اور دوسری "میں" تھی۔ میں جو دن بہ دن ان کے لیے ایک بڑی آزمائش بنتی جارہی تھی۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر کچھ سوچتے تھے۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے بار بار آکر مجھے دیکھتے۔ کبھی اندر آکر میرے جوتے اتارتے۔ میرے اوپر چادر درست کرتے۔ میری کتابیں اور چیزیں سمیٹ کر رکھتے۔ میرے کپڑے تہہ کرکے سلیقے سے رکھتے اور پھر میری پیشانی چوم کر کمرے سے چلے جاتے۔ میں جاگ رہی ہوتی۔ چھپکے چھپکے ان کو دیکھتی۔ ان کی باتیں سنتی۔ مگر میرے دل سے مکمل طور پر ان سے وابستہ شکایات ختم نہ ہوسکیں۔ کچھ دوستوں اور جاننے والوں نے ان کو شادی کرنے کے لیے کہا۔ کئی دن تک وہ انکار کرتے رہے۔ مگر شاید میری حالت اور گھر کی بکھری ہوئی حالت سے بے زار ہو کر ان کو شادی کا فیصلہ کرنا ہی پڑا۔

یہ شادی عام شادیوں سے مختلف تھی۔ نہ ڈھولک، نہ گانا بجانا، نہ کوئی بڑا فنکشن۔ مجھے یاد تھا۔ ہم ایک عام سے گھر میں بھائی کے چند دوستوں اور ان کے گھر والوں کے ساتھ گئے تھے۔ وہ ایک بہت عام سا محلہ تھا۔ جگہ جگہ گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ بہت چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے لوگوں نے بہت معمولی کپڑے پہن رکھے تھے۔ نکاح کے بعد مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لاکر اپنی بھابھی کے ساتھ بٹھایا گیا اور تعارف کرایا گیا۔ دلہن بنی وہ عورت مجھے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ میرا بھائی خوب صورت تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ ہمارا گھرانہ ان کے گھر سے ہزار گنا بہتر تھا۔ پھر بھائی نے اس لڑکی سے شادی کیوں کی۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ میں اس دلہن بنی عورت کا منہ نوچ لوں۔ مجھے یاد ہے میں نے بہت نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر میں فوراً" اس جگہ سے اٹھ کر باہر آگئی۔ بھائی کے پاس آکر میں نے گھر چلنے کے لیے ضد کی اور وہ مجبوراً" معذرت کرکے اسی وقت رخصتی کی درخواست کرنے لگے۔ اسی وقت اس لڑکی کو رخصت کرکے ہماری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ بھائی نے اک نظر پاس بیٹھی عورت کو دیکھنے کی کوشش کی تھی اور میں نے اپنے ہاتھ سے بھائی کا چہرہ اپنی طرف کرلیا تھا۔ تب وہ تھوڑا حیران ہو کر مسکرائے تھے۔ مگر اس عورت کے چہرے پر کیا تاثرات ہیں، مجھے یہ دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

وہ رات میں نے رو کر گزاری تھی اور پھر اس عورت نے مجھے کتنا رلایا تھا، یہ مجھ سے بہتر بھلا اور کون جان سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼
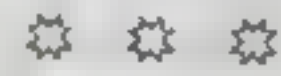
میں بلال احمد چھ سال کی عمر سے ہی احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا تھا۔ کمتری کا یہ احساس میری ماں کے اندر بھی تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے کافی رشتہ دار مالی طور پر بہت مستحکم تھے اور ایک خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ماں اپنے سگے بھائی کو بھی گھر بلانے سے کتراتی تھیں اور خود بھی بے حد مجبوری میں بہت کم کم ہی جاتی تھیں۔

میں نے بہت کم عمری میں یہ بات سمجھنا شروع کردی کہ جب جب وہ بھائی کے ہاں سے ہو کر آتی تھیں، اس دن وہ گھر میں الجھی الجھی رہتی تھیں۔ بچوں کو بلاوجہ ڈانٹنے لگتیں اور ابا سے اس رات لازمی کسی نہ کسی بات پر بحث ہوجاتی تھی۔ اس وقت شاید ان کو اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اماں اور ابا کی پسند کی شادی تھی۔ اور یہ بات ہمیں پتا بھی تھی۔ ہمارے نانا تب اتنے مال دار نہ سہی مگر کافی خوش حال گھرانہ تھا۔ سنا ہے اماں کی شادی کے بعد نانا نے ایک اور ناانصافی کی کہ اماں کو ان کا حصہ نہ دیا اور سارا کچھ ماموں کے نام کردیا۔ گھر، کئی پلاٹ اور دکانیں تھیں۔ ماموں نے سارا کچھ اونے پونے بیچ کر ایک بڑا سا گھر خرید لیا۔ ان ہی دنوں انہیں سرکاری نوکری بھی مل گئی اور پھر تو ان کے وارے نیارے ہوگئے۔ ابا اکثر ان کی رشوت خوری کا ذکر کرتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کی دن رات کی محنت بے کار لگتی تھی۔ جب انسان کولہو کے

بیل کی طرح کام کرتا رہے اور کھانے پینے کا خرچ ہی بمشکل پورا ہو، اس پر اضافی اخراجات۔ میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ اسی مالی پریشانی میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ماتھے پر ہر وقت بل ہوتے تھے۔ وہ گھر میں غصہ کرتے داخل ہوتے اور غصہ کرتے ہوئے گھر سے جاتے تھے۔ کوئی بھی چیز لینے یا مانگنے سے پہلے ہمیں دس دفعہ سوچنا پڑتا تھا۔ جب کہنے کی ہمت آجاتی تو صبر کا دور شروع ہوجاتا۔ ابا کی جھڑکیاں، امی کی ڈانٹ۔ اس کے بعد رو رو کر کچھ پیسے ابا کی جیب سے نکلتے تھے۔ زین مجھ سے چھوٹا تھا۔ اسے صبر کرنا نہیں آتا تھا۔ نہ ہی وہ میری طرح غیر ضروری باتیں سوچتا تھا۔ بس وہ ضد کرتا رہتا۔ جب تک اس کی ضد کسی صورت پوری نہ ہوتی، وہ چین نہیں لیتا تھا۔ مجھے یاد تھا، اس سائیکل کے لیے بھی میں نے ہی اسے کہا تھا اور پھر اس نے رونا دھونا شروع کردیا۔ حالانکہ وہ سائیکل مجھے چاہیے تھی۔ اس لیے کہ مجھے الماس سے ملنے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ اب میں اس کے گھر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ماموں کے جانے کے بعد اس گھر سے ہمارا کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ ولید بھائی اماں سے سنا تو کیا بات تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ ہم لوگوں سے اتنی نفرت کرتے تھے۔ کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا، وہ دنیا میں ہر ایک سے نفرت کرتے ہیں۔ شاید اس سب کی بڑی وجہ ان کی مما تھیں۔ جو ان کو بہت پہلے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

تب سنا تھا، ماموں بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ ان کے کسی بری عورت کے ساتھ تعلقات تھے۔ ممانی اسی وجہ سے خفا ہو کر اور ان سے لڑ کر چلی گئیں۔ جبکہ بچے ان ہی کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ انہوں نے باہر جاکر بہت جلدی اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کرلی تھی اور اس شادی کی خبر سننے کے بعد ولید بھائی ان سے مزید نفرت کرنے لگے تھے شاید۔ الماس بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد تھا۔ ایک دن اماں مجھے ماموں کی طبیعت پوچھنے کے لیے ساتھ لے گئی تھیں۔ الماس اپنے کھلونے لیے اکیلی کھیل رہی تھی۔ ماموں نے بتایا تھا کہ وہ الماس کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ الماس ان کی عادی ہوجائے۔ ولید بہت خیال رکھتا ہے اس کا۔ ان کو ولید بھائی پر ایک عجیب قسم کا مان تھا۔ پتا نہیں کیوں، میرا دل چاہا تھا، کبھی زندگی میں وہ دن آئے کہ میرے ماں باپ مجھ پر بھی اتنا اعتماد کریں۔ میرا نام لیتے ہوئے ان کے چہرے پر وہی سکون آجائے۔ جو سکون ماموں کے چہرے پر ولید بھائی کا نام لیتے ہوئے آتا تھا۔ مجھے ایک دم سے وہ دبلا پتلا، اپنے سے چند سال بڑا لڑکا بہت ہی معتبر اور خاص لگنے لگا تھا۔ میں دل ہی دل میں ولید بھائی کی شخصیت سے متاثر ہونے لگا تھا۔

مگر الماس کے ساتھ مجھے عجیب سا ایک دوستی کا تعلق محسوس ہوا تھا ——— اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ وہ پکڑ پکڑ کر مجھے اپنے کھلونے دکھا رہی تھی۔ اس کی آدھی ادھوری بات اور بات کرتے ہوئے تھوڑا ہکلانا۔ مجھے ایک دم سے اس کا انداز بہت پیارا لگنے لگا تھا۔ اس دن اس نے اپنی چاکلیٹس اور کوکیز میرے ساتھ شیئر کیے تھے۔ میں ماموں کے گھر آکر بہت خوش تھا۔

پہلی بار مجھے یہ نہیں لگا کہ یہ سارے کھلونے، یہ ساری چیزیں میرے پاس کیوں نہیں ہیں۔ مجھے لگا یہ ساری چیزیں اسی کے پاس ہونی چاہئیں۔ اس دن مجھے الماس کے لیے بہت دکھ ہوا تھا۔ جب مجھے پتا چلا تھا کہ ماموں اس دنیا میں نہیں رہے۔ ماموں کے بعد پھر ہمارا وہاں جانا نہیں ہوا۔ البتہ الماس کے اسکول کا پتا کچھ عرصے میں میرے ہاتھ لگ گیا۔ اور میں زین کے ذریعے حاصل کی گئی سائیکل کی مدد سے اس کے اسکول جاکر اس سے ملنے لگا۔ وہ بہت ناسمجھ تھی۔ اسے بہت سی باتوں کا ابھی پتا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے سارا وقت ولید بھائی کی باتیں کرتی۔ میں اس سے اس کے کھلونوں کا حال پوچھتا۔ جنہوں نے کبھی مجھے بری طرح احساس کمتری میں ڈال دیا تھا۔ اس نے بہت سارے کھلونے پھینک دیے تھے۔ اب وہ کھیلنے کی عمر سے بڑی تھی۔ اب وہ بچوں کی کہانیوں، کتابوں اور گیمز میں

دلچسپی لینے لگی تھی۔
مجھے اس کی تبدیلی پسند آئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا۔ اب وہ بڑی ہو رہی ہے۔ اس کا مجھے بلال بھائی کہنا اچھا لگتا تھا۔ اس سے ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی مضبوط رشتے میں بندھے ہوں۔ یہ صرف ایک اپنائیت کا احساس تھا۔
مگر اس دن میری توقع کے برعکس ولید بھائی بریک میں آگئے اور میں ان کو سامنے دیکھ کر ہی ڈر گیا۔ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ میں اتنے عرصے سے کچھ غلط کام نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنی چھوٹی سی دوست' اپنی کزن سے ملنے آتا ہوں۔ جو مجھے بلال بھائی کہہ کر پکارتی ہے۔ جو مجھے ولید بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔ مگر اس دن پتا چلا کہ رشتے خود بنانے سے نہیں بنتے۔ بلکہ وہی رہتے ہیں۔ جو اللہ بناتا ہے۔ اس دن ولید بھائی نے مجھے بہت پیٹا۔ اتنا زیادہ کہ میرے سر سے خون بہہ نکلا۔ اماں مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ ان کو پتا تھا ان کا بیٹا جھگڑالو نہیں ہے۔ وہ میرے سر سے خون صاف کرتے ہوئے رو رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس طرف کبھی نہیں جاؤں گا۔ جہاں کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ کھیلتے ہوئے میں بری طرح سے پٹ کر آگیا تھا۔ یہ کہانی میں نے ان کو سنائی تھی۔ ابا تو اجنبی کا پتا پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسی وقت حساب برابر کر آتے۔ خیر! اس کے بعد یہ ہوا کہ ابا سائیکل اٹھا کر بیچ آئے۔ اور اس دن کے بعد میری الماس سے ملنے کی ہمت پھر نہ ہوئی۔ لیکن الماس کو میں آج تک بھول نہیں پایا تھا۔ پتا نہیں یہ ہمدردی تھی۔ رشتہ یا پھر کچھ اور۔ اس کی بچپن کی تصویر آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ کیوں میں اس تصویر کو بار بار دیکھتا رہا۔ کیوں میں ایک معصوم سی بے ضرر سی لڑکی کے بارے میں اتنا سوچنے لگا تھا۔ ان سارے سوالوں کے جواب میرے پاس نہ تھے۔

☼ ☼ ☼

احساس جرم کیا ہوتا ہے' یہ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔
میں میر یوسف' میرا شاید سب سے بڑا جرم میری غربت تھی۔ میری تنگی' میری حسرتیں' اونچے اونچے خواب اور ان سب کو ایک دم سے پالینے کی اندھادھند خواہش۔ پتا نہیں جرم کہاں سے شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے صرف حسرتیں تھیں اور خواب۔ سب سے پہلے ان حسرتوں نے مجھے اسکول لائف میں جکڑا۔ جب میں ساتھی بچوں کی چیزیں چرا کر اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا۔ تب سے میرا یہ خیال تھا کہ جو چیز آپ کو دی نہ جائے۔ اس کو چھین کر بھی حاصل کر لینا چاہیے۔ یہ شاید میری کمزور تربیت کا اثر تھا یا گھر میں مجھ پر توجہ نہ دی گئی تھی۔ نہ میرا بستہ چیک کیا گیا کہ اس میں اتنی قیمتی چیزیں کیسے آگئیں۔ میں پڑھتا بھی ہوں یا نہیں۔ اس کی بھی کسی کو پروا نہ تھی۔ اماں مطمئن تھیں کہ اسکول جاتا ہے۔ کافی ہے۔
باپ مطمئن تھا کہ آدھا دن گھر سے ٹلا رہے۔ کبھی کبھار میری فیس بھی میرے چچا دیا کرتے تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بیٹا نہ تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر ان کی بیٹی کے قابل بن جاؤں۔ ان ہی کی خواہش پر میں آگے پڑھتا رہا۔ مگر بے دلی سے۔ اسکول سے کالج لائف کا دور بہت جلدی آگیا۔ کالج میں ایڈمیشن بھی میرے چچا نے ہی کروایا تھا۔ میرے کالج جانے پر میری ماں سے زیادہ میری چچی خوش تھیں۔ میں دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا کہ مجھے ان کی بیٹی سے شادی کر کے ساری عمر دو گھروں کی ذمہ داری سر پر نہیں لینی۔ میں اکیلا رہ کر عیش کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ کالج میں کئی خوبصورت اور امیر کبیر لڑکیاں میرے ساتھ پڑھتی تھیں۔ یہاں دولت مند بننے کا ایک اور راستہ نظر آیا۔ کسی امیر لڑکی سے شادی کر کے گھر داماد بن جاؤ اور عیش کرو۔ یہ سب سے آسان راستہ تھا۔ ان ہی دنوں جب میں بھی اپنے لیے کسی امیر لڑکی کو متوجہ کرنے کے طریقے سوچ رہا تھا۔ خوش قسمتی کہیں یا میری بدقسمتی کی پہلی سیڑھی۔ تب تو یہ خوش قسمتی ہی لگی تھی۔ مجھے ایک امیر اور معصوم

لڑکی کینٹین میں ٹیبل پر سر رکھ کر روتے ہوئے نظر آئی اس وقت کینٹین پوری خالی تھی اور وہ اکیلی بیٹھی رو رہی تھی۔ آج سے پہلے کسی بھی امیر لڑکی کو یوں روتے نہ دیکھا تھا۔ اس کلاس کی لڑکیاں اتنی بولڈ ہوا کرتی ہیں کہ رونے کے بجائے رلاتی پھرتی ہیں۔ یہی حیرت مجھے اس کی ٹیبل کے پاس لے گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ عورت جو اس گھر میں میری بھابھی بن کر آئی تھی۔ اس عورت نے مجھے کتنا رلایا تھا' یہ مجھ سے بہتر بھلا اور کون جان سکتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا اس نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے بھائی کے قریب آنے نہیں دیتی۔ بھائی نے رات کو کمرے میں آکر مجھے چیک کرنا' میری چیزیں سنبھالنا اور میرا خیال رکھنا آہستہ آہستہ کم کرتے کرتے چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے ایک غیر عورت کے حوالے کر کے مطمئن کیوں ہو گئے تھے۔ گھر آکر وہ اس کے سامنے مجھ سے پوچھتے تھے۔ کھانے کا' میری ضرورتوں کا' پڑھائی کا۔ وہ عورت کوئی اور بہانہ کر کے بات گھما دیتی۔
سب سے پہلے اس نے بھائی کی توجہ دوسری چیزوں میں لگانا شروع کی۔ جب وہ مجھ سے کچھ کچھ لاپروا ہو گئے تو اب وہ باقاعدہ میری شکایتیں لگایا کرتی بھائی سے۔ وہ میرے بھائی کے دل میں میرے لیے آہستہ آہستہ زہر بھر رہی تھی۔ مگر اس سب کے باوجود بھی بھائی کا رویہ نہیں بدلا تھا۔ وہ اس کے سامنے مجھے ڈانٹ دیتے تھے۔ مگر پھر مناتے بھی تھے۔
بھائی کی غیر موجودگی میں اس عورت کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا' جو ایک مالکن کا ملازمہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح مجھے کھانا دیا جاتا۔ بہت تھوڑا سا۔ خود کھا کر جو بچتا' وہ دے دیتی اور میں اس کا بچا ہوا کھانا وہیں پر چھوڑ آتی۔ بعد میں اسے شکایت لگانے میں آسانی ہوتی کہ میں کھانا کھاتی نہیں' ضائع کر دیتی ہوں۔ ایک غریب گھر کی عورت میرے گھر میں آکر عیش کر رہی تھی اور میں تیرہ سال کی عمر میں اس گھر میں ایک محروم زندگی جی رہی تھی۔ اس نے مجھے سوتیلی ماں کی کمی محسوس ہونے نہ دی۔ میں نے بھائی سے شکایت کی تھی۔ انہیں بتایا تھا کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں مجھ سے گھر کا سارا کام کرواتی ہے۔ بلکہ معمولی سی غلطی پر ہاتھ بھی اٹھا لیتی ہے۔ بھائی شاید یقین نہ کرتے اگر وہ ایک دن اچانک جلدی گھر نہ چلے آتے۔ اسی دن میں نے بچا کھچا باسی کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ تب اس عورت نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ ایک' دو نہیں تین چار۔ وہ مجھے مارتی رہی۔ مجھے گالیاں دیتی رہی۔ وہ کہتی رہی۔ میں اس کی زندگی کی خوشیوں کے دن کھا گئی ہوں۔ وہ مجھے منحوس کہہ رہی تھی۔ حالانکہ وہ خود میری زندگی کے خوب صورت دن' میرا بچپن کھا گئی تھی۔ منحوس تو وہ عورت تھی میرے لیے۔ مگر یہ میری خوش نصیبی تھی کہ بھائی اسی وقت کمرے میں آئے تھے۔
ان کی حیرانی کا صرف ایک لمحہ تھا۔ دوسرے لمحے انہوں نے آگے بڑھ کر اس عورت سے مجھ کو چھڑایا اور تیسرے لمحے اسی طرح ایک' دو نہیں تین' چار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیے۔ اب میرے بھائی اسے اسی طرح اس گھر سے نکال رہے تھے۔ اس کا سارا سامان کمرے سے باہر نکال پھینکا۔ اس عورت نے بہت کوشش کی کچھ کہنے کی۔ کئی جھوٹ جو اس نے تصور میں ہی گھڑے ہوں گے جن کو آزمانے کا اسے موقع نہ مل سکا تھا۔ میرے بھائی نے اسے گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ کتنی دیر تک دروازہ پیٹتی رہی مگر انہوں نے دروازہ نہ کھولا۔ وہ ساری رات میں اپنے بھائی کے بازو پر آنسو بہاتی رہی۔ ان کے ساتھ لگ کر روتی رہی اور انہیں بتاتی رہی۔ اس رات انہوں نے وعدہ کیا کہ اب وہ اس گھر میں اس عورت کو کبھی نہیں لائیں گے۔
اس رات مجھے اپنے بھائی واپس مل گئے تھے۔
وہ پھر سے میرا خیال رکھنے لگے۔ میری ہر چیز کا کھانے پینے کا۔ میرے کپڑوں کا۔

اسی ہفتے وہ مجھے ساتھ لے گئے اور مجھے بہت ساری چیزیں لے کر دیں۔ میں خوش تھی کہ میرا بھائی میرے ساتھ ہے اور وہ سازشی عورت اب پھر ہمارے گھر میں نہیں آئے گی۔ مگر یہ صرف میری غلط فہمی یا پھر خوش فہمی ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

جب میں اسکول سے واپس آئی تو اس کو میں نے اپنے سامنے دیکھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ بھائی دوسرے صوفے پر اخبار ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ سب کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ ایسے جیسے وہ اس گھر سے کبھی گئی ہی نہ ہو۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں بیگ وہیں صوفے پر پھینک کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس وقت مجھے صرف اور صرف غصہ آرہا تھا۔ بھائی پر سب سے زیادہ۔ میری عادت تھی۔ غصے میں میں اپنا نقصان کرتی تھی۔ میز پر رکھا ہوا گلاس میں نے فرش پر پھینک دیا۔ اپنی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں۔ شیشے کی ایک کرچی میرے پیر میں بری طرح چبھ گئی۔ اور میں وہیں فرش پر بیٹھ کر اپنے پاؤں سے نکلتا ہوا خون دیکھ رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو ضرور بہہ رہے تھے۔ مگر اس وقت میرے منہ سے کوئی چیخ نہ نکل سکی۔

بھائی اسی وقت میرے کمرے میں آئے تھے۔ میرا پاؤں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ بہت احتیاط سے انہوں نے پاؤں کے تلوے سے کرچیاں نکالیں۔ زخم صاف کیا اور پٹی کرنے کے بعد مجھے بیڈ پر لٹایا۔ بہت دیر تک وہ خاموشی سے ساری بکھری چیزیں سمیٹ کر رکھنے لگے۔ پھر جھاڑو لا کر ساری کرچیاں احتیاط سے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں پھینکیں۔ اس کے بعد میرے لیے کھانا لے آئے۔

"منی! میں جانتا ہوں۔ وہ بہت بری ہے۔ یہ بھی کہ اس نے تم سے بہت برا سلوک کیا ہے۔" وہ اپنے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر میرے منہ میں ڈالتے ہوئے بولے۔

"میں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اسے واپس لانے کا۔ مگر آج اس کی ماں اسے چھوڑ گئی ہے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔" وہ آہستہ آہستہ کہتے ہوئے مجھے کھانا کھلا رہے تھے۔

"اس نے مجھ سے معافی مانگی ہے۔ وہ آئندہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرے گی۔ کک رکھ رہا ہوں وہ تمہیں تمہاری مرضی کے کھانے پکا کر دے گا۔ تم چاہو تو اس سے بات بھی مت کرنا۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔ بس میں اسے اب نکال نہیں سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ ہاں، اگر اب اس نے تمہارے ساتھ کچھ بھی برا کیا تو نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا۔ مگر مجھے یقین ہے اب وہ ایسا نہیں کرے گی۔"

مجھے بہت کچھ سمجھاتے رہے۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میرے اسکول، میری پڑھائی کے بارے میں غیر ضروری سوال کرتے رہے۔ شام تک وہ میرے ساتھ تھے۔ شام کو ہم کھیلنے کے لیے باہر گئے۔ پھر وہ مجھے آئس کریم کھلانے لے گئے۔ رات کا کھانا ہم تینوں نے ساتھ کھایا۔ وہ عورت بھی خاموش تھی اور میں بھی۔ میں اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

ایک بھائی تھے، جو وقفے وقفے سے کبھی مجھ سے مخاطب ہوتے۔ کبھی اس سے۔ اس دن میرا غصہ تو اتر گیا تھا۔ مگر میرا دل اسے تسلیم کرنے کے لیے پھر بھی راضی نہیں تھا۔ مگر مجھے اپنے بھائی کے سامنے اپنا امیج ابھار رکھنا تھا۔ اس لیے میں نے اس عورت سے الجھنا چھوڑ دیا تھا اور اس دن کے بعد سے اس نے میرے ساتھ کوئی ایسا غلط برتاؤ بھی نہیں کیا تھا۔ بھائی شام میں تھوڑی دیر میرے ساتھ رہتے تھے۔ میرا موڈ پھر سے ابھرنے لگا تھا۔ میرے دل میں اس عورت کے لیے جو نفرت تھی، وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ مگر بیچ میں پھر ایک دیوار آگئی تھی۔

ان دنوں بھائی اس کا بہت خیال رکھنے لگے تھے بلکہ اس کے ساتھ وہ دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے۔ میرے بھائی پھر اس عورت کے ہو گئے

مجھے پتا نہیں کیوں یہ لگتا تھا کہ وہ عورت میرے بھائی کو میرے خلاف ورغلا کر دور کر دے گی۔ کیونکہ بھائی میرا واحد سہارا تھے اس دنیا میں۔ اس عورت کی اہمیت اس گھر میں بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ دنوں بعد بھائی مجھے اسکول سے سیدھا اسپتال لے گئے۔ وہاں کاٹ میں لیٹی ایک چھوٹی سی گڑیا دکھائی اور بتایا کہ یہ میری بھتیجی ہے۔

مجھے ایک دم سے وہ چھوٹی سی گڑیا بہت پسند آگئی تھی۔ گھر آنے کے بعد میں بھائی کی موجودگی میں اس کے کمرے میں جانے لگی تھی۔ بینش کو پیار کرنا اور گود میں لینا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ بنی کی خاطر میں نے اس عورت سے بات کرنا شروع کر دی۔ میں نے سوچا تھا۔ میں بنی کو اپنا بہت اچھا دوست بناؤں گی۔ اپنے سارے کھلونے اسے دوں گی۔ بنی تھوڑی بڑی ہو گی تو میں اس کے ساتھ کھیلوں گی۔ پھر مجھے کبھی بوریت نہیں ہو گی۔ بھائی بنی کے لیے میری محبت دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ مطمئن تھے اور میں بھی خوش تھی۔

وہ عورت مجھے خوش کہاں دیکھ سکتی تھی۔ وہ صرف کچھ وقت کے لیے چپ ہوئی تھی۔ اس کا رویہ میرے ساتھ پھر سے برا ہونے لگا۔ وہ مجھے بنی کو گود میں لینے نہیں دیتی تھی۔ مجھے ڈانٹتی جھڑکتی اور جب میں کمرے کی طرف آ رہی ہوتی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کر لیتی۔

بھائی بہت دیر سے گھر آتے تھے اور جب فری ہوتے تھے تو بنی کو گود میں اٹھائے اس سے باتیں کر رہے ہوتے تھے۔ وہ سارا وقت بنی کو دیتے تھے۔ ان کے پاس میرے لیے وقت نہ تھا۔ وہ کہتے تھے۔ تم بڑی ہو رہی ہو۔ اپنی چیزیں سنبھالنا سیکھو۔ یہ کیا پورا کمرا گندہ کر دیتی ہو۔ تمہاری بھابھی بے چاری صفائی کروا کروا کر تھک جاتی ہیں۔ ان کا لہجہ نرم ہوتا تھا۔ مگر بات چبھتی تھی۔ وہ بھابھی کی نظر سے مجھے دیکھنے لگے تھے۔ جتنا وقت میرے ساتھ رہتے' سمجھاتے رہتے۔ مجھے ان کی باتیں بہت بری لگنے لگی تھیں۔ اب میں خود ان سے کٹی کٹی سی رہنے لگی تھی۔ اکیلے رہنا سیکھ رہی تھی۔ مجھے بنی سے بھی عجیب قسم کا حسد ہونے لگا تھا۔

ایک دفعہ وہ بہت رو رہی تھی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ بہت دیر تک وہ روتی رہی میرا دل بے چین ہو رہا تھا۔ آخر کار میں اس کے کمرے تک گئی۔ مگر جب تک وہ روتے روتے فرش پر گر گئی تھی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے ایک دم آگے بڑھی تھی۔ جب بھابھی واش روم سے نہا کر باہر نکلی اور مجھ سے بنی کو چھین کر چمکارنے لگی۔ مجھے ایک زوردار تھپڑ بھی لگایا اور پھر بھائی کو فون کر کے میری شکایت کرنے لگی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ بھائی اس کی باتوں پر اعتبار کرنے لگے تھے۔ انہوں نے بھی مان لیا کہ بینش کو بیڈ سے میں نے گرایا ہے۔ جان بوجھ کر۔ وہ عورت اب بنی کو مجھ سے بہت دور کرنے میں کامیاب ہو گئی اور بھائی کو بھی۔ بھائی مجھے ڈانٹتے نہیں تھے۔ نہ ہی مارتے تھے۔ مگر وہ مجھ سے دور ہو گئے تھے۔

میں بظاہر ٹھیک تھی۔ کھانا پینا سب کچھ مل رہا تھا۔ میرے پاس ہر چیز تھی۔ سوائے محبت کے' توجہ کے' اپنائیت اور وقت کے۔ جو کسی کے پاس میرے لیے نہ تھا۔ بھابھی کا رویہ بھی ویسا ہی تھا۔

میں نے اب بحث کرنا اور شکایت لگانا چھوڑ دی تھی۔ میں نے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا تھا اور یہ جان لیا تھا کہ یہ گھر میری بھابھی اور بھتیجی کا ہے۔ میرا صرف ایک کمرہ ہے۔ جس کے اندر میں اپنی مرضی سے رہ سکتی ہوں۔ عادی تو میں ہو گئی تھی۔ مگر اس محرومی اور تنہائی کا کیا کرتی۔ جو میرے اندر بڑھتی جا رہی تھی۔ جو مجھے ہنسنے اور خوش رہنے نہیں دیتی تھی۔

ان دنوں جب میرا کوئی دوست نہ تھا ان ہی دنوں مجھے سمیر یوسف مل گیا جو بہت جلدی میرا اچھا دوست بن گیا۔ اس لیے کہ اس کے پاس بھی کئی پریشانیاں تھیں شاید۔ وہ بھی کسی محرومی کا شکار تھا۔ بہت ساری لڑکیوں کو وہ ناپسند تھا۔ مگر مجھے اچھا لگتا تھا۔ مجھے اس کی صورت میں ایک دوست مل گیا تھا۔ وہ بہت مزے مزے کی باتیں کرتا۔ مجھے ہنسانے کے لیے لطیفے سناتا

اور مجھ سے انگریزی ہارر موویز کی اسٹوریز سنتا۔ میں نے اپنی ساری سی ڈیز اور پلیئر اسے دے دیا۔ جو میرے لیے بے کار تھا اور اس کے لیے بہت اہم۔ اس کی محرومی چیزیں تھیں۔ میری محرومی انسان۔ ہم نے اپنی محرومیاں بانٹ لی تھیں۔ سنا تھا کہ بانٹنے سے دکھ بہت ہلکے ہو جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت عجیب تھی اور اس کے دکھ بھی عجیب تھے۔ وہ ساری چیزیں جو اس کے لیے معمولی تھیں۔ میرے لیے اہم تھیں۔ وہ بہت کھلے دل کی تھی۔ تحفہ ہمیشہ وہی دیتی تھی۔ جس دن میری جیب میں پیسے نہ ہوتے۔ وہ زبردستی اپنے پرس سے پیسے نکال کر میری جیب میں رکھ دیتی۔ میں جتنا بھی لالچی سہی' پر اس کی سچائی کے سامنے چھوٹا پڑتا جا رہا تھا۔ میرے پاس سواری نہ تھی۔ پورے چھ ماہ اس نے اپنی پاکٹ منی سے پیسے بچائے تھے اور مجھے بائیک لے کر دی تھی۔

اس دن مجھے خود سے بھی شرم آئی تھی۔ میں نے وہ چابیاں اسے واپس کر دی تھیں۔ مگر وہ کئی دنوں تک مجھ سے ناراض رہی۔ آخر کار اس کی ضد پر میں بائیک لے گیا۔ گھر میں بتایا کہ کسی دوست کی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے رکھی ہے۔ مگر اماں کے اصرار پر انہیں بتا دیا۔

ایک دن اس کا ڈرائیور اسے لینے نہیں آیا تھا تو میں اسے چھوڑ آیا۔ غالباً" اس کی بھابھی نے دیکھ لیا تھا۔ وہ دو دن بعد آئی اور بتایا کہ بھابھی نے بھائی کے کان بھرے ہیں۔ ان سے ڈانٹ کھائی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ مجھ سے بات کرنا بند کر دو۔ اپنی چیزیں واپس لے لو۔ مگر وہ نہیں مانی۔

ایک دفعہ اسے کچھ کتابیں خریدنی تھیں۔ میں اسے لے گیا۔ راستے میں تیز بارش ہو گئی اس کا گھر دور پڑتا تھا۔ میں اسے اپنے گھر میں لے گیا۔ اماں سے ملوایا۔ میں چاہتا تھا' وہ میرا گھر اور میری حیثیت دیکھ لے۔ تاکہ مجھ سے دور ہونے میں اسے آسانی ہو۔

وہ میرے گھر میں بڑی بے تکلفی سے پھرتی رہی۔ اس نے اماں ابا سے بہت سی باتیں کیں۔ میرے چھوٹے بہن بھائیوں سے بھی۔ ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کے لیے کتابیں بھیجے گی۔ اماں نے اس کے لیے کھانا بنایا۔ جو اس نے بہت شوق سے کھایا۔ وہ بہت خوش تھی اور میں حیران تھا۔

کچھ دیر بعد بارش رکی تو اماں نے مجھ سے کہا کہ جلدی گھر چھوڑ آؤ اسے۔ میں گلی سے نکلتے وقت اس کے سامنے شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ گلی گندے پانی سے بھر گئی تھی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی تو چھینٹے اس کے کپڑوں پر بھی پڑے۔ مگر وہ بڑی لاپروائی سے بیٹھی تھی۔ اماں نے اسے چھوٹی سی چھتری بھی پکڑا دی تھی۔ جو اپنے سے زیادہ اس نے میرے سر پر کی ہوئی تھی۔ میں تو عادی تھا اور اسے تو فوراً" زکام ہو جایا کرتا تھا۔

سارا راستہ وہ باتیں کرتی رہی۔ اس نے مجھے بتایا کہ زندگی میں پہلی بارش ہے۔ جب وہ ہنسی ہے اور اسے پہلی دفعہ بارش اچھی لگی ہے۔ وہ بہت خوش تھی۔ مجھے حیرت تھی اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں بارش کے بعد بہت مچھر ہو جاتے ہیں۔ گلیاں کتنے دن تک بھری رہتی ہیں گندے پانیوں سے۔ بجلی غائب ہو جاتی ہے۔ کتنی مشکل زندگی ہے ہماری۔ میں اسے بتا رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔ "یہی تو اصل زندگی ہے۔" تھی نا وہ عجیب۔

☼ ☼ ☼

اس دن صرف بھابھی ہی نہیں بھائی بھی میرا انتظار کر رہے تھے۔

اپنی خوشی میں مجھے یہ یاد کیوں نہ رہا کہ ویسے وہ میری خبر رکھیں یا نہیں۔ مگر میرے دیر سے آنے پر وہ بھی مشتعل ہو سکتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا' میں انہیں وجہ بتاؤں گی۔ میں ان کو سامنے دیکھ کر ڈرتے ڈرتے انداز میں اندر آئی اور انہیں سلام کیا۔

"وہ کون تھا؟" ان کا لہجہ بہت سخت' مگر دبا دبا سا تھا۔ وہ اپنا غصہ قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"سمیر ہے ساتھ پڑھتا ہے۔ میرا کلاس فیلو ہے۔"

"رشتہ کیا ہے تمہارا اس سے؟ جو یوں آدھی رات کو اس غیر لڑکے کے ساتھ آئی ہو؟" اب بھابھی آگے آئی تھی۔ مجھے اس سے یہی امید تھی۔

"تمہیں شرم نہیں آئی ایسا کرتے ہوئے؟ یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہارا شریف بھائی کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔" بھابھی نے بھائی کو چپ دیکھ کر دوسرا تیر پھینکا۔

"میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے میرے شریف بھائی کو کچھ شرمندگی ہو۔"

"نہیں نہیں۔ یہ تو بڑی نیکی کا کام ہے۔ جو تم رات کے اس وقت ایک غیر لڑکے کے ساتھ منہ اٹھائے پھر رہی ہو۔ اس دن بھی تم اسی کے ساتھ تھیں نا؟ پوچھو ولید! اس لڑکے کے ساتھ اس کا ایسا کیا تعلق ہے؟" آگ بھڑکانے کی وہ ماہر تھی اور اس وقت یہ کام وہ بخوبی کر رہی تھی۔

"بلاوجہ بات کو مت بڑھائیں بھابھی!" اپنے دفاع کے لیے اس وقت کوئی دلیل میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شاید میں بھی ذہنی طور پر خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔

"دیکھ لیا ولید! یہ اس کے لیے معمولی بات ہے۔"

"چپ کر جاؤ۔ میں خود بات کر سکتا ہوں۔ پوچھ سکتا ہوں۔ تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سخت غصے میں تھے۔ اس وقت وہ میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

"تمہاری اسی ڈھیل نے یہ دن دکھایا ہے۔ اب بچا کیا ہے۔ جب جوان بہن رات گئے آوارہ گردی کر کے لوٹے۔" وہ جاتے جاتے زہر کا تیر پھینکنا کہاں بھولی تھی۔

"یہ... یہ سب ایسا نہیں ہے بھائی... بھابھی بات کو غلط رنگ دے رہی ہیں۔" میں نے ایک کمزور سا احتجاج کیا۔

انہوں نے صرف ایک لمحہ میری طرف دیکھا تھا ان کے چہرے پر جتنا کرب، جتنا دکھ تھا، آنکھوں میں جتنی اذیت تھی۔ ایسی اذیت عمر بھر میں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی ان کی آنکھوں میں۔

وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی باہر سے۔ وہ رات کے اس وقت کہاں جا رہے تھے۔ میرا دل خوف زدہ ہو گیا۔ اسی دن میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ آج کے بعد سمیر یوسف میری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ میں اس سے نہیں ملوں گی۔ نہ بات کروں گی۔ اگر اس نے مجھے نہ چھوڑا تو میں کالج چھوڑ دوں گی۔ جتنی بے بسی آج میں نے ولید بھائی کے چہرے پر دیکھی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں خود کو کڑی سے کڑی سزا دوں۔

خود سے لڑتے جھگڑتے رات کے پچھلے پہر صبح کے درمیان مجھے نیند آگئی۔ صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ جب ملازمہ مجھے کمرے میں اٹھانے آئی تھی۔ مجھے فریش ہونے کا کہہ کر تھوڑی دیر میں ناشتا لے آئی۔ میں نے صرف چائے کا آدھا کپ لیا تھا۔ اس سے پوچھنے کے بعد کہ بھائی نے ناشتا کیا یا نہیں۔

اس نے کہا۔ وہ ان کا ناشتا دے کر آرہی ہے۔ تو وہ گھر پر تھے۔ کس وقت لوٹے تھے۔ گئے کہاں تھے۔ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے میرے بارے میں۔ میرا دل چاہ رہا تھا، باہر جاؤں۔ مگر ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر یہ مشکل انہوں نے حل کر دی۔ تھوڑی دیر میں وہ خود میرے کمرے میں آگئے تھے۔

ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے کی رنگت کچھ زرد سی۔ وہ بہت تھکے تھکے سے تھے۔ ایک رات میں وہ کتنے کتنے بدلے لگ رہے تھے۔

"تم نے ناشتا کیوں نہیں کیا؟" وہ میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی وہ مجھ سے کچھ اور پوچھیں گے۔

"چائے پی لی ہے۔" میرا مختصر سا جواب تھا۔

"تمہیں مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔" وہ ادھ کھلی کھڑکی سے آتی روشنی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہنا چاہیے تھا؟" میرا دل اب بھر آرہا تھا۔

"تم اسے پسند کرتی ہو؟ تمہیں مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔ تم یوں پھرنا۔ میں بھی اپنی ٹین ایج میں بھی یوں لڑکیوں کے ساتھ نہیں پھرا۔ خیر! میرے پاس تو وقت ہی نہ تھا ان فضولیات کے لیے۔"

میں اس کو اپنی صفائی میں کوئی وضاحت دینا چاہ رہی تھی۔ مگر یہ بھی چاہ رہی تھی کہ پہلے وہ بات کر لیں۔ پھر کچھ کہوں۔

"میں رات اس کے گھر گیا تھا۔ میں نے اس کے ماں باپ سے بات کی ہے۔ میں اس لڑکے سے ملا ہوں۔" وہ کہہ رہے تھے اور میں منہ کھولے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کیا کہنے لگے تھے۔ اب کیا رہ جاتا ہے۔

"وہ سب تمہارے لیے سوٹ ایبل نہیں ہے۔ تم شاید اس گھر میں نہ رہ سکو۔ اس کے باوجود بھی اگر تم وہاں انٹرسٹڈ ہو تو کوئی تو وجہ ہوگی۔"

"میں آئندہ اس سے نہیں ملوں گی۔" میں صرف اتنا کہہ سکی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آج رات وہ نکاح کر کے تمہیں یہاں سے لے جائے گا۔ میرے کچھ دوست ہیں۔ وہ شریک ہوں گے۔ تم اس کے ساتھ جا کر کچھ چیزیں خرید لو۔ باقی میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

"بھائی...!" میں حیران تھی یا صدمے سے گنگ۔ اچانک اتنا بڑا فیصلہ۔ ایسا تو خود میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔

بات مکمل کر کے وہ اٹھ گئے۔ میرے بیڈ کے سرہانے بھاری قیمت کا چیک سائن کر کے چھوڑ گئے تھے۔

ابھی تو مجھے بہت کچھ کہنا تھا۔ ابھی ان کو بھی مجھے بہت کچھ کہنا تھا۔ نہ ڈانٹا، نہ برا بھلا کہا، نہ ملامت نہ سختی۔ نہ ہی وہ شکوہ زبان پر لائے، جو ان کے لہجے سے، ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

میں نہ اقرار کر پا رہی تھی نہ انکار۔ اسی وقت سمیر کا فون آیا۔ وہ خود حیران تھا، مگر وہ بہت خوش تھا۔ جبکہ میرے اندر کوئی کیفیت نہ تھی۔ اتنی جلدی میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا۔ ابھی تو میں خود کو اور اسے سمجھ رہی تھی۔ ابھی کچھ وقت درکار تھا۔

سمیر اسے ہماری خوش نصیبی کہہ رہا تھا اور میں اس خوش نصیبی کا تجزیہ نہیں کر پا رہی تھی۔

شادی کی شاپنگ سمیر نے کی۔ سب کچھ اس کی پسند کا تھا۔ میں ابھی تک حواسوں میں نہیں تھی۔ کوئی ایسے اپنی شادی کی شاپنگ کرتا ہے کیا۔ اتنی جلدی۔ نہ کوئی منگنی، نہ گانا بجانا، نہ رسمیں، نہ ہلا گلا، نہ چہک، نہ خوشی، نہ سہیلیاں...

"اسی طرح میرے بھائی کی شادی ہوئی۔ اسی طرح میری... ہم دونوں کے ساتھ سب کچھ الگ تھلگ کیوں ہوتا ہے۔" میرا دل خالی خالی سا تھا۔

بڑے آرام سے رخصت ہو کر ایک اور گھر میں آگئی۔ مجھے یقین تھا سمیر مجھے خوش رکھے گا۔ یہ لوگ میرا خیال رکھیں گے۔ مگر... پھر کیا تھا، جس کی وجہ سے میرا دل بے سکون تھا۔ ڈر رہا تھا۔ ہول رہا تھا۔

میں خود سے شرمندہ شرمندہ سی تھی۔ مگر سمیر کے گھر والے خوش تھے۔ خود وہ بہت خوش تھا اور یہی سب دیکھ کر میں کچھ مطمئن ہو گئی۔ سمیر کے رویے اور دوستانہ مزاج سے میرے دل پر چڑھی گرد اترنے لگی۔ میں خوش رہنا سیکھ رہی تھی۔

یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ تھوڑا مشکل۔ تھوڑا منفرد۔

یہاں سے سیکھنے کے لیے مجھے بہت کچھ ملا۔

☆ ☆ ☆

وہ غیر ارادی طور پر میری زندگی میں آگئی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی اور اس کی مشکل نصیبی۔ مجھے اندازہ تھا اس کے لیے یہاں رہنا مشکل ہوگا۔ یہ بھی کہ وہ جلدی بے زار آجائے گی۔ یہ نہ ہو کہ کچھ ہی دنوں بعد وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے۔ اسی لیے میں ہر ممکن کوشش میں تھا کہ وہ کسی طرح میرے ساتھ سیٹ ہو جائے۔ میں روز اسے باہر لے جاتا۔ میں ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا۔ گھر میں بھی سب اس کا

خیال رکھتے تھے۔ اماں بھی خوش تھیں۔ چچا کی فیملی ہم سے خفا ہو گئی تھی۔ جس کی تھوڑی بہت پروا اگر تھی بھی تو صرف ابا کو۔ مگر ان کا رویہ بھی الماس کے ساتھ اچھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید وہ خود تھی۔

میرے بہن بھائیوں کے لیے چیزیں لاتا' ان سے باتیں کرتا' ان کو ہوم ورک کراتا سمجھاتا۔ وہ ابا کے ساتھ بھی بیٹھتی تھی۔ اماں کے ساتھ کچن میں کھڑے ہو کر کام کرتی تھی۔ اس نے اتنی جلدی یہ سب قبول کر لیا تھا۔ جس پر مجھے حیرانی بھی تھی اور خوشی بھی۔

اس کے بھائی مجھے اپنے پاس بلا کر بہت کچھ سمجھاتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا۔ میں دل سے انہیں پسند نہیں ہوں۔ وہ مطمئن نہیں ہیں۔ جب ہی وہ مجھے بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے مشوروں پر عمل کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ جتنے محنت طلب ان کے مشورے تھے ان سے مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی۔

اس طرح تو ایک عمر گزر جائے گی۔ بہر حال میں ان کی ہاں میں ہاں ملا کر اٹھ آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ میں پڑھائی دوبارہ شروع کروں۔ الماس بھی یہی چاہتی تھی۔

مگر فی الحال میں ان دنوں کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے دبئی کے ٹکٹ بھیجے تھے' جو الماس نے واپس کر دیے۔

انہوں نے پیسے بھی بھجوائے تھے' جو اماں کے ہاتھ میں آئے تھے۔ کچھ انہوں نے رکھ لیے۔ کچھ مجھے دے دیے۔ جس سے میں نے گھر میں کچھ ضرورت کی چیزیں ڈال لیں۔ ولید بھائی وقفے وقفے سے پیسے بھجواتے رہتے تھے۔ اماں الماس سے چھپا لیتی تھی۔ پتا تھا' وہ واپس کروا دے گی۔ میں بھی چپ تھا کہ چلو گھر کے مسائل کچھ حل ہو گئے۔

میں نے الماس کی ضد پر پڑھائی شروع کر دی۔ مگر بہت بے دلی سے۔ میں بس اس کی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔

میری سب سے بڑی خواہش ابھی ادھوری تھی۔

جس کے لیے مجھے اور انتظار کرنا تھا۔ مجھے پتا تھا' الماس بہت جلدی بے زار آ کر کہے گی۔ کسی اور جگہ گھر لے لو اور میں اس کی یہ خواہش بھائی کے سامنے رکھ دوں گا۔ اس کے بعد ہم الماس کی جائیداد کا حصہ لے لیں گے اور پھر پوری زندگی آرام سے گزرتی جائے گی۔ مگر اس کے لیے ابھی انتظار کرنا تھا۔ انتظار جو کبھی بھی کتنا لمبا ہو جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼
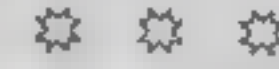
میں یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری لے چکا تھا۔ اب اچھی ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اماں اب میرے پیچھے پڑی تھیں کہ میں منگنی کر لوں اور ملازمت ملنے کے بعد شادی۔

میں نے سوچا' یہی وقت ہے۔ اب میں اماں سے فائنل بات کر لوں۔ مگر اس سے پہلے میں الماس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ابھی پچھلے سال میں نے اسے کالج جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہماری صرف سلام دعا ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے دو تین دفعہ دیکھا۔ مگر مل نہ سکا۔ اب میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اسے بچپن سے پسند کرتا ہوں۔ مجھے اگر شادی کرنی ہے تو صرف اسی سے۔ میں اس کا انتظار کر سکتا ہوں۔ وہ پڑھ لے۔ جب تک میں کوئی اچھی نوکری ڈھونڈ لوں۔ میں دوستوں کے ساتھ چھوٹا موٹا کاروبار بھی کر رہا تھا۔ ہم اچھے علاقے میں شفٹ ہونے والے تھے۔ بہت جلد میرا ارادہ اچھی سی گاڑی خریدنے کا تھا۔ میں اس کو سہولیات دینے کے قابل ہو رہا تھا۔ بس تھوڑا سا انتظار تھا۔ میں کئی باتیں سوچتے ہوئے اس کے گھر گیا۔

ولید بھائی اس وقت گھر پر نہ تھے۔ ان کی بیوی ملیں میں ولید بھائی کا انتظار کرنے کے بہانے بیٹھ گیا۔

انہوں نے میرے لیے چائے منگوائی۔ میرے بارے میں پوچھنے لگیں۔ مختصر سے تعارف کے بعد ہم ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک میں نے الماس کا پوچھا۔

ان کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ انہوں نے بتایا۔ اس کی شادی کو سات آٹھ ماہ ہو گئے ہیں اور میرے پیروں سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔

"کب... کیسے اور کہاں؟" کے علاوہ جو سارے الفاظ تھے۔ وہ حلق میں ہی رہ گئے تھے۔

پھر وہ نجانے کیا کیا بولتی گئیں۔ "چکر تھا اس کا لڑکے کے ساتھ رات دیر تک گھومتی تھی۔ بدنامی کے ڈر سے بھائی نے شادی کروا دی۔"

میں اس سے زیادہ نہ سن سکا تھا۔ بات بیچ میں کاٹ کر اٹھ گیا۔ چائے کا کپ آدھا باقی تھا۔ انہوں نے روکا مگر میں بدحواس سا معذرت کر کے اٹھ آیا۔

میرا ذہن سوچوں کے شور کی زد میں تھا۔

گھر آ کر اس رات مجھے سخت بخار ہو گیا۔ میں نے آخر یہ کیوں نہ سوچا کہ وہ کسی کو پسند کر سکتی ہے۔ میں کیوں اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس یک طرفہ محبت نے مجھے بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ سنا تھا' وہ شادی کے بعد خوش ہے۔ وہ کون ہے' کیا ہے۔ جس کو وہ پسند کرتی ہے۔ جس سے شادی کر کے وہ خوش ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سب بے کار تھا۔ کچھ دنوں کی بے چینی کے بعد میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اس لیے کہ مجھ سے وابستہ اور بھی لوگ تھے۔ ابا کے بعد اماں کی ساری امیدیں مجھ ہی سے وابستہ تھیں۔

میں نے جاب کی تلاش شروع کر دی۔ کاروبار کی طرف دھیان دینے لگا۔ مجھ سے چھوٹا زین جو گریجویشن کے بعد آگے نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ اسے کاروبار میں لگایا اور گھر تبدیل کرنے کے فوراً بعد اس کی منگنی کر دی اور پھر سال کے اندر اندر شادی بھی۔ تاکہ اماں کی تنہائی کا احساس ختم ہو۔

آہستہ آہستہ میرے پاس دنیا کی ہر آسائش آتی گئی اچھی ملازمت' کاروبار' گھر' گاڑی۔ ساری حسرتیں آہستہ آہستہ پوری ہو رہی تھیں۔ مگر ایک حسرت جو دل میں ہی رہ گئی تھی۔ ایک کمی تھی' جو ان ساری چیزوں اور آسائشوں کے بعد بھی رہتی تھی۔ وہ مکمل خوشی اور مکمل سکون میں کہاں سے لاتا۔ دنیا کا کوئی

شخص بھی مکمل نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہر شخص مکمل ہونا چاہتا ہے۔ نجانے کیوں۔

☼ ☼ ☼

اس کے ساتھ شادی کے شروع شروع کے دن بہت اچھے تھے۔ میں نے اس کے گھر میں پہلی مرتبہ سچی خوشی دیکھی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا' وہ لوگ مجھے پا کر خوش ہیں۔ وہ سب بہت سادہ تھے۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی۔ میں صرف اس لیے خوش تھی کہ میں ان سب کے لیے اہم ہوں۔ میں نے اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کے بہن بھائیوں کو دے دی تھیں۔ میں اس کی ماں کو بھی کبھی پیسے دے دیتی تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ وہ لوگ مجھ سے ہمیشہ خوش رہیں کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ میں ہر طرح سے ان کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی اور ایڈجسٹ ہو بھی گئی تھی۔

گو کہ وہاں مجھے کم سہولتیں میسر تھیں۔ کھانا خود پکانا پڑتا تھا اور میں پکانا سیکھ رہی تھی۔ مجھے ڈسٹ الرجی تھی۔ مگر اس کے باوجود میں جھاڑ پونچھ اور صفائی کا کام بھی کر لیتی تھی۔

ایک دفعہ بھائی اچانک آ گئے۔ پہلی دفعہ وہ گھر پر مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اس دن میں نے پورے گھر کی صفائی کی تھی۔ فرش دھویا تھا۔ اس وقت میں دھلے ہوئے کپڑے تار پر پھیلا رہی تھی۔ کچن میں ہنڈیا الگ چڑھی ہوئی تھی۔ میں باری باری سارے کام دیکھ رہی تھی۔ وہ اچانک صحن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے شاید پہچاننے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ میں شرمندہ سی ہو گئی وہ صرف چند منٹ رکے تھے۔ اس دوران وہ چپ تھے۔

میرے پاس بھی بولنے کو کچھ نہ تھا۔

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں دکھ اور شکایت۔ جیسے وہ مجھے ڈانٹنا چاہتے ہوں... میری ساس اسی وقت گھر آئی تھیں۔ بھائی کے سامنے وہ بھی کچھ شرمندہ ہو گئی تھیں۔ وہ چپ چاپ میری

ڈریسنگ پر کچھ رقم چھوڑ کر باہر نکلنے لگے۔

"بھائی! یہ بھول رہے ہیں آپ۔" میں نے وہ لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔ ان کو دکھ ہوا ہوگا۔ مگر مجھے یہی بہتر لگا۔ آخر کب تک میں ان سے پیسے لے لے کر اپنی ضروریات پوری کرتی۔ کب تک میں ان پر بوجھ بنی رہتی اور پھر جیسی بھی زندگی تھی میرا نصیب تھی۔ مجھے اپنی زندگی کو خود ہموار کرنا تھا۔ میں چاہتی تھی سمیر کچھ کرلے۔ مجھے اندازہ تھا وہ سست تھا۔ محنت اور لگن اس کے اندر کم تھی۔ مگر پھر بھی وہ میری خاطر بڑھ رہا تھا۔ چھوٹا موٹا کام شروع کردیا تھا۔ میں نے بھی اپنے اخراجات گھٹا لیے تھے۔ چیزوں کی ضرورت کیا ہوتی ہے۔ اس کا احساس ضرور ہوا تھا۔ مگر چیزوں سے زیادہ انسانوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ ان کی سچائی کی۔ ان کی محبت کی اہمیت ہوتی ہے۔ میں نے چیزوں سے انسانوں تک کا سفر کیا تھا۔

مگر وہ لوگ۔۔۔ وہ لوگ انسانوں سے چیزوں کی طرف کھنچ رہے تھے۔ یہ احساس میرے لیے جان لیوا تھا۔ اس کا پہلا احساس تب ہوا' جب بھائی کو لفافہ لوٹانے پر میری ساس نے مجھے پہلی مرتبہ ڈانٹا۔

☼ ☼ ☼

میں زندگی میں تبدیلی چاہ رہا تھا۔ مگر زندگی مزید الجھ رہی تھی۔ میری ذمہ داریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ میں مسائل میں گھرتا جارہا تھا اور وہ مجھ سے اور محنت کی توقع رکھ رہی تھی۔ گھر والوں کا دباؤ لگ بڑھ رہا تھا کہ کسی اچھی جگہ گھر لے لو۔ میں اب کیا کرتا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ وہ میرے گھر میں آکر میرے حالات تبدیل کرے گی۔ مگر وہ خود صابر شاکر بن کر میرے ساتھ رہ رہی تھی۔ ساڑھے تین سال ہوگئے تھے ہماری شادی کو' جب میں نے اسے کہا کہ۔

"بھائی سے کچھ رقم لے لو۔ کاروبار کریں گے تو حالات کچھ بہتر ہوں گے۔" مگر وہ ملازمت ڈھونڈنے لگی۔ اس نے مجھ سے پیسے لینے چھوڑ دیے تھے۔ اپنے خرچے وہ کیسے پورے کرتی ہے۔ مجھے پتا بھی نہ تھا۔

کچھ پیسے وہ اماں کو بھی دیتی تھی گھر کے خرچے کے لیے۔ چھوٹے بہن بھائی بڑے ہورہے تھے۔ خرچے بڑھ رہے تھے۔ اماں کا دباؤ مجھ پر بڑھتا جارہا تھا۔

ہمارے درمیان تلخی بڑھتی جارہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا' وہ میری بات مان لے۔ اس کا بھائی اس کے لیے ایک اچھے گھر کا بندوبست کرسکتا تھا۔

میں نے ہر طرح سے اسے یہ بات سمجھائی۔ مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ان ہی دنوں مجھے سیٹھ اکرام ملا۔ میرے ایک دوست نے مجھے اس سے ملوایا تھا۔ میں پہلی ہی ملاقات میں اس کی شخصیت اور پیسے کی ریل پیل سے متاثر ہوگیا۔ میری خواہش تھی' کسی طرح سیٹھ مجھے اپنے کاروبار میں ساتھ ملالے۔ مجھے قرضہ دے دے یا کام ہی دے دے۔ مجھے پتا نہ تھا کہ سیٹھ کا ارادہ کچھ اور ہے۔

☼ ☼ ☼

ان سب لوگوں کے نزدیک چیزوں کی اہمیت تھی انسانوں کی نہیں۔ جب میرے پاس دینے کو کچھ نہ رہا تو مجھ سے وابستہ ساری دلچسپیاں ختم ہوگئیں۔ ان سب کا رویہ میرے ساتھ برا ہوگیا۔

میں ان کی چاہ میں کیا کیا نہ کرتی رہی اور یہ سب ایک دفعہ پھر میں ٹوٹی تھی۔ جب سمیر نے بھی مجھ سے یہی بات کی۔ مجھے پتا تھا۔ میرے بھائی مجھے سب کچھ دے سکتے ہیں۔

مگر میں کیوں ان کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔ انہوں نے جو کچھ کمایا ہے' اپنی محنت سے کمایا ہے۔ ابا کا جو کچھ تھا' اس میں سے وہ مجھے بہت کچھ دے چکے ہیں۔ مگر اب نہیں۔ اسی بات سے میرے اور سمیر کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے۔ حالانکہ میں نے ملازمت شروع کردی تھی۔ میں اپنا خرچا خود اٹھایا کرتی تھی۔ میں نے اس دن کے بعد اس سے ایک روپیہ بھی نہیں لیا۔ پھر بھی۔۔۔ اس کا لالچ کیوں بڑھتا جارہا تھا۔ کیوں وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

ہمارے درمیان کچھ نہ رہا تھا۔ کس بھروسے کے

تحت میں نے زندگی کے یہ سب سے کڑے چار سال گزارے تھے۔

کس خوشی کو لے کر میں اتنی جستجو کرتی رہی۔ اپنی زندگی کو بنانے کے لیے جو چار سال میں کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی رہی تھی۔ میری ساری محنت' قربانی' صبر اور ساری ریاضت ایک پل میں مٹی میں مل گئی۔

صرف تین لفظ طلاق کے تھے۔ جنہوں نے پھر سے میری زندگی کو بدل دیا تھا۔ میں آسمان پر نہ تب تھی۔ نہ اب ہوں۔

بس مجھے بار بار اٹھا اٹھا کر پٹخا گیا تھا۔ میرے ساتھ وہ سلوک ہوا تھا' جو سلوک لوگ چیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ جب تک ضرورت رہی استعمال کیا۔ جب ضرورت نہ رہی تو پھینک دیا۔

اب پچھلے پندرہ روز سے میں اپنے بھائی کے گھر پر ہوں۔

اور پچھلے پندرہ روز سے میری بھابھی روز ایک مسئلہ کھڑا کردیتی ہے۔ مجھے پتا ہے' وہ مجھے یہاں سکون سے رہنے نہیں دے گی۔ مگر دوسرا گھر کہاں سے لاؤں۔ مجھے بھائی سے بات کرلینی چاہیے۔ شاید وہ مجھے ایک کرائے کا فلیٹ ہی لے کر دے دیں۔ مگر فی الحال میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ میں کچھ دن جی بھر کر رونا اور سونا چاہتی ہوں۔

مگر میرا یہ رونا اور سونا بھی میری بھابھی سے برداشت نہیں ہو پارہا تو میں کیا کروں۔

مجھے پتا ہے بھائی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا' میں ان سے کیا بات کروں۔ وہ ہر روز دن میں کئی مرتبہ میرے کمرے میں آتے ہیں۔ میرے پاس بیٹھتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہیں۔ کچھ دیر نجانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔ پھر اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

میری بھابھی ان کو گھیر لیتی ہے۔ ان سے پوچھتی ہے۔ ان کو مجبور کرتی ہے۔ ہر روز ان کی ایک بحث ضرور ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بچی بھی ڈسٹرب ہونے

لگی ہے۔ مجھے پتا ہے' اپنی ماں کی طرح وہ بھی مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میرے پاس بلانے پر بھی وہ میرے پاس نہیں آتی۔ وہ دور سے مجھے دیکھتی ہے۔ اس کے انداز میں جھجک ہے۔ اجنبی پن ہے۔ رکھائی ہے اسے اس کی ماں روکتی ہے۔ وہ سارا دن زہر بھرتی رہتی ہے اس کے دل میں۔ مجھے پتا ہے ایک دن یہ بچی بھی مجھ سے کہے گی کہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ کیوں کہ یہ گھر اس کے باپ کا ہے اور اس کی ماں کے شوہر کا ہے۔

میں چاہتی ہوں' اس سے پہلے میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں۔ کم از کم عدت کے دن مجھے یہاں پورے کرنے ہیں۔ اس کے بعد میرا ٹھکانا کیا ہوگا۔ یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

کل میں نے اسے فٹ پاتھ کے کنارے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بلاشبہ وہی تھی۔ مگر مکمل طور پر بدلی ہوئی۔ بہت سادہ حلیے میں۔ سست رفتار سے چلتی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔

کیا وہ گھر چھوڑ کر آگئی تھی۔ اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔

میں نے گاڑی روک کر ہارن دیا۔ اسے آواز بھی دی۔ مگر وہ رکی نہیں۔ نہ اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ باہر اس قدر ٹھنڈ تھی۔ میں نے گاڑی سائیڈ پر روکی اور اس کے پیچھے چلا آیا۔ اس کے سامنے جاکر میں نے سلام کیا۔ اس کا حال پوچھا۔ جواب میں وہ غائب دماغی سے مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ کتنے افسوس کی بات تھی کہ جسے بھولنے کی کوشش میں' میں ناکام تھا' وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی تھی۔ میں کس منہ سے اس سے اپنا تعارف کرواتا۔ میں نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا مگر وہ اسی انداز میں میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے اس سے کہا۔ "باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں عجیب

کیفیت تھی۔ میرے بہت بار کہنے پر وہ گاڑی میں بیٹھ تو گئی، مگر خاموش تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ اتنی رات گئے یوں سامان اٹھائے سڑکوں پر پھر رہی ہے۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اگر اس کے ساتھ شوہر نے جھگڑا کیا ہے تو وہ صلح کرلے۔ معاف کردے۔ گھر چلی جائے۔ گھر سے باہر عورت محفوظ نہیں ہوپاتی۔ مگر وہ کچھ تو کہتی۔

میں نے اس سے اس کے گھر کا پتا پوچھا تو بھی وہ اسی طرح مجھے دیکھتی رہی۔ اس پل مجھے اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں لگا۔

وہ بہت پریشان اور تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ میں نے اسے پانی کی بوتل پکڑائی۔ وہ آدھی سے زیادہ بوتل خالی کرگئی۔ تب مجھے لگا اس نے بہت دیر سے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ میں اس کے لیے برگر اور کافی کا کپ لے آیا۔ اس نے مکمل خاموشی سے برگر کھایا اور کافی کا کپ خالی کیا۔

اس دوران بھی میں ہی بولتا رہا۔ بس وہ لمحے بھر کو کچھ حیرت سے میری طرف دیکھتی اور پھر توجہ دوسری جانب کرلیتی۔ میں نے ایک دفعہ پھر پوچھا کہ اسے کہاں چھوڑوں؟ اس کے گھر کا کیا پتا ہے۔

اب کی بار اس نے کہا۔ "اس کا کوئی گھر نہیں ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ میں اسے دارالامان چھوڑ دوں۔ یقیناً" وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھی۔ جب ہی ایسی باتیں کررہی تھی۔ میرے پاس اس کے بھائی کے گھر کا پتا تھا۔ اس کا نمبر بھی۔ میں چاہ رہا تھا۔ میں اسے وہاں چھوڑوں۔ میں نے اس سے کہا بھی۔ مگر اس کی وہی رٹ تھی۔ اس کی ضد سے مجبور آکر میں نے اسے دارالامان چھوڑ دیا۔ مگر میرا دل بہت بے چین تھا۔ اس کے گھر کا نمبر بھی بند تھا۔

میں دوسرے دن اس سے ملنے کے لیے گیا۔ وہ اسی طرح خاموش تھی۔ میں اسے کچھ کھانے پینے کی چیزیں دے کر واپس آگیا۔

دو دن بعد پھر میں وہاں گیا۔ اب وہ کچھ بہتر تھی۔

اس نے میری باتوں کے سرسری جواب بھی دیے۔ بات کرتے کرتے وہ کھو جاتی۔ مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ کچھ دن بعد میں نے اس کے بھائی کا نمبر ٹرائی کیا۔ ان کی آواز میں پریشانی نمایاں تھی۔ میں نے الماس کا نام لیا تو وہ پریشانی سے مجھ سے کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں جانتا ہوں۔ وہ کہاں ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ مجھ سے ملیں۔

وہ ایک گھنٹے میں میرے پاس پہنچ گئے۔ ان کی پریشانی سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے جلد از جلد ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو فوراً" الماس کے پاس لے گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہا تھا۔ مگر پھر بھی میں اس کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ میں نے اپنا سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے خوش رکھوں گا۔ مگر میں اسے خوش نہ رکھ سکا۔ تمہیں پتا ہے بلال! میں نے سوچا تھا۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ مگر وہ بڑی ہورہی تھی۔ بہت سی باتیں تھیں۔ جو میں اسے سمجھا نہیں پاتا تھا۔ وہ چڑچڑی ہورہی تھی۔ بگڑ رہی تھی۔ سب نے مجھ سے کہا شادی کرلو۔ پھر میں نے اپنی کلاس کی لڑکی سے شادی کیوں نہ کی؟"

ولید بھائی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ان کے اندر بہت غبار تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ مجھ سے کھل کر بات کررہے تھے۔

"اس لیے بلال! کہ ہماری کلاس کی لڑکی نہ اسے ٹائم دیتی، نہ توجہ، نہ پیار۔ میں نے ایک غریب لڑکی سے شادی کی کہ وہ میرے مسائل سمجھے گی۔ گھر سنبھال لے گی۔ مگر وہ تو آتے ہی گھر پر مکمل حکمرانی کے خواب دیکھنے لگی۔ یہ اس کا حق تھا۔ مگر اس نے بہت عجلت سے کام لیا۔ ایک دفعہ اس عورت کو میں نے نکال بھی تھا۔ مگر وہ میرے بچے کی ماں بننے جارہی تھی۔ اس لیے مجھے اسے واپس لانا پڑا۔ میں الماس کو اس لیے سمجھاتا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری خود اٹھالے۔ وہ

مضبوط بنے۔ میں سمجھ رہا تھا۔ وہ اب بڑی ہوگئی ہے۔ اسے اب میری توجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کی ذمہ داری میں اسے اگنور کرتا گیا۔ وہ کالج جانے لگی تھی۔ پھر میں نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا۔ مجھے پتا تھا۔ وہ اس کا کلاس فیلو ہے۔ اس کا دوست ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ میری بیوی اس کے بارے میں غلط باتیں کرنے لگی۔ میں نے سوچا اگر میں اپنی بیوی کا منہ نہیں بند کرسکتا تو کسی اور کو باتیں کرنے سے کیسے روکوں گا۔ اس سے پہلے کوئی بات کرتا میں نے بڑے آرام سے اس کا نکاح کردیا۔ میں نے سوچا تھا میں گھر لے کردوں گا۔ پیسہ دوں گا تو وہ دونوں خوش رہیں گے۔ مگر مجھے بہت جلدی پتا چل گیا کہ وہ سب لوگ لالچی تھے۔" وہ تھوڑی دیر کو رکے۔ جیسے اپنی ہمت مجتمع کررہے ہوں۔ پھر بولنا شروع کیا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں بلال! اپنی منی کو کس حال میں دیکھا تھا میں نے۔ ٹوٹ گیا تھا میں۔ میرے گھر میں ایک غریب گھرانے کی لڑکی میری بیوی کی حیثیت سے عیش کررہی تھی اور میری بہن، جو ہمیشہ میرے گھر میں سہمی رہی تھی۔ وہ کس حال میں زندگی گزار رہی تھی۔ شاید نصیب اسے ہی کہتے ہیں۔ شاید بیٹیوں کے ماں باپ اسی نصیب سے ڈرتے ہیں۔" انہوں نے ایک آہ بھری۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

"میں چاہتا تو اپنی بہن کے لیے محل بنادیتا۔ مگر میں چاہتا تھا، یہ سب سمیر خود کرے۔ مجھے پتا تھا، وہ لالچی ہے۔ پورے چار سال وہ آزمائش میں رہی۔ پورے چار سال میں اداس رہا۔ پھر ایک دن اس لالچی انسان نے اسے چھوڑ دیا۔ یقین جانو، مجھے دکھ نہیں ہوا۔ میں نے سوچا تھا میں اسے سمجھاؤں گا۔ میں کوشش کروں گا، وہ خوش رہے۔ مگر میری بیوی نے ایک دفعہ پھر اس کا جینا دشوار کردیا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ منی اپنی بھابھی سے نفرت کرے۔ مگر اس کی ماں اس کے اندر نفرت بھر رہی تھی۔ میں الجھ گیا بلال۔" ولید بھائی جیسے رو دینے کو تھے۔ "عدت کے دن پورے کرکے وہ

کچھ دن پہلے اچانک گھر سے چلی گئی۔ اس پوری رات میں سڑکوں پر پھرتا رہا۔ یقین کرو بلال! ان دنوں میں، میں جتنا رویا ہوں۔ جتنا میں نے اسے ڈھونڈا ہے۔ اس کے لیے دعائیں کی ہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ میں اس سے کتنا شرمندہ ہوں۔ میں اسے کیسے بتاؤں کہ اس کا بھائی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس کا خیال نہیں رکھ پایا۔"

ولید بھائی کی آواز بھرا گئی۔ وہ چپ ہوگئے۔

میرے پاس تسلی دینے کے لیے لفظ نہ تھے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ نہ کہہ پایا۔ انہوں نے واپسی پر مجھ سے ایک عجیب سوال کیا۔ میں تو حیران رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

میں سمیر یوسف۔ احساس جرم اور احساس ندامت کیا ہوتا ہے۔ یہ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ اس کے ساتھ پورے چار سال گیم کھیلا تھا، میں نے اور اب جب اس گیم میں ہار گیا۔ میرے ہاتھ کچھ نہ لگا تو اسے چھوڑ دیا۔ کچھ بھی نہیں سوچا۔ نہ اس کی قربانیاں، نہ وفا، نہ سچائی، نہ ہی محبت۔ مجھے صرف پیسے کی ضرورت تھی اور اسی لیے میں زندہ رہتا تھا۔ سیٹھ اکرام کے پاس بہت دولت تھی، جو مجھے چاہیے تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "میری بیٹی سے شادی کرلو۔ وہ تھوڑی سی بددماغ ہے۔ تھوڑی سی نفسیاتی ہے۔ اس کا علاج چل رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہوجائے گی۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں اس کی شادی کردو۔"

بدلے میں وہ اپنی ساری دولت میرے نام کررہا تھا۔ سیٹھ کے مرنے کے بعد سب کچھ میرا ہوجاتا تھا اور اس کے ہوتے ہوئے بھی تو میں جائیداد کا مالک تھا۔ میں نے فوراً" شادی کرلی۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی ایک بڑے گھر میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس اپنی گاڑی ہے، پیسہ ہے۔ وہ سب خوش ہیں۔ ایک میرا دل خالی ہے۔ اب کوئی نہیں، جو مجھ سے محبت کرے۔ میرا

خیال رکھے۔ گھر آنے پر مجھ سے کھانا پانی پوچھے۔ مجھ سے باتیں کرے۔ میری جس عورت سے شادی ہوئی ہے وہ کبھی مجھے کمرے میں آنے دیتی ہے۔ کبھی نہیں۔ کبھی اچانک اسے دورہ پڑتا ہے۔ وہ میرے بال نوچتی ہے۔ میرے چہرے پر جگہ جگہ اس کے ناخنوں کی کھرونچیں پڑ گئی ہیں۔ میں اب اس کے پاس نہیں جاتا۔ وہ صرف نفسیاتی نہیں مکمل طور پر پاگل ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اس کے ٹھیک ہونے کے امکانات پچاس فیصد ہیں۔ پتا نہیں وہ ٹھیک ہوگی بھی کہ نہیں۔۔۔ مجھے بس انتظار کرنا ہے۔

میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اس صورت میں یہ عیش، یہ گھر، گاڑی سکھ بھی چھن جائے گا۔ میں اس سب کا عادی ہو گیا ہوں۔ میں دوسری شادی بھی نہیں کر سکتا۔ کم از کم جب تک اکرام سیٹھ زندہ ہے تب تک تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے بس اسی طرح جیے جانا ہے۔ میرے پیسے کی پیاس تو بجھ گئی ہے۔ مگر میرے اندر جو پیاس بڑھ رہی ہے اسے کون بھرے گا؟ الماس کے ساتھ کی ہوئی ساری زیادتیاں یاد آتی ہیں۔ یہ میری بے چینی ہے، جو پیسے سے بھی نہیں مٹ پاتی۔ یہ شاید اس کے دکھ کی آہ ہے۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پتا ہے، ولید بھائی نے مجھ سے کیا پوچھا تھا۔ انہوں نے پوچھا تھا کیا میں تم سے محبت کرتا ہوں؟ کیا میں شادی کروں گا تمہارے ساتھ؟ کیا میں تمہیں خوش رکھ سکتا ہوں؟"

تو میں حیران رہ گیا تھا۔ میں نے ان سے فوراً" کہا تھا کہ میں الماس سے شادی کروں گا۔ مگر میں نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے تمہارے علاوہ کسی سے شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ تب ہی تو میں ابھی تک کنوارا پھر رہا ہوں۔ میں نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ جو میں کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا۔ میں الماس کو خوش رکھ سکتا

ہوں۔ مگر یہ سب میں تمہارے سامنے کہہ رہا ہوں۔ چاہے تم مجھ سے کوئی ایسا سوال نہ بھی کرو۔ تب بھی میں کہتا ہوں۔ میں صرف تمہارے لیے اتنی محنت کر رہا ہوں۔ میں صرف تمہارے قابل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ میرا اظہار کتنا ضروری ہے۔ مجھے احساس نہ تھا کہ اس انتظار میں تم مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔ میں نے پھر بھی تمہاری خوشیوں کے لیے دعائیں کی تھیں۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ دن میری زندگی میں آئے گا کہ کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں تمہیں خوش رکھ سکتا ہوں یا تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ اور مجھے ان سارے سوالوں کے جواب تمہارے سامنے دینے پڑیں گے۔"

یہ بلال احمد تھا، جو مجھ سے یہ سب کہہ رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پتا ہوتا تو میں سمیر یوسف کے پیچھے کیوں جاتی۔۔۔ مجھے صرف محبت کی پیاس تھی اور اسے پیسے کی پیاس۔ ہر کوئی اپنی پیاس میں بھاگتا ہے۔ افسوس! ابھی تک جس پیاس میں جس کے پیچھے میں بھاگتی رہی۔۔۔ وہ کسی اور پیاس میں مجھ سے آگے بھاگتا رہا اور میرے پیچھے جو بھاگتا رہا، وہ بلال احمد تھا۔ سچا اور باوفا انسان۔ میں سوچ رہی ہوں۔ کاش! میرے چار سال کسی سراب کے پیچھے بھاگتے ضائع نہ ہوتے۔ مگر یہ سب بھی شاید میرے نصیب کا حصہ تھا۔

اور یہ بھی میرے نصیب کا حصہ ہے، جو میرے سامنے ہے۔

ہو سکتا ہے اگلے چار سالوں میں مجھے یہ پچھلے چار سال یاد نہ رہیں۔ بلال احمد کے ساتھ میری باقی زندگی اچھی گزرے۔ یہ سوچ کر ہی میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہتی ہوں۔

اور احساس تشکر کیا ہوتا ہے، احساس تحفظ کیا ہوتا ہے، احساس محبت کیا ہوتا ہے، یہ مجھ سے بہتر بھلا اور کون جان سکتا ہے۔

☼

ثمینہ عظمت علی

نشانِ محفل

بجلی، پانی، سی این جی کی کمی کی شاندار کامیابی کے بعد ایک دن جو ہماری ادبی (یا اعلیٰ) رگ پھڑکی تو ہمیں اپنی بک شیلف میں "نشانِ محفل" کی کمی کا شدت سے احساس ہوا اور ہم نے اپنے مدت سے کیے ہوئے ارادے کو اس وقت فوری عملی جامہ پہناتے ہوئے اردو بازار جانے کا ارادہ کر لیا۔

اب جو اردو بازار پہنچے تو لوگوں کا جم غفیر دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئے۔ مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے، لگتا تھا کہ سارا شہر یہیں الڈ آیا ہے۔ ارے بھئی کون کہتا ہے کہ ہمارے ملک میں کتاب پڑھنے والا کوئی نہیں، کوئی یہاں آکر ملاحظہ کرلے۔ احساس برتری، احساس کمتری کو چت کرکے ہماری گردن کو اکڑائے

جارہا تھا۔ ہم نے آس پاس نظر ڈالی کہ شاید اس عظیم قوم کے عظیم جذبے کی قدر کرنے کو میڈیا کا کوئی نمائندہ موجود ہو۔ شیر نہ سہی ممنیر ہی سہی کوئی تو سب سے پہلے یہ خبر دے دے۔ کوئی تو اس کھلے تضاد کو چیلنج کرے تو جناب اس رش میں ہم جو کوچۂ جاناں کی طرح کسی مشہور بک ڈپو پر جانے کے لیے کوشاں تھے، دل پسند سوئٹس سے گرے تو صابری حلیم پر جا لگے۔ حلیم کی دو پلیٹیں ڈکارنے کے بعد ہم ایک بار پھر شروع کی۔ لیکن حالت یہ تھی کہ سڑک تنگ، لوگ بے شمار اور اس پر کار سے لے کر گدھا گاڑی تک ہر قسم کی گاڑی۔ وہ تو شکر کہ ہمیں بچپن سے اخباروں اور رسالوں میں "راستہ تلاش کیجیے" والے معمے حل کرنے کی عادت تھی۔ سو آخر کار سال سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

ایک خوفناک زلزلے کی سی کیفیت میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، لیکن غلط نہ سمجھیے ہر خوفناک کیفیت کی ذمہ دار خواتین نہیں ہوتیں۔ یہ تو ہر دکان پر لگے جنریٹر کی آوازیں تھیں جو نیوز چینل کے اینکرز کی طرح گرج رہے تھے۔ ہم حیران پریشان جنگل بیابان کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ساری قوم کو مطالعہ کا شوق لاحق ہو گیا ہے۔

لیکن ہمارا سارا جوش و خروش یکایک اس طرح غائب ہو گیا جیسے۔۔۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہر بات پر کوئی مثال دی جائے۔ بس غائب ہو گیا۔

نئے تعلیمی سال کا آغاز تھا اور سارے بچے اپنے والدین کے ہمراہ کورس کی کتابیں لینے آئے تھے اور اس اردو بازار میں جہاں اردو بھی Urdu لکھا ہوا تھا۔ آکسفورڈ، کیمبرج کے سلیبس دستیاب تھے۔

گزرتے ہوئے ایک جگہ سڈنی شیلڈن کے ناولز کی بہار نظر آئی۔ کسی زمانے میں ہم نے اس کی شہرت سن کر اس کے چند ناولز پڑھے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ اتنا مشہور رائٹر ہمارے اردو کے رائٹرز بلکہ خواتین کے ناول چرا چرا کر اور ترجمے کر کے مشہور ہوا ہے۔ خیر یہ افسوس تو نہیں فخر کا مقام ہے۔

اردو کے بے شمار ناول دیکھے۔ لیکن چھیتے کا شکار سے لے کر کالی دیوی تک۔ ہر ناول کا نام پڑھ کر لگ رہا تھا کہ یا تو ساری قوم شکار پہ چلی گئی ہے یا کالا جادو کر رہی ہے۔

یہ بھی جانا کہ قوم کی سیاسی بصیرت میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ ہر دوسرا شخص سیاسی کتاب کا مصنف بن چکا ہے۔ دلچسپی کا باعث یہ بنا کہ ایس ایم ایس بھی کتابی شکل میں دستیاب ہیں۔

ہم نے ایک بک اسٹور پر "الطاف فاطمہ" اور "نشان محفل" کا نام لیا تو وہ شخص ہمیں یوں دیکھنے لگا گویا ہم کوئی مریخی مخلوق ہوں، بلکہ اب تو ہالی ووڈ اور وہاں سے اڑا کر بنائی جانے والی بالی ووڈ کی فلموں کے بعد تو کوئی مریخی مخلوق کو بھی اتنی حیرت سے نہیں دیکھتا۔

پھر اس نے الطاف فاطمہ کا نام کمپیوٹر میں ڈال دیا۔ اب گوگل کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ بیوی کی طرح ایک سوال کے سو جواب دیتا ہے۔ اس کی مصنوعی ذہانت تو ملاجلا یہ دیکھ کر بھی نتیجہ دے دیتی ہے۔ نام کے دو حصے ہوں تو اسے توڑ کر دونوں کے شجرہ نسب الگ الگ بیان کرتا جاتا ہے۔ اب جو اس نے الطاف نام پر لنکز نکالے تو سب کے سب 90 کی طرف جا رہے تھے سو فوری طور پر Escpe کا بٹن دبایا گیا۔ فاطمہ نام کی سرچ علامہ اقبال کی نظموں سے شروع ہو کر فاطمہ بھٹو کے تازہ ترین کالم پر ختم ہوئی۔ اسی طرح "نشان محفل" کے بھی دو ٹکڑے ہوئے۔

"نشان حیدر" حاصل کرنے والے شہدا سے لے کر سیاہی کے نشانات دور کرنے کے زبیدہ آپا کے ٹوٹکوں تک ساری فہرست اگل دی گئی اور آداب محفل سے لے کر محفل سونف سپاری تک ساری معلومات فراہم کر دی گئی لیکن ہماری مطلوبہ چیز برآمد نہ ہو سکی۔

بک اسٹور والے نے پہلے اپنی گردن، پھر کان، پھر سر کھجایا اور ایک کتاب نکال کر دی۔

"آپ یہ لے جائیں، یہ بہت پاپولر ہے۔" ہم نے مشہور زمانہ ٹی وی سیریل والے ناول کو دیکھا اور ہمیں طارق روڈ کے وہ دکان دار یاد آ گئے جو کہتے ہیں "باجی! یہ کلر پرانا ہے یا یہ اسٹائل پرانا ہے۔"

پھر ہم بیسٹ سیلرز ناولز دیکھتے ہوئے مزید آگے بڑھے اور ہمیں گمان گزرا کہ ہمارے سوا سب مصنف بن چکے ہیں۔ حتیٰ کہ جن کو طبع زاد لکھنے کی صلاحیت اور توفیق نہیں وہ پروین شاکر کی دس غزلیں، ریما کے پسندیدہ کھانے، جدائی کے سو اشعار اور کھانے کی پچاس تراکیب اکٹھی کر کے صاحب کتاب ہونے کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری محترم الطاف فاطمہ کے نام پر "دستک نہ دو" اور "چلتا مسافر" کے بعد راوی خاموش ہو جاتا ہے؟

اگلے شخص نے ہمیں نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک ضخیم ناول کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ٹرائی کیجیے۔ خالص تصوف ہے۔"

"خالص تصوف؟" ہم نے سوچا اور ایک بار پھر ذہن میں گلی گلی گھوم کر کپڑا بیچنے والے پٹھان ذہن میں آ گئے جو کپڑا بیچتے ہوئے کہتے ہیں۔

باجی! یہ پیور (پیور) شیفون ہے۔"

"یعنی جس میں ہیرو عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف چھلانگ مارتا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"جی جی۔"

ہم گڑبڑا گئے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم لیکن ہمیں تو بس وہ یاد ہے جہاں اٹھارہ سال کی خدمات کے بعد پوچھا جاتا ہے۔ "لڑکے! تمہارا نام کیا ہے؟"

یہ شارٹ کٹ ولایت ہمیں منظور نہ ہوئی۔

"اس کی ڈیمانڈ ہے آج کل۔" اس شخص نے بتایا۔

"یعنی۔۔؟"

"یعنی مختصریات ہے۔۔ مارکیٹنگ۔"

وہاں سے چلے تو راستے میں دو بچیوں کی انگریزی گفتگو کان میں پڑی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ ان کے سلیبس میں آنگن اور دستک نہ دو جیسے مشکل اور بور ناول کیوں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس کے متعلق تو ہم سوشل ویب سائٹ پر گروپ بھی دیکھ چکے تھے۔

اس سے آگے والے صاحب نے ہمیں شوق سے گھورا اور کہا۔

"آپ پرانے ادیبوں کی پرستار لگتی ہیں۔ یہ انتظار حسین کا "بستی" لے جائیے۔ آج کل دھڑا دھڑ بک رہا ہے۔ یہ کاپی میں نے اپنے لیے رکھی تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔"

"ماجرا یہ ہے! جناب کہ اس کو بکر پرائز کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔"

ہم نے سوچا کہ ان سے درخواست کریں کہ بے شک ہماری کتاب کو انعام نہ دیں لیکن ہر سال نامزد ضرور کریں تاکہ لوگ کتاب خریدیں اور پڑھیں۔

ہم پھر اس جم غفیر میں شامل ہو کر واپسی کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ جہاں بچے اردو ادب کے لیے بے زاری کا اظہار کریں۔ جہاں کتابیں بھی مارکیٹنگ کی بنیاد پر شائع کی جائیں اور مغرب کے نامزد کرنے پر بکنے لگیں، وہاں محفلوں کے نشان یوں ہی مٹ جایا کرتے ہیں۔

ہم مایوسی سے چلے جا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے پکارا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کے شفیق سے صاحب نظر آئے۔

"جی فرمائیے۔" ہم نے کہا۔

"ہم کافی دیر سے آپ کو ادھر سے ادھر نشان محفل کی تلاش میں سرگرداں دیکھ رہے ہیں۔"

"جی افسوس۔ نشان محفل نہیں ملا۔"

انہوں نے مسکرا کر اپنے بیگ میں سے کچھ نکالا، جسے دیکھ کر ہم اچھل پڑے۔ وہ نشان محفل کا ایک فوٹو اسٹیٹ نسخہ تھا۔

"ہم تو ساتھ لیے پھرتے ہیں کہ کوئی تو اس کا قدردان ملے۔" انہوں نے افسوس اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا اور کتاب ہماری طرف بڑھائی۔

"یہ لیجیے۔ یہ ان مٹ نشان ہیں۔ ان کو مٹانا آسان نہیں ہے۔"

☆

آمنہ ریاض

باقر رودمی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت ناراں ہیں اور اسے ہر وقت بدحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ رودمی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساہر کو اس سے شدید جلن ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے ساہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساہر پر لگا دیا کہ ساہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر ساہر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ ساہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور ساہر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف

ناولٹ
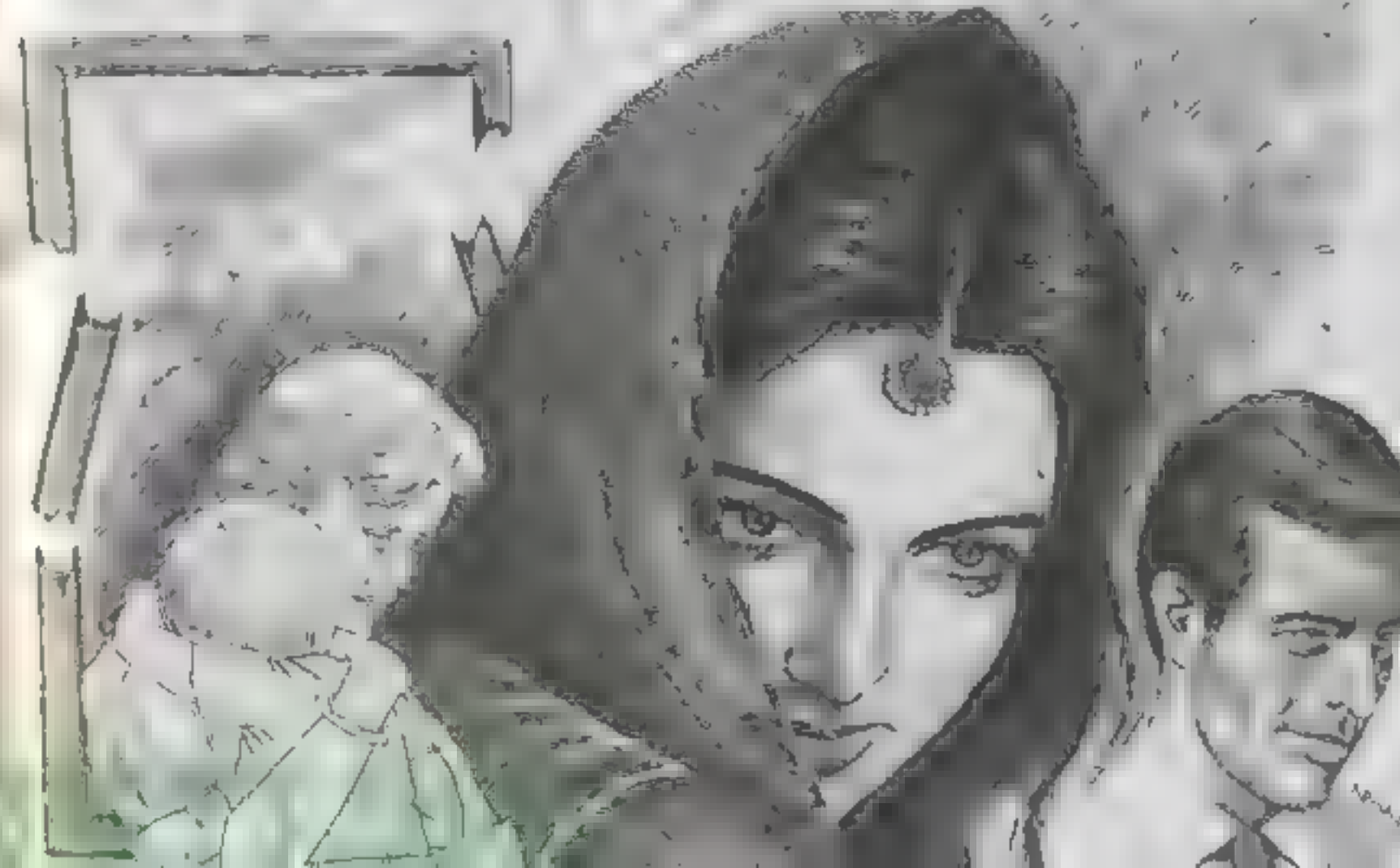
کردیتے ہیں مگر ساہر‘ شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوادیتی ہے۔

کاسٹنگ ڈائریکٹر جاشم تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں‘ جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور باقاعدہ منگنی پر دونوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ واقعی ثمر ہے۔ وہ دونوں منگنی تو کرلیتے ہیں مگر سخت غصے میں ہوتے ہیں۔ منگنی کے بعد سمیر ٹرپ کے دوران مذاق میں کہی شفا کی بات کہ "ثمر کا نکاح ہوچکا ہے" اپنی ماں کو بتا کر منگنی توڑ دیتا ہے۔ ثمر کے والد شکیل صاحب سمیر کے والد سے سخت ناراض ہوجاتے ہیں۔ ثمر کی والدہ یہ جان کر کہ ثمر کے نکاح کی افواہ شفا نے اڑائی ہے۔ وہ شفا سے خفا ہوجاتی ہیں۔ ساہر انہیں مزید بھڑکاتی ہے۔ ساہر اور عمیر تقی سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مہک‘ تقی کا پورٹ فولیو بنوالیتی ہے۔ تقی کو آفرز آنے لگتی ہیں۔ وہ ایک دو کمرشلز میں کام کرلیتا ہے۔ رضی کی بدولت مہک کے والد سے باقرلودھی کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ تقی کے لیے مہک کو پسند کرلیتے ہیں۔ جری کے میڈیکل میں ایڈمیشن ہونے کی خوشی میں باقرلودھی ایک چھوٹی سی تقریب کرتے ہیں۔ انہیں تقی کے شوبز جوائن کرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ وہ بھری محفل میں اسے سخت بے عزت کرتے ہیں اور چھڑی سے مہمانوں کے سامنے خوب پٹائی لگاتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔

وہ متضاد سوچوں میں گھرا جارہا تھا‘ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ عمیر اسے اپنے ہاں لے آتے ہیں اور جب تک گھر کا بندوبست نہیں ہوجاتا‘ اسے اپنے گھر رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ تقی ممنون اور شرمندہ سا ان کے گھر رہنے لگتا ہے۔ شفا اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں مگر زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ شفا کو عمیر کی نظروں میں گرانے کی ساہر کی سازش کا اسے علم ہوجاتا ہے۔ وہ ساہر کو منع کرتا ہے مگر ساہر بجائے شرمندہ ہونے کے‘ اسے اس معاملے سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہے۔ وہ کمرشلز اور ڈراموں میں مصروف ہوجاتا ہے۔ سمیر کے آفس میں ثمر انٹرن شپ کے لیے آتی ہے۔ سمیر اس کی طرف مائل ہونے لگتا ہے مگر وہ اس کی جانی دشمن بنی ہوئی ہے۔

۔۸۔
آٹھویں قسط

"یک لخت وہ چھوڑ او کھائے۔
چن میری من! کچھ قسطاں کر۔"

سمیر کا ایس ایم ایس آیا تھا۔ تقی کو ہنسی آگئی۔ اس سے ملاقات نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی‘ ایک تو شوٹنگز کی مصروفیت دوسرے نوکری کا جھمیلا۔ وہ بری طرح مصروفیت کا شکار تھا اور اب تو ایک نیا سلسلہ کہ جلد از جلد کسی رہائش کا بندوبست کیا جائے۔ وہ ساہر کی طرف سے اس قدر بے یقینی کا شکار تھا کہ لاشعوری طور پر جلد ہی کسی بڑے جھگڑے کی توقع کررہا تھا۔ دوسری جانب کسی نہ کسی طرح اس تک بھی یہ خبر بھی پہنچ ہی گئی تھی کہ ابا نے خودکشی کا ارادہ ظاہر کر کے امی اور رضی کو بھی اس سے لاتعلق رہنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی کل ملا کر کوئی ایک بھی بات ایسی نہیں تھی جو اسے خوش آئند لگ رہی ہو‘ سوائے اس کہ اس کے پاس کمرشلز کی آفرز بڑھ رہی تھیں۔ اس نے سمیر کو فون ملالیا۔

"صحیح کہہ رہا ہے تقی! زندگی بڑی پھیکی سی ہوگئی ہے‘ ایسا لگتا ہے جیسے موسم ہی بے کار ہے۔" سمیر نے اس کی بات سن کر کہا تھا وہ اس سے زیادہ اوازار بیٹھا تھا۔

"ثمر بھابھی سے بات ہوئی؟" تقی نے پوچھا۔

"کہاں یار! وہ ہلاکو خان کی بھتیجی ہے‘ میں تو پاس سے بھی گزر جاؤں تو ہوا کو بھی گھورنا شروع کردیتی ہے۔ بات خاک کرے گی۔ ویسے میں نے ابو سے اس بارے میں بات کرلی ہے۔ یہ کہ غلطی میری تھی اور منگنی کے بعد جو کچھ اماں نے کیا‘ وہ تو بہت ہی غلط رہا۔ اگر شکیل انکل سے جا کر اس سب کے لیے معافی مانگنا ہوئی تو میں چلا جاؤں گا۔"

"انکل نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا؟ وہ بھی اپنے نام کے ایک ہی ہیں۔ کہتے ہیں پہلے کان پکڑ کر میرے سامنے ایک ہزار ایک اٹھک بیٹھک لگاؤ‘ اس کے بعد شکیل کے پاس جاؤں گا۔ میں نے کہا ابو! یہ تو پھر نہ کرنے والی بات ہوئی ناں۔"

"پاگل! لگالیتا اٹھک بیٹھک۔ سستے میں جان چھوٹ جاتی۔"

"پاگل ہوگئے تم خود۔ کیونکہ جو کہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بھائی! میں اپنے ابو کا بیٹا ہوں‘ انڈرٹیکر کا نہیں۔ میرے لیے پچاس اٹھک بیٹھک لگانا مشکل ہے تم ایک ہزار ایک کی بات کرتے ہو۔"

"شرم تم کو مگر نہیں آتی۔" تقی نے ہنس کر کہا۔

"ہم بے شرم ہی اچھے۔" اس نے بھی ڈھٹائی سے کہا۔ "خیر تم سناؤ کیا چل رہا ہے آج کل؟"۔

تقی کا دل چاہا اس کو ساہر والا معاملہ کہہ سنائے۔ اس سے تو سب کہہ لیتا تھا۔ جگر تھا وہ اس کا لیکن یہ بہن کا معاملہ تھا۔ کچھ کہتے مناسب نہ لگا سو رہنے دیا اور اسے اپنے اگلے پراجیکٹ کا بتانے لگا۔

☼ ☼ ☼

لیکن دل کی بے چینی اتنی زیادہ تھی کہ مہک سے بات کہنے سے خود کو روک نہیں سکا۔

مہک نے ساری بات غور سے سنی۔ کہا البتہ کچھ نہیں۔ عقل مندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ بھائی کے سامنے اس کی بہن کو کچھ نہ کہا جائے۔

"تم اپنے بہنوئی سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

"ان سے بات کرنے کا مطلب ہے کہ میں ساہر کو ان کی نظر میں گرادوں۔ ظاہر ہے یہی تو میں نہیں چاہتا۔"

"پھر ایک کام کرو‘ اس سارے معاملے سے لاتعلق ہوجاؤ۔" مہک نے کولڈ کافی میں اسٹرا گھماتے ہوئے اطمینان سے کہا تھا۔

تقی کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یعنی کسی جیتے جاگتے انسان کی زندگی برباد ہونے دوں؟"

"تمہیں اس جیتے جاگتے انسان سے اتنی ہمدردی کیوں ہورہی ہے؟ کیا بہت خوبصورت ہے؟" مہک نے اچانک کہا تھا۔ تقی چپ سا رہ گیا لیکن اگلے ہی پل اس نے جھنجلا کر کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتی

ہو مجھے اصل فکر اپنی بہن کی ہے۔"
"آر یو شیور؟" مہک کا انداز۔ تقی بری طرح تپا۔
"میرا خیال ہے میں نے غلط کیا جو تم سے بات کی۔"
"اچھا ٹھیک ہے فورگیٹ اٹ۔" مہک نے فوراً مصالحت کی راہ اپنا کر کہا تھا۔
"تمہیں اپنی بہن کی فکر ہے نا۔ تو اس کا گھر بچاؤ۔ اس لڑکی کے چکروں میں پڑنے کا مطلب اپنی بہن کو ان سیکیور کرنا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اس سارے معاملے سے لاتعلق ہو جاؤ اور تمہاری بہن جو کرتی ہے اسے کرنے دو۔ تم نے سمجھا کر دیکھ لیا۔ اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ آگے وہ خود سمجھ دار ہے' اپنا برا بھلا دیکھ سکتی ہے۔ تم اپنا سوچو' اپنے کیریر پر دھیان دو۔ ادھر ادھر کے معاملات میں پڑو گے تو پچھتانا بھی پڑ سکتا ہے۔ کل میری جاثم سے بات ہوئی وہ کہہ رہا تھا تمہیں ذرا محتاط رہنا چاہیے۔ کسی میڈیا والے کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تمہارے فادر نے تمہیں گھر سے نکالا ہوا ہے تو الٹی سیدھی باتیں اڑنا شروع ہو جائیں گی۔ تمہارے کیریر کی ابھی شروعات ہوئی ہے۔ اور ابتدا میں ایسی باتیں بہت نقصان کا باعث بن سکتی ہیں۔"
وہ حقیقت کا راستہ دکھا رہی تھی اور اس کی باتیں کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھیں۔
ساہر کی باتیں اگر نہ سنتا تو سب اس کے ناک کے عین نیچے ہوتا رہتا اور اسے خبر بھی نہ ہو پاتی۔ لیکن اب پتا چل ہی گیا تھا تو اسے سب سے دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ اپنے بارے میں سوچنا چاہیے تھا وہ کیوں دوسروں کے غم پالے جبکہ ساری دنیا اسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہے۔
رات گئے وہ اس بارے میں سوچتا رہا۔ ہاں نیند میں جانے سے قبل اس نے جو آخری فیصلہ کیا' وہ یہ تھا کہ اسے جلد از جلد اس گھر سے نکل جانا چاہیے۔ ضمیر کی خلش سے بچنے کا یہی ایک راستہ ہو سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

عمیر ہکا بکا ان تصویروں کو دیکھ رہے تھے جو کسی ان جان ای میل ایڈریس سے انہیں بھجوائی گئی تھیں۔
وہ شفا کی تصویریں تھیں جن میں وہ روحیل کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ ان تصویروں کا کیا مطلب تھا' اس کے بارے میں حتمی انداز میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اس بارے میں صرف اندازے لگائے جا سکتے تھے۔ روحیل ساہر کی سہیلی کا بھائی تھا' اس سے وہ ایک آدھ بار مل چکے تھے۔ اچھا لڑکا تھا۔ برا نہیں تھا لیکن شفا کے لیے انہوں نے ابھی اس انداز سے سوچا نہیں تھا۔
وہ دو دن اسی کشمکش و پیچ میں رہے کہ شفا سے ان تصویروں کے متعلق پوچھیں یا نہیں۔
"یہ جو تمہاری فرینڈ وشمہ کا بھائی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟" انہوں نے ٹی وی دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں ساہر سے پوچھا۔
"کیسا لڑکا ہے وہ؟ میرا مطلب ہے آپ کے دیکھنے میں تو مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگا۔"
"ٹھیک ہے یا نہیں۔ اب یہ تو مجھے پتا نہیں۔ وشمہ بتا رہی تھی' کچھ غیر ذمہ دار سا ہے۔ لاپروا اور فلرٹی تو آج کے دور کا ہر لڑکا ہے۔ لیکن خیر' آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"
"ویسے ہی پوچھا ہے یار! یہ جو نیوز کاسٹر آ رہا ہے اس کی شکل اس سے بہت ملتی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ یاد آگیا تو پوچھ لیا۔"
انہوں نے بات بنا دی لیکن الجھے رہے۔
پھر ان کو ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ یہ بھی کسی انجان نمبر سے تھا۔ ایک مشہور ہوٹل میں انہیں مخصوص وقت پر آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ عمیر پریشان ہو گئے۔ ان کا جی چاہا اس میسج کو اتنی اہمیت نہ دیں انہیں اپنی بہن پر بھروسا تھا۔ ممکن ہے کوئی انہیں بے وقوف بنا رہا ہو لیکن کوئی تو بات تھی جو اس سارے معاملے میں قابل توجہ تھی۔ ان کا پرسنل ای میل ایڈریس اور پرسنل سیل نمبر اگر کسی کے پاس

کوئی تو ان ہی راز دار تھا۔
اسی کشمکش میں وہ بتائے ہوئے وقت پر ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ شدت سے دعا کر رہے تھے کہ کچھ بھی ان کے لیے ناقابل برداشت نہ ہو۔ کاش کوئی مذاق ہی کر رہا ہو۔ لیکن کوئی مذاق نہیں کر رہا تھا۔ کونے والی ٹیبل پر انہوں نے شفا کو روحیل کے ساتھ بیٹھے دیکھا اور سارا اعتماد' مان بھروسا قدموں میں گر کر چکنا چور ہو گیا۔
وہ اچانک سامنے گئے تو شفا ان کو دیکھ کر گھبرا گئی لیکن روحیل اعتماد سے سر اٹھائے کھڑا رہا۔
عمیر شفا کو ساتھ لے کر آگئے۔ سارا راستہ وہ خاموش رہے' ایک آدھ بار شفا نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا بھی چاہا تو سختی سے ڈانٹ دیا۔
"مجھے دھوکا دینے والوں سے سخت نفرت رہی ہے۔ تم مجھے بتا سکتی تھیں کہ روحیل میں انٹرسٹڈ ہو' وہ مجھے تمہارے لیے مناسب نہ بھی لگتا' انکار میں تمہیں تب بھی نہ کرتا۔ میرا مان توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔"
"ابھی بھی تمہارے پاس وقت ہے۔ خوب اچھی طرح سوچ کر بتا دینا۔ میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کر دوں گا۔"
انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

تقی نے شفا کی مدد کیا خاک کرنا تھی' اس کے فوراً بعد تو اسے خود مدد کی ضرورت پڑ گئی۔ اسے نوکری کرتے ابھی بمشکل چند مہینے ہی ہوئے تھے لیکن اس کی کمپنی میں ڈاؤن سائزنگ کا آغاز ہوا اور اسے فارغ کر دیا گیا۔ وہ لاکھ سر پٹختا رہا کہ رولز تو سمجھا دو لیکن وہ اکیلا تھوڑا ہی تھا جو اس ناانصافی کا حق دار ٹھہرایا گیا تھا۔
دو روز بعد شوٹنگ کے دوران سینئر اداکار سے جھگڑا ہو گیا۔ تقی نے کوشش تو بہت کی کہ بات نہ بڑھے لیکن برداشت اس کی بھی جواب دے گئی۔ معاملہ تو تو میں میں سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک جا پہنچا اور اسے دو کمرشلز اور ایک ڈرامہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مگر یہ ابھی آغاز تھا۔ ناکامیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو اس

جھگڑے کے نتیجے میں اب اسے سہنا پڑ رہا تھا۔
جاثم نے اس کی خوب کلاس لی۔
"تمہیں کیا ضرورت تھی نہال کی باتوں پر دھیان دینے کی۔ الٹی سیدھی بکواس کر کے خود ہی چپ ہو جاتا۔"
"صاف کیوں نہیں کہتے میں بے غیرت بن کر سنتا رہتا۔" وہ اسی پر الٹ پڑا۔ جاثم کو برا لگا۔
"ٹھیک ہے پھر اب بھگتو۔ ایک دن میں دو کمرشل اور ایک ڈرامہ گیا ہے' اگلے چند دن میں ٹی وی اسٹیشن پر تمہیں ڈھونڈنے سے بھی اپنا نام نہیں ملے گا۔ میڈیا تم جیسے جلد بازوں کو نہیں پوچھتا۔ تمہیں کام دلوانے کے لیے تمہارے پیچھے جو محنت کی تھی میں نے' وہ ساری بے کار کر دی تم نے۔"
"کیا مطلب؟ مجھے کام دلوانے کے لیے تم نے محنت کی؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو میرے اندر کوئی ٹیلنٹ نہیں۔" تقی کو جیسے شاک لگا تھا۔
"ذہین آدمی ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو' خالی خولی ٹیلنٹ کو آج کل کوئی نہیں پوچھتا۔"
اب باقی کیا رہ جاتا تھا۔ اس بات پر جاثم سے بحث ہو گئی۔ مہک نے بات کرنا چاہی تو وہ اس سے بھی لڑ پڑا۔ جس انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ اب وہ بالکل خالی ہاتھ رہ گیا ہے' وہ لڑنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے
بہرحال دو روز بعد جب غصہ اترا تو احساس ہوا۔ غلطی واقعی بڑی ہو گئی۔ کیا تھا جو برداشت کر لیتا۔ ایک کے بعد ایک پراجیکٹ اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا جا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر اور کبھی بغیر وجہ بتائے۔ یہ ہو کیا رہا تھا' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کہاں تو وہ الگ اپارٹمنٹ کا سوچ رہا تھا' کہاں یہ عالم کہ اگلے دن کس طرح گزریں گے' اس سوچ میں پڑ گیا۔ ساہر کی چالبازیاں' عمیر کے احسانات سب اس کے دماغ سے نکل گیا۔ اسے اپنی ہی پڑ گئی تھی کسی اور کے لیے کس طرح سوچتا۔
اس نے پھر جاثم سے رابطہ کیا۔ تحمل سے بات کی۔ ابا نے جب گھر سے نکالا تب شوبز اس کا شوق تھا لیکن

اب یہ شوق اس کی مجبوری بن چکا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے وہ پڑھا لکھا تھا لیکن نوکری کوئی پلیٹ میں رکھ کر تو نہیں ملتی۔ ٹی وی پر کام دینے کو کوئی تیار نہیں تھا ایسے میں جاثم کے پاس نہ جاتا تو کیا کرتا۔ وہ بھی میڈیا کا بندہ تھا' نخرے سے ملا لیکن صاف جتا دیا کہ اس بار وہ محض مہک کی وجہ سے اس کی مدد کر رہا ہے ورنہ اس کے جیسا ٹیلنٹ تو اسٹوڈیوز میں رُلتا پھرتا ہے۔ تقی خاموش ہی رہا "مصلحتاً گدھے کو بھی باپ بنانا پڑ جاتا ہے جاثم تو پھر انسان ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

عمیر کے رشتے کے تایا تائی اور ان کے بیٹا بہو آئے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ اپنی پریشانیوں میں وہ دھیان نہیں دے سکا۔ یوں بھی آج کل لیٹ آنے لگا تھا۔ چھوٹی موٹی جو بھی نوکری مل جاتی اسے ہی کر لیتا کہ کچھ تو پیسے بنیں۔

جاثم نے کہا۔

"لیڈ رول تو اب اتنی جلدی ملنے سے رہا۔ تمہیں بی کیٹیگری کے جو بھی رول ملیں فی الحال ان پر دھیان دو۔"

وہ اور بھی مایوس ہو گیا۔ یعنی وہ بی کیٹیگری کے رول کرے تو اس کے روشن تابناک مستقبل کا کیا ہوگا؟

لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ ایک ٹیلی فلم میں اسے لیڈ رول مل ہی گیا۔ رائٹر' ڈائریکٹر' پروڈیوسر سب کسی بھی بڑی کامیابی کی دلیل سمجھے جاتے تھے۔ جاثم کا خیال تھا اگر وہ اس رول کو بخوبی نبھا لے تو اسے آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

تقی جی جان سے لگ گیا۔ وہ گو کہ اپنے کام میں ماہر تھا لیکن ایک کے بعد ایک جس طرح وہ ناکام ہو رہا تھا یا نہال اسے ناکام ثابت کروا رہا تھا' اس سے وہ خاصا پریشر میں آگیا تھا۔ تب ہی اس نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی بار ریہرسل بھی کی۔ تین دن کا شوٹنگ شیڈول تھا وہ صبح نکلتا تو رات گئے واپس آتا۔

ایک روز نکلتے نکلتے عمیر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"کہاں ہوتے ہو یار! مجھے تو تمہاری شکل بھی یاد نہیں۔" انہوں نے ہنس کر کہا تھا لیکن اس ہنسی میں پھیکا پن تھا یا کوئی عجیب سا اوپرا پن۔ یعنی ایسا لگا جیسے دل سے نہ ہنسے ہوں۔

"کیا بات ہے عمیر بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔

"نہیں عمیر بھائی! آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ ایسا کریں' آج آف کر لیں۔ یا میں آپ کو آفس چھوڑ دیتا ہوں۔"

"ارے نہیں یار! طبیعت ٹھیک ہے میری۔ بس ذرا موسم بدل رہا ہے تو اسی کا اثر ہے۔" وہ صاف ٹل گئے۔

ٹیلی فلم کی شوٹنگ مکمل ہو چکی تھی' ڈبنگ کا کام بھی تقریباً" مکمل تھا سو اسے آج فرصت ہی فرصت تھی۔ کچھ سوچ کر وہ ساہر کے پاس آگیا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ عمیر بھائی کو فون کرتی رہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ لیکن وہ محترمہ اپنا ہی دفتر کھولے بیٹھی تھیں۔ شکنجہ تیار تھا بس شفا کے گلے میں ڈالنا باقی تھا۔

تقی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"تم باز نہیں آرہیں۔ کیوں کسی کی زندگی خراب کرنے پر تلی ہوئی ہو۔"

"تمہیں اتنی ہمدردی ہے تو تم آکر اسے بچا لینا۔" ساہر نے جل کر کہا تھا۔ تقی اس کی ڈھٹائی پر جتنا بھی حیران ہوتا وہ کم تھا۔

"جب وہ شہزادی میری زندگی عذاب بنا رہی تھی۔ تو مجھے کون بچانے آیا تھا جو اس کی اب اتنی فکر ہے۔ جب میں نے سب کچھ اکیلے بھگتا تو وہ بھی بھگتے۔ قرض تھا اس کا مجھ پر اور میں سود سمیت چکا رہی ہوں۔ مجھے اب نصیحت مت کرنا ورنہ میرا دماغ گھوم جائے گا۔"

تقی نے سو جان سے لعنت بھیجی اور اپنے کمرے میں آکر سو گیا لیکن اسے ڈراؤنے خواب آتے رہے

آج رات اس گھر کے مکینوں پر اس کی پیاری بہن کی وجہ سے قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ وہ کیا کر سکتا تھا؟ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا' سوائے اس کے کہ اپنے محسن کی عزت کا جنازہ نکلتے دیکھے۔

جاگا تو اسٹوڈیو سے کال آگئی۔ کچھ سینز کو تبدیل کر کے ری شوٹ کیا جانا تھا اور سارے ہی سینز میں اس کی موجودگی انتہائی ضروری تھی۔ اس نے شکر کیا اور شوٹنگ کے بہانے اسٹوڈیو آگیا۔ کسی کو برباد ہوتا دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا اس کے اندر۔

☆ ☆ ☆

"تقی! کیا کر رہے ہو یار! یہ اکیسواں ری ٹیک ہے۔ تمہارا دھیان کہاں ہے؟"

ڈائریکٹر کی آواز اس کو جیسے کھینچ کر لائی تھی۔ ریکارڈنگ کریو کا ہر فرد اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے تم تھوڑا ریسٹ کرو۔" ڈائریکٹر نے جیسے اکتا کر کہا تھا۔ تقی خاموشی سے آکر گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات کا وقت تھا اور جوہر ٹاؤن کے خوبصورت سے لان میں ڈرامے کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ وہ جہاں بیٹھا تھا اس کے عین سر پر ٹیوب لائٹ روشن تھی جس کے ارد گرد منڈلاتے پروانے تک اسے شرم دلا رہے تھے۔

بعض اوقات باضمیر ہونا بھی بہت سارے مسائل کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے اس کے لیے بن رہا تھا۔ اس کا ذہن بری طرح عمیر' ساہر اور شفا میں الجھا ہوا تھا۔ کس کو بچائے کس کو نہ بچائے یا کنی کترا جائے۔

فیصلہ مشکل ہوتا ہے خصوصاً تب جب آپ کو خدشہ ہو ضمیر کی نہ مان کر پھر ساری زندگی یوں بسر کرنا ہو گی جیسے شہ رگ پر کسی نے پیر رکھا ہو۔ شفا سے اس کی کوئی جذباتی ہم آہنگی نہیں تھی۔ اس کے سر پر عمیر کے احسانات تھے اور اسے اپنی ناعاقبت اندیش بہن کی فکر تھی۔ جو وہ کرنے جا رہی ہے اگر ویسا ہو گیا تو کیا ہو گا۔ کوئی نہ بتاتا تب بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی۔

پھر وہ انسان ہو کر کسی دوسرے پر ظلم ہوتے کیسے سہ لیتا۔ وہ ڈر گیا۔ آزمائش تو کسی پر بھی آسکتی ہے۔ کل کلاں کو اس پر کوئی برا وقت آیا۔ کوئی انسان اسے بچا سکتا ہو اور اسی کی طرح کنی کترا گیا تو وہ کیا کرے گا۔ برباد ہو جائے گا۔ اپنی بربادی کا خوف اسے اکسا رہا تھا کہ کسی دوسرے کو برباد ہونے سے بچا لے۔

یک دم وہ حتمی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا پھر خیال آیا یوں کھڑے ہونے کا تو کوئی فائدہ نہیں۔ تو پھر بیٹھ گیا اور فوراً" سیل فون نکال کر عمیر کو فون کرنے لگا لیکن اگلے ایک گھنٹہ کی کوشش کے بعد بھی اس کی ہر کوشش بے سود رہی۔

"فردوس صاحب! میں باقی کے سین مکمل نہیں کروا سکتا۔ مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں جانا ہو گا۔"

پرفارمنس پہ دھیان وہ پہلے بھی نہیں دے پا رہا تھا اب بھی عین سین کے درمیان وہ بول اٹھا۔ آواز پتا نہیں اس کے حلق سے کیسے نکلی۔ وہاں موجود ہر شخص اسے یوں دیکھنے لگا گویا اس کی ذہنی حالت پر شک گزرا ہو۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟! اچھی طرح جانتے ہو اس پراجیکٹ کو اگلے ہفتے آن ایر ہونا ہے۔ آج شوٹ مکمل نہ ہوا تو یہ ٹیلی فلم اسٹور روم کی سب سے نچلی فائل میں چلی جائے گی۔" ڈائریکٹر فردوس صاحب نے چنگھاڑ کر کہا تھا۔ پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔ ٹی وی کا جانا پہچانا نام' اپنے کام میں بے انتہا ماہر لیکن رج کے موڈی اور غصہ ور۔ تقی سے چونکہ پہلے ہی خفا ہو چکے تھے اس لیے بالکل ایسا سلوک کر رہے تھے کہ کیا ہی کوئی تنک چڑھی ساس اپنی مظلوم بہو سے کرتی ہو گی۔

"مجھے گھر جانا ہے۔ آپ تب تک نوشابہ کے سین کروا لیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں گھنٹہ پورا ہونے سے بھی پہلے آجاؤں گا۔"

وہ بضد تھا۔ فردوس صاحب کو ماننے ہی بنی۔ ویسے بھی وہ جتنے ری ٹیک کروا رہا تھا' اس سے بہتر تھا اسے

جانے ہی دیا جاتا۔ ممکن ہے واپس آکر ہی کچھ اچھی پرفارمنس دے لیتا۔

"گھنٹہ نہیں صرف تمیں منٹ۔ یاد رکھنا' میں انسانوں کو نہیں ان کی زبان کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ تمیں منٹ میں تم واپس نہ آئے تو نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

تقی نے انگلیوں پر حساب لگایا تمیں منٹ بھی کافی تھے۔ وہ سر ہلا کر بھاگا۔

☼ ☼ ☼

ساہر ابھی نالائق تھی۔ پلاننگ کر لیتی تھی اس پلاننگ کے سائیڈ ایفیکٹس (مضر اثرات) کے متعلق نہیں سوچتی تھی۔ (کھاگ نہیں تھی ناں ورنہ ضرور سوچ لیتی) تو روحیل اس کی پلاننگ کا سائیڈ ایفیکٹ تھا۔ عجیب آدمی تھا۔ کبھی بھی کچھ بھی بول دیتا۔ کچھ بھی کہہ دیتا۔ پہلے پہل ساہر کو اندازہ نہیں ہوا۔ جب اندازہ ہوا تو پانی تقریباً تقریباً سر سے گزر چکا تھا۔ اس کے مطالبات بڑھ رہے تھے اور اس روز تو حد ہی ہو گئی۔ وہ گھر ہی آگیا۔ بلوایا تو اس نے خود ہی تھا لیکن شفا کے لیے۔ وہ مطالبہ اس سے کرنے لگا۔

اوپر چھت کی سیڑھیاں مین گیٹ کے ساتھ ہی تھیں' وہ اسے اوپر لے آئی لیکن اس کا مطالبہ سن کر ساہر کے چھکے چھوٹ گئے۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے میں شفا کے چکروں میں تھا بھئی' میری تو پہلے دن سے تم پر ہی نظر تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں بچپن سے تمہیں تاڑتا آیا ہوں تو یہ غلط نہیں ہو گا۔"

اس نے شرارتی انداز میں کہا تھا لیکن اس کی شکل جتنی اس وقت ساہر کو منحوس لگی' اتنی پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ عمیر ابھی آفس سے نہیں آئے تھے گھر میں ان کے رشتہ کے تایا کی فیملی ٹھہری ہوئی تھی۔ گو کہ عمیر پر اتنا ہولڈ تو نہیں تھا ان کا۔ لیکن خاندان کے معتبر فرد تھے وہ' عمیر عزت کرتے تھے ان کی۔ ان کی بیگم بڑی ہمہ جہت خاتون تھیں اگر ان کے کانوں

میں شفا سے متعلق کوئی بھنک پڑ جاتی تو اسے خاندان بھر میں رسوا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

لیکن اب اسے اپنی پڑ گئی اگر کسی نے اسے روحیل کے ساتھ چھت پر دیکھ لیا تو۔

وہ اس کی منت کرنے لگی لیکن اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور خود کو اس مشکل سے نکالنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ علاقے کی لائٹ بند تھی بہت زیادہ اندھیرا تو نہیں تھا کہ جنریٹر اور یو پی ایس تو اب گھر گھر لگے تھے۔ لیکن بہرحال اندھیرا تھا۔ روحیل اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا تب ہی سیڑھیوں پر کھٹکا ہوا۔ وہ دونوں بری طرح چونک گئے۔ ایک لمحے کے اس وقفے سے ساہر نے فائدہ اٹھایا اور سرعت سے ثمر کے گھر کی چھت پر کود گئی۔ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے صحن میں آئی۔ اپنے پیچھے اس نے روحیل کو گالیاں دیتے سنا تھا۔ وہ صحن میں آئی۔ کمروں کی لائٹس جل رہی تھیں۔ صحن کی بتی بند تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور افراد خانہ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ثمر کی دادی کی چارپائی گیٹ کے قریب ہمہ وقت بچھی رہتی تھی وہ ابھی بھی اس پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کو دکھائی اور سنائی کم دیتا تھا لیکن گیٹ کے پاس ان کی موجودگی سے آسرا ابھی بہت تھا۔ وہ جا کر ان کی پائنتی بیٹھ گئی۔

"کون ہے۔" وہ شاید نیند میں تھیں چارپائی ہلنے سے جاگ گئیں۔

"میں ہوں دادی! ساہر۔ گھنٹہ بھر سے آپ کے پاس بیٹھی ہوں۔" گھبراہٹ میں بھی اس نے تکا مارا جو نشانے پر لگ بھی گیا۔

"ہیں۔ گھنٹے سے بیٹھی ہو؟ یہ جو یادداشت ہے ناں۔ بدبخت دن بہ دن میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔"

"جی دادی! اور آپ تو مجھے کوئی قصہ بھی سنا رہی تھیں۔ وہی جب آپ نو سال کی تھیں تو آپ کے ابا کو آپ کی شادی کی جلدی پڑ گئی۔"

بزرگوں کی پرانی عادت۔ پرانے قصے بار بار دہرانے

ہیں۔ ثمر کی دادی کی شادی کا قصہ بھی محلے کے ہر فرد کو کتنی بار سنایا جا چکا تھا۔ وہ بھی ان میں شامل تھی۔

دادی بولتی رہیں۔ وہ سنتی رہی لیکن ایک بھی لفظ سمجھ نہ سکی کہ کان تو اپنے گھر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لہر سی دوڑ رہی تھی اور پیر اضطراری انداز میں مسلسل ہل رہے تھے۔

وہ ہر بار بڑی محنت سے شفا کے لیے گڑھا کھودتی تھی۔ ہر بار کوئی ماورائی طاقت اسے اس گڑھے میں گرنے سے بچا لیتی تھی۔ لیکن اس بار وہ خود اس گڑھے میں گرنے والی تھی جس کے متعلق اس کا خیال تھا۔ ایک بار گرنے کے بعد شفا اس میں سے مر کر بھی نہیں نکل سکے گی۔

اس کے اعصاب جیسے شل ہو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ثمر دادی کی آواز سن کر کمرے سے نکلی تھی۔ ساہر کو ان کے پاس بیٹھا دیکھ کر جتنا حیران ہوئی اس سے زیادہ حیرانی اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیوں کو دیکھ کر ہوئی۔

"ساہر بھابھی! آپ کب آئیں؟ اور... آپ کو کیا ہوا ہے۔ سب خیریت تو ہے ناں؟"

"ہیں۔ ہاں۔ مجھے کافی دیر ہو گئی آئے ہوئے۔ دادی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں دراصل تمہاری چچی سے پیناڈول کا پوچھنے آئی تھی سر میں درد تھا اور عمیر ابھی آئے نہیں۔ تو بس اسی لیے۔ دادی نے بٹھا لیا۔" اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا ہوا تھا لیکن اس کی باتیں بے ربط تھیں۔

"اچھا۔ لیکن مجھے تو دادی کی آواز ابھی آئی۔ بلکہ پندرہ منٹ پہلے بھی میں نے باہر جھانکا تھا۔ آپ تو مجھے نظر ہی نہیں آئیں۔" اس نے محض بات برائے بات کہا تھا لیکن ساہر کے دل میں چور تھا۔ وہ بری طرح گھبرا کر صفائیاں دینے لگی۔

"میں تو بہت دیر سے بیٹھی ہوں۔ بتائیں ناں دادی ثمر کو۔ میں بیٹھی ہوں ناں آپ کے پاس۔"

"ارے ہاں بیٹی! یہ ساہر تو گھنٹہ بھر سے میرے پاس ہی بیٹھی ہے۔ تم کو تو توفیق نہیں۔ اتنے دنوں کے بعد آئی ہو تو دو گھڑی بوڑھی دادی کے پاس ہی بیٹھ جاؤ۔"

"دیکھا۔ میں کہہ رہی ہوں ناں۔"

ثمر کو ساہر کا انداز کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ پتا چل گیا کہ وہ بہت دیر سے آئی ہوئی ہے لیکن اس ایک بات کو بار بار دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔

"شفا کیسی ہے؟ میں آج ہی آئی تھی ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس سے مل کر آؤں۔"

اسی وقت دیوار کے دوسری طرف شور بلند ہو گیا۔ یوں لگا جیسے چھت پر کسی نے فائر کیا ہو۔ ساہر کے کان پہلے ہی اس طرف لگے تھے وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟" ثمر نے کہا۔ ان دونوں کی نظریں ملیں اور سرعت سے وہ گیٹ کی طرف بھاگی تھیں شور بڑھتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

منظر ویسا ہی تھا جیسا ساہر نے ذہن میں ترتیب دیا تھا لیکن کسی قدر رد و بدل کے ساتھ۔

گھر کے صحن میں مجمع لگا تھا۔ تایا جی' تائی جی' ان کا بیٹا اور بہو' آس پڑوس کے کچھ لوگ اور سر جھکا کر کھڑی ہراساں شفا۔

"تم کہاں سے آ رہی ساہر؟" عمیر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"میں ثمر کے گھر گئی تھی اس کی چچی سے پیناڈول لینے۔ کیا ہوا ہے عمیر! یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟ اور یہ شور کیسا تھا؟" وہ عمیر کے قریب ہوتے ہوئے بولی تھی۔ عمیر خاموش رہے ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔

"میں بتا رہی ہوں ناں تایا جی! اوپر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں تو اسٹور سے کتابیں نکالنے گئی تھی۔" شفا کہہ رہی تھی۔

"بھئی۔ میں بھی تو بتا رہا ہوں میں نے خود کسی کو بھاگتے دیکھا تھا۔ غلط فہمی نہیں ہوئی مجھے۔ ایسے ہی تو

میں نے فائر نہیں کیا۔" تایا جی شاید وضاحتوں سے تھک رہے تھے انہوں نے اکتا کر کہا تھا۔ وہ پولیس میں رہے تھے اور ریوالور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

عمیر نے بے ساختہ شفا کی طرف دیکھا۔ ان کے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی تھی۔ مایوسی کے عالم میں انہوں نے جھک کر تایا جی کے کان میں کچھ کہا۔ ان کی بات سن کر تایا جی نے ناسمجھی کے ساتھ تعجب سے انہیں دیکھا پھر بولے۔

"ہاں شاید غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" انہوں نے مجمع تتر بتر کروانا شروع کیا۔

تقی جب تک گھر پہنچا۔ محلے کے لوگ گھر سے نکل رہے تھے۔ اسے گیٹ پر ہی اطلاع مل گئی کہ عمیر کے تایا جی نے چھت پر کسی مرد کو دیکھا تھا۔ انہوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ دیوار پھلانگ کر بھاگ گیا۔ تایا جی نے اسے ڈرانے کے لیے پیچھے سے ایک ہوائی فائر بھی کیا تھا۔

تقی کو سمجھنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا کہ یہاں کیا ہوا ہوگا۔

وہ تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔

☆ ☆ ☆

اندر عدالت لگی ہوئی تھی۔ شفا سر جھکائے کھڑی تھی تایا جی سوالیہ اور غصیلی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ عمیر بالکل خاموش۔ ان کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"میں نے کہا ناں تایا جی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کتابیں نکالنے گئی تھی اسٹور سے۔ اوپر میرے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔" تقی کو لگا' وہ ڈری ہوئی ضرور تھی لیکن اس کا انداز اعتماد سے خالی ہرگز نہیں تھا۔

"اور میں کیا اندھا ہوں۔" تایا جی جلال میں آکر بولے۔ "خواہ مخواہ تو فائر نہیں کیا تھا۔ کسی کو دیکھا تو کیا تھا۔ اور ایک سایہ بھی نہیں تھا وہ تھے۔ مرد کا اور عورت کا۔ اور عورت تو ہو نہیں تم۔ کیونکہ ساہر بیٹا تو ہو نہیں سکتی۔ وہ تو ساتھ والوں کے گھر گئی ہوئی تھی اور اوپر اسٹور میں تم ہی تھیں۔ تو اب تم ہی بتاؤ' وہ لڑکا کون تھا اور تمہارے ساتھ اوپر کیا کر رہا تھا۔" کمرے میں سناٹا پھیل گیا۔ ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ تقی نے دیکھا۔ عمیر کی رنگت غیر معمولی حد تک زرد ہو رہی تھی۔

"عمیر بھائی!" وہ گر ہی جاتے' جو اگر تقی نے بڑھ کر اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔

شفا اور ساہر بھی گھبرا کر ان کی طرف بڑھی تھیں لیکن شفا کا ہاتھ عمیر نے ہٹا دیا۔ ایک پل کا عمل تھا۔ کسی نے دیکھا یا نہیں لیکن شفا کے دل میں انی کی طرح گڑ گیا۔ وہ چپکے سے کچھ قدم پیچھے سرک گئی۔

جب عمیر کی حالت ذرا سنبھلی تو تایا جی نے سب کو کمرے سے جانے کے لیے کہا۔ سب چلے گئے۔ اب کمرے میں صرف تایا جی' عمیر اور تقی رہ گئے تھے۔ وہ چونکہ عمیر کو سہارا دیے کھڑا تھا اس لیے تایا جی نے اسے جانے سے منع کر دیا تھا۔

"عمیر! بچے میری بات دھیان سے سنو۔"

"میں کیا سنوں تایا جی! میں کچھ سننے کے قابل نہیں رہا۔" انہوں نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ رو دینے کے قریب ہوں۔

"صدمہ بڑا ہے میرے بچے! لیکن تمہیں سنبھلنا تو ہوگا۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں جب گھر کی دیواروں میں سوراخ ہو جائے تو دنیا کو گھر میں جھانکنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ سوراخ ہی بند کرنا پڑتا ہے۔ آدھے محلے کو خبر ہو گئی کہ شفا نے کسی کو بلا رکھا تھا۔ اب پردہ تو ڈالنا ہی پڑے گا میری مانو۔ شفا سے پوچھو وہ کون تھا۔ اسی کے ساتھ رخصت کر دو۔"

تایا جی ویسے عقل کے پورے پورے ہی تھے۔ تقی نے دل میں سوچا۔ معتبر بن کر اپنی طرف سے بڑا مشورہ دیا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہو۔" تقی نے یکدم مداخلت کی تھی۔ تایا جی نے اسے یوں گھورا جیسے کہہ رہے ہوں" میاں تم کون؟

کس خوشی میں ٹانگ پھنسا رہے ہو۔"

"میرا مطلب ہے اور کوئی بھی نہ ہو اور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو کہ آپ نے کسی کو دیکھا ہے۔" ان کی نظروں کی تیزی کے باوجود وہ بولنے سے باز نہیں آیا۔

"اس عمر میں بھی میری آنکھوں کی تیزی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ آنکھیں بند کر کے بھی گولی چلاؤں تو مجال نہیں کہ نشانہ چوک جائے۔ وہ تو اس بدبخت پر احسان کیا کہ نشانہ ہی خطا کر دیا ورنہ اس گھر میں ایک لاش پڑی ملتی۔" تایا جی نے کہا۔

"جنہوں نے عزت سے رخصت کروانا ہو' وہ رات کے اندھیروں میں چھپ کر ملنے نہیں آیا کرتے تایا جی!" عمیر کی آواز نے ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

تقی نے دکھ سے عمیر کی طرف دیکھا۔ اس شخص کو بہن کے صدمے نے ادھ موا کر دیا تھا۔ بیوی کی نالائقی کی اطلاع تو اس کی جان ہی لے لیتی۔ یعنی عمیر کے لیے تو دونوں طرح ہی صدمہ تھا' دکھ تھا' پریشانی تھی۔ وہ سب سے ہی برا پھنسا تھا۔

تقی پھر کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ یہ تو خیر طے تھا کہ اس نے ساہر کے بارے میں ایک جملہ نہیں بولنا تھا۔ وہ تو صرف عمیر کو خبردار کرنے آیا تھا۔ ہاں یہ نہیں سوچا تھا کہ کس طرح کرنا ہے بس آ گیا تھا۔ آ ہی گیا تھا تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا۔

"پھر کوئی رشتہ ہے نظر میں؟" تایا جی کی آواز اسے اپنی سوچوں سے کھینچ لائی۔ تقی کو ایک دم یہ آئیڈیا پسند آیا۔ شفا کو شادی کر کے اس گھر سے رخصت کر دیا جاتا تو ساہر کو کچھ کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔

"مجھے تو اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آ رہا ہے۔ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں گو کہ فیصلہ کرنے کا بھی مجھے حق ہے لیکن مصلحتاً چپ ہوں۔ تم شفا کے بھائی ہو' خود ہی فیصلہ کرو۔ جیسے تیسے کر کے اس کو رخصت کر دو۔"

"آپ بڑے ہیں تایا جی! جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔"

عمیر نے مری ہوئی آواز میں کہا تھا۔ تایا جی اینڈ فیملی خاندان کی سب سے کھپتی فیملی تھی ان کے کان میں بات پڑنے کا مطلب رائی کا پہاڑ بنوانا تھا۔ عمیر اس صورت حال سے پریشان ضرور ہو گئے تھے لیکن اتنے بھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ "فوراً" سے بھی پہلے کوئی حتمی فیصلہ کا اختیار سونپنے کا مقصد محض انہیں چپ کروانا تھا اور کچھ نہیں تو اسی لحاظ میں چپ رہ لیتے۔

"یہ کہہ کر تو تم نے میرا مان بڑھا دیا ہے عمیر بیٹے!" تایا جی فوراً جذباتی ہو گئے۔ "تمہاری نظر میں کوئی رشتہ ہو تو بتاؤ ورنہ میرے سالے کا لڑکا ہے راشد۔ اپنی شفا سے عمر میں چند سال بڑا ہی ہو گا۔ نسبت روڈ پہ اسپیئر پارٹس کی بہت بڑی دکان ہے اس کی۔ شفا کو خوش رکھے گا۔"

"راشد۔" عمیر نے ذہن دوڑایا اور راشد کا نقشہ یاد آتے ہی دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"لیکن۔ راشد تو پیدائشی ابنارمل ہے تایا جی! میں ملا ہوا ہوں اس سے۔"

"ارے کہاں کا ابنارمل۔ مردوں میں سب کچھ نارمل ہی ہوتا ہے بچے۔ وہ تو بچپن میں کچھ مسئلہ تھا اس کے ساتھ۔ جو بعد میں اس کے ماں باپ نے علاج کروایا تو بڑے ہونے پر ٹھیک ہو گیا۔ تم بے فکر ہو جاؤ وہ نارمل ہے یونہی تو اتنا اچھا کاروبار نہیں چلا رہا۔ پورا گھر سنبھالا ہوا ہے اس نے۔ اور شفا میری اپنی بچی ہے میں غلط فیصلہ تھوڑا کروں گا اس کے لیے۔"

"اور اس کا تو ہاتھ بھی مفلوج ہے۔" عمیر نے پھر کہا۔

"ہاتھ کا تھوڑا مسئلہ ضرور ہے لیکن بالکل بے کار نہیں ہے۔" معتبر تایا جی بولے۔

"لیکن تایا جی!"

"ٹھیک ہے بھئی۔ پھر خود ہی رشتہ ڈھونڈ لو۔ ہم تو تمہاری بھلائی ہی سوچ رہے ہیں۔ ابھی تک گھر کی بات گھر میں ہے لیکن ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ شفا نے جو حرکت کی اس کی بھنک بھی کسی کو پڑ گئی تو مفلوج ہاتھ والے راشد کا رشتہ بھی نہیں ملے گا۔ لکھ کر رکھ لو

میری بات۔" تایا جی نے فوراً آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

عمیر تذبذب میں پڑ گئے۔ انہیں تو اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"ٹھیک ہے تایا جی! جیسے آپ کی مرضی۔" ان کی آواز بالکل ہی مردہ ہو گئی تھی۔

اب کی بار تقی کا دماغ اڑ گیا۔

"ایک منٹ۔" اس نے فوراً مداخلت کی۔ "عمیر بھائی! آپ جلد بازی میں فیصلہ مت کریں۔ راشد کا صرف ہاتھ مفلوج نہیں ہے وہ واقعی ابنارمل ہے۔ کاؤنٹر پر بیٹھ جانا اسے نارمل ثابت نہیں کر سکتا۔ آپ نے مجھے خود بتایا تھا' وہ اپنے والد کی مدد سے کاروبار چلا رہا ہے۔ یعنی صرف کاؤنٹر پر بیٹھتا ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو اسے؟" تایا جی گرجے۔

"دو ہفتے پہلے کسی کام کے سلسلے میں عمیر بھائی مجھے اس کی دکان پر لے کر گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"عمیر! یہ لڑکا کون ہوتا ہے ہمارے گھر کے معاملے میں بولنے والا؟"

"بزرگوار! معافی چاہتا ہوں لیکن ہوتے تو آپ بھی کوئی نہیں بولنے والے۔ پھر بھی گھنٹہ بھر سے بول رہے ہیں۔" تقی نے چڑ کر کسی لحاظ مروت کے بغیر کہا تھا۔ عمیر کی خاموشی اس کے حوصلے کو تقویت دے رہی تھی۔

عمیر سر جھکائے بے جان سے بیٹھے تھے۔ تقی پنجوں کے بل ان کے سامنے بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر نرم' مخلص آواز میں بولنے لگا۔

"عمیر بھائی! جلد بازی میں کوئی ایسا فیصلہ ہرگز نہ کریں جس پر آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے۔ آپ نے ہی یہ بات مجھے سمجھائی تھی نا کہ اللہ پریشانی دیتا ہے تو اس کا حل بھی دے دیتا ہے۔ میں مانتا ہوں آپ کی پریشانی بڑی ہے لیکن اس کا کوئی نہ کوئی پوزیٹو حل بھی ضرور ہو گا۔ آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں یا پھر کسی پاگل سے بہن کو بیاہنے سے اچھا ہے اسے زہر دے دیں۔"

عمیر نے دہل کر تقی کو دیکھا تھا۔ تایا جی آگ بگولہ ہو گئے۔

"اچھے خاصے لڑکے کو پاگل کہہ رہے ہو' کسی گھٹیا باپ کی اولاد لگتے ہو۔"

تقی کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ بات باپ تک آ گئی تھی اب پیچھے ہٹنا بے غیرتی تھی۔

"اتنا اچھا خاصا ہے تو آپ اپنی بیٹی کو کیوں نہیں بیاہ دیتے؟" وہ کھڑے ہوتے ہوئے پلٹا اور تایا جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میری بیٹی کو رشتوں کی کمی نہیں ہے اور نہ ہی وہ رات کے اندھیرے میں کسی کے ساتھ منہ کالا کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے کہ میں اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے کسی پاگل سے بیاہنے کا سوچوں۔"

انہوں نے تڑخ کر کہا تھا تقی طنز سے ہنس دیا۔

"سن لیا آپ نے عمیر بھائی! اپنی بیٹی کی باری آئی تو ان کو راشد کا پاگل پن نظر آ گیا۔ کیسے دوغلے انسان کی بات مان رہے ہیں آپ۔"

"میں دوغلا ہوں تو تم اپنا اچھا پن ثابت کر دو۔ عمیر کے اتنے ہی سگے ہو تو اس کی پریشانی تم دور کر دو۔ کر لو شفا سے نکاح۔"

تایا جی نے اپنی بھدی آواز میں بم پھوڑا تھا۔ تقی کا دماغ سنسنا اٹھا۔ اس نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ آس بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"م۔ میں کیسے؟ عمیر بھائی کو پتا ہے میں کمیٹڈ ہوں۔ آدھی منگنی ہی سمجھ لیں۔"

"آدھی کیا پوری منگنی بھی توڑی جا سکتی ہے۔" تایا جی نے خباثت سے کہا تھا۔ "یا ایسا کرو شفا سے پہلے نکاح کر لو۔ اس منگنی والی سے دوسرا کر لینا۔"

تقی کا دل چاہا بزرگی کا احترام رکھے ایک طرف اور ایک آدھ گھونسا جڑ ہی دے بزرگوار کو۔

"آپ راشد کے لیے بات کریں تایا جی!" عمیر نے سر جھٹکتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

تقی نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ تو

عورت کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کہاں برداشت کرتا۔ اور وہ تو پھر اس کے محسن تھے۔

"رکیں عمیر بھائی!" اس کے حلق سے بمشکل لفظ نکلے۔ "اپنی بہن پر ظلم نہ کریں۔ میں تیار ہوں اس سے شادی کرنے کے لیے۔ لیکن آپ کو مجھے کچھ وقت دینا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں بھئی۔ جب فیصلہ کر ہی لیا ہے تو دیر کیسی؟ یہ تو صاف بہانے بازی ہے۔" کبھی تایا جی نے خود کو چال باز بھی ثابت کیا۔

"بہانے بازی نہیں کر رہا۔ عمیر بھائی جانتے ہیں میں فائننشلی اسٹرانگ نہیں ہوں۔ کوئی کیریئر نہیں ہے میرا۔ ایسے شادی کر لوں تو بیوی کو کھلاؤں گا کہاں سے۔" اس نے پتے کی بات کی تھی۔ خیال تھا عمیر بھائی قائل ہو جائیں گے۔ شادی کے لیے اسے جتنا وقت ملتا اس دوران کچھ اور بھی سوچا جا سکتا تھا۔

"کیریئر کا کیا ہے وہ تو شادی کے بعد بھی بنتا رہے گا جہاں تک رزق کا تعلق ہے تو وہ عورت کی قسمت سے ہی آتا ہے۔ میں وسیم سے کہتا ہوں نکاح خواں اور گواہوں کا بندوبست کرے۔"

"تو کیا جلدی ہے میں کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔ نکاح کل بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی تو مجھے شوٹنگ پہ جانا ہے۔" وہ بوکھلا ہی گیا۔

"تمہارا بھروسا نہیں ہے ہمیں۔ شوٹنگ کے بہانے کہیں پلٹ ہی نہ ہو جاؤ۔" کبھی تایا جی چال باز تو جو تھے سو تھے جلد باز بھی تھے۔ جھٹ پٹ باہر نکل گئے۔

"عمیر بھائی! آپ تو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ایسے کیسے نکاح کر سکتا ہوں۔ مہک کو کانفیڈنس میں لینا ہوگا اسے سمجھانا ہوگا۔"

اس کا جملہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ عمیر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ تقی ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے حلق میں جیسے آواز ہی نہیں رہی تھی۔ لمبے چوڑے مرد کو روتے دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔

"تایا جی کی کوئی ایک بات تو ماننا ہی پڑے گی۔ تم نہیں تو راشد۔ ان کی زبان بند کروانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ وہ ایسے انسان نہیں ہیں کہ کسی کا راز رکھ سکیں۔ تم انہیں نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ کاش کل کی صبح ہونے تک میرے اندر اتنی ہمت ہی آجائے کہ میں شفا کو زہر دے سکوں یا خود ہی کھا لوں۔" وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ تقی نے میکانکی سے انداز میں ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اور وہ جو آدھ گھنٹے کے الٹی میٹم پر شوٹنگ چھوڑ کر آیا تھا ٹھیک آدھ گھنٹے کے بعد بیٹھا اپنے نکاح نامے پر سائن کر رہا تھا اور اس کی شکل ایسی بنی ہوئی تھی کہ لگتا تھا ابھی رو دے گا۔

☆ ☆ ☆

اور یوں ساحر کی ساری چالاکی اسی پر الٹی پڑ گئی۔

اس نے بڑی محنت تن دہی سے گڑھا کھودا تھا اس گڑھے میں خود کو گراتے گراتے بچی تھی لیکن پھر بھی خسارہ اسی کے ہاتھ آیا تھا۔ شفا کو اچھا خاصا بر مل گیا۔ بھائی کی زندگی برباد ہوئی سو الگ۔

بلکہ برباد کیا ہوئی۔ لگ تو ایسا رہا تھا۔ بھائی نے خود اس بربادی کو اپنے سر لیا ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا شفا کو قتل کر دے یا تقی کو۔

عمیر سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی ذرا سا بھی کچھ کہتی تو بری بنتی۔ اس کے دل میں جو بھی تھا مگر اپنا آپ کم سے کم عمیر کی نظروں میں خراب کرنا وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فی الحال خاموش رہے اور جو ہو رہا ہے اسے کسی بدمزگی کے بغیر ہو جانے دے۔ شفا بالکل خاموش تھی لیکن اس سے پہلے وہ عمیر کے سامنے صاف ہی انکار کر چکی تھی۔

"آپ مجھے اس غلطی کی سزا دے رہے ہیں جو میں نے کی ہی نہیں۔ میں بتا تو رہی ہوں اوپر کوئی بھی نہیں تھا۔ تایا جی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ عمیر بھائی! میری

بات کا یقین کریں۔" وہ آخر میں رونے والی ہو گئی تھی۔

"تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں یا تقی سے چپ چاپ نکاح کر لو یا میرا مرا ہوا منہ دیکھ لو۔" عمیر نے اس سے سرد لہجے میں کہا تھا۔

شفا دنگ رہ گئی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا ناں آپ کو جو مجھ سے محبت کا دعوا تھا وہ غلط تھا۔ آپ تو کہتے تھے میں شفا کا بھائی نہیں باپ ہوں۔ باپ بن کر کیا محبت کریں گے۔ آپ تو بھائی بن کر اعتبار بھی نہیں کر رہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"یہ کیسی محبت ہے جو یقین کرنا بھی نہیں جانتی۔ جسے اپنی تربیت پر بھروسا ہی نہیں ہے۔" وہ اب سسکنے لگی تھی۔

عمیر کے دل میں انی سے گڑ گئی۔

"اگر اب تمہیں اپنے بھائی کی محبت سمجھ میں نہیں آئی تو ساری زندگی نہیں آسکتی۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں تمہارا نکاح تقی سے ہوگا اور آج ہی ہوگا۔ تمہیں اس فیصلے سے انکار ہے تو اپنا حق استعمال کرو۔ لیکن اس کے بعد جو ہوگا اس کی ذمہ داری بھی تم ہی کو قبول کرنا ہوگی۔ میں زندہ نہیں ہوں گا تمہارے کسی بھی عمل کو جسٹی فائی کرنے کے لیے۔"

اس کے بعد وہ کیا کہتی۔ کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

سمیر کو تقی نے بلوا لیا تھا۔ ایمرجنسی کال گئی تھی سو وہ ایمرجنسی میں ہی بھاگا چلا آیا یعنی نائٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ تقی کا نکاح ہنگامی بنیادوں پر ہو رہا ہے تب سے اس کا منہ حیرانی سے کھلا ہوا تھا یعنی اب اس گھریلو سی تقریب میں صرف دولہا نہیں تھا جو ہونق لگ رہا تھا سمیر بھی اسے کمپنی دے رہا تھا۔

"ناگہانی حادثات ہو جاتے ہیں۔ ناگہانی وفات کا بھی اکثر سنا ہے لیکن ناگہانی نکاح پہلی بار ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ معاملہ کیا ہے جگر؟"

اس نے تقی کے کان میں گھس کر پوچھا۔

"لمبی بات ہے، فرصت سے بتاؤں گا۔ ابھی تو تم گواہ بن کر سائن کرو۔"

"پھر بھی کچھ تو مجھے پتا ہونا چاہیے۔ کل کو تم پر اس نکاح کے چکر میں کوئی کیس ویس بن گیا تو مجھے اپنی سیف سائیڈ کا تو پتا ہونا چاہیے نا۔" اپنی طرف سے بڑا عقل مند بن کر کہہ رہا تھا۔ تقی کی ایک گھوری نے اس کی عقل کے غبارے سے ہوا نکال دی۔

"تم نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ تم جیسوں کو کوئی اپنے گھر کی شادیوں میں نہیں بلاتا کہ بچے ڈر جاتے ہیں اور تم شکل سے ہی انتہائی کیریکٹر لگتے ہو۔ میں نے تمہیں گواہ بننے کا کیا کہہ دیا تم تو سر ہی چڑھ گئے۔ سیف سائیڈ کا تو پتا ہونا چاہیے۔" وہ حد سے زیادہ جلا ہوا تھا سمیر کھسیا کر ہنسنے لگا۔

"تو تو برا ہی مان گیا یار!"

وہ بے چارہ باتیں سن کر ٹھنڈا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

تایا جی ایسے خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے جیسے عمیر کی جگہ وہ اپنے کندھوں کے بوجھ کے فرض سے سبک دوش ہو گئے ہوں۔ تقی جب بھی ان کی طرف دیکھتا، دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا تھا۔

شفا کے بارے میں اسے پتا نہیں تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہے۔ عمیر بھائی اسے مطمئن لگے جبکہ ساحر... وہ سلگتی صاف دکھائی دے رہی تھی یا... شاید چونکہ تقی اس کی کیفیت سے واقف تھا سو سب سمجھ رہا تھا ورنہ اس کی جلی بھنی شکل دیکھ کر کوئی نہیں چونکتا۔

تین گھنٹے بعد اس زبردستی کی تقریب سے گلوخلاصی ہوئی لیکن اسٹوڈیو جانے کا اب ہرگز کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ فردوس صاحب زبان کے پکے تھے یعنی رول تو گیا اس کے ہاتھ سے۔ وہ تو عمیر کو خبردار کرنے آیا تھا، یہاں

نکاح گلے پڑ گیا۔ ایک تو اس بات کی بے زاری تھی دوسرے روٹی بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ یعنی بے زاری ہی بے زاری۔
مجمع چھٹتے ہی سمیر نے اس کا پیچھا لیا۔ اسے اصل معاملہ جاننے کا شوق تھا۔
تقی نے ساری بات کہہ سنائی۔ سمیر بھی سن کر کچھ دیر بول نہیں سکا۔
"ساحر آپ نے واقعی برا کیا۔ وہ لڑکی۔۔ میرا مطلب ہے شفا بھابھی۔۔" وہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ تقی نے بری طرح ٹوک دیا۔
"بھابھی صرف مہک بنے گی تمہاری۔ یہ تو صرف حادثہ ہے۔"
سمیر کھسیا سا گیا۔
"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن اب آگے کیا ارادہ ہے؟"
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔۔ میرے تو نیکی گلے ہی پڑ گئی۔ مہک کا سامنا کیسے کروں گا؟ وہ تو مجھے جان سے مار دے گی۔"
"ایسی جان کا فائدہ بھی کیا ہے، جس نے صرف لعنت ملامت ہی سہنی ہے۔" ہمیشہ تقی لقمے دیا کرتا تھا آج سمیر کی باری تھی۔ تقی نے گھور کر دیکھا تو جلدی سے بولا۔
"پہلے ابا ناراض اور اب مہک بھی۔ تو آخر کب سوچ سمجھ کر فیصلے کرنا سیکھے گا تقی؟"
"چلو جی۔ اب تمہاری باتیں شروع۔ او بھائی! شرمندہ کرنے کے لیے میرا ضمیر کافی ہے، تم زحمت نہ کرو۔" مگر سمیر ہنس دیا۔
"نہیں۔ شرمندہ کیوں کرنا ہے، کام تو تم نے اچھا ہی کیا ہے۔ کسی کی پریشانی دور کی، کسی کو سہارا دیا۔۔ دیکھنا اس کا اجر تمہیں اللہ ضرور دے گا۔"
تقی نے قدرے تعجب سے سمیر کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا وہ بھی اسی کی ہاں میں ہاں ملائے گا یعنی ساحر کے عمل کو غلط ضرور کہے گا لیکن اس نکاح کے حق میں بات ہرگز نہیں کرے گا، لیکن سمیر بالکل متضاد بات کر رہا تھا اور اس نکاح کو اس کے حق میں خوش آئند قرار دے رہا تھا۔
"تمہیں کیسے پتا، یہ نکاح میرے حق میں اچھا ثابت ہوگا۔ ادھر نکاح نامے پر سائن کیا۔ ادھر پوری ٹیلی فلم میرے ہاتھ سے نکل گئی۔۔ یہ اچھائی ملی مجھے؟"
"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ مجھے کیسے پتا، یہ نکاح تمہارے حق میں اچھا ثابت ہوگا۔۔ بس میرا دل کہہ رہا ہے۔"
"تمہارے اس "چول" دل کی کون مانے۔ تم نے تو خود اس کی جب مانی منہ کی ہی کھائی ہے۔" تقی جلا بیٹھا تھا، اسے کسی کی مثبت بات بھی منفی ہی دکھائی دے رہی تھی۔
"میں تو پھر نکلتا ہوں، دیر بھی بہت ہوگئی۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔" سمیر نے مسکرا کر ہی کہا۔ تقی کی حالت سمجھ رہا تھا سو اس کی سن بھی لی۔ اپنی سنا بھی دی اور چلا گیا۔ رات بھر رک کر تسلی تو نہیں دے سکتا تھا کہ وہی بات اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔
وہ دونوں گیٹ سے باہر کھڑے بات کر رہے تھے سمیر کے جانے کے بعد وہ اندر جانے کے بجائے گلی میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اس کا ذہن کبھی خالی ہو جاتا، کبھی مختلف قسم کی سوچیں اسے گھیر لیتیں۔
وہ شفا کو اس مصیبت سے بچانا ضرور چاہتا تھا، لیکن نکاح۔۔ ہرگز نہیں۔
بے شک کاغذی ہی تھا، لیکن تھا تو سہی۔ یہ تو خیر طے تھا کہ اس تعلق کو اس نے نبھانا تو نہیں تھا۔ اس نے وہیں کھڑے طے کر لیا کہ عمیر بھائی کو صاف بتا دے گا، وہ اس رشتے کو نبھا نہیں سکتا اور۔۔ شاید یہ بات تو کہیں اندر خانے وہ خود بھی جانتے ہی تھے۔ اس وقت تو صرف مصیبت بنے تایا جی کو ٹالنا ضروری تھا سو ٹال ہی دیا لیکن۔۔ لیکن وہ اس لیکن سے آگے وہ نہ جا پاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دیر سے گھر آیا، دروازہ عمیر نے کھولا۔ تقی نے

نظریں بے اختیار شفا کے کمرے کی طرف گئیں۔ لائٹ جل رہی تھی۔

"بڑی دیر لگادی آنے میں۔ میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔" عمیر نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ "میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔"

تقی خاموش ہی رہا تکلفاً "بھی اس سے کچھ کہا نہیں گیا۔ عمیر کو سبکی سی محسوس ہونے لگی تو پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے ہٹنے لگے تب ہی تقی نے سرعت سے انہیں پکار لیا۔ عمیر وہیں کھڑے ہلنے تھے۔ تقی متذبذب سا انہیں دیکھتا رہا پھر آہستگی سے بولا۔

"عمیر بھائی! میری پوزیشن آپ سمجھتے ہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا، لیکن آپ کے تایا جی نے ایسی جلدی مچائی کہ۔"

"مجھے احساس ہے۔ یو شڈ ٹیک یور ٹائم۔ میری طرف سے تمہیں پریشرائز نہیں کیا جائے گا۔"

تسلی ہونے کے بجائے تقی کو اس بات سے اور الجھن محسوس ہوئی۔ آخر وہ سمجھ کیوں نہیں جاتے کہ تقی اس رشتے کے حق میں نہیں ہے۔

"تم آرام کرو تقی! ہم صبح بات کریں گے۔"

تقی نے محسوس نہیں کیا، لیکن عمیر کا انداز اس سے بات کرتے ہوئے اب جھجک آمیز ہو گیا تھا جیسے کوئی کسی سے دبنے لگے۔

وہ سرہلا کر رہ گیا۔ پیاس لگی تھی تو کمرے میں جانے سے پہلے کچن میں آگیا۔ ساہر چولہے کے پاس کھڑی تھی یعنی سکون کی نیند تو آج اس گھر کے کسی بھی مکین کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ساہر نے گردن موڑ کر دیکھا۔ تقی کو دیکھ کر تاثرات کرخت ہو گئے۔ وہ خوب انتہا پیچ کرنے لگی۔ تقی نے دو منٹ تو برداشت کیا پھر چڑ کر ٹوک دیا۔

"آہستہ کام کرلو۔"

ساہر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تم فوراً" سے پہلے کچن سے نکل جاؤ۔ میں اپنے معاملات میں کسی کی ہدایات اور دخل اندازی برداشت نہیں کرتی۔" اس کا لہجہ بہت مغرور سا تھا، لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ کچن سے باہر نہ جانے پائے۔

تقی نے جیسے خود پر جبر کرتے ہوئے پانی کے دو گھونٹ حلق سے اتارے تھے۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارے معاملات میں دخل دینے کا۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں احساس تک نہیں میں نے تمہارے سر سے کتنی بڑی مصیبت ٹال کر اپنے سر لی ہے۔" اس کی آواز بھی دھیمی اور لہجہ تیز تھا ساہر کو تو جیسے اس بات پر آگ ہی لگ گئی۔

"تم سے کس نے کہا تھا فرشتہ بن کر درمیان میں کودنے کے لیے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا کچھ تو نتیجہ نکلنا ہی تھا۔ تمہیں اپنے گھر میں رکھا میں نے۔ تمہیں تو اتنا خیال بھی نہیں آیا اسی احسان کے بدلے اس معاملے میں دخل نہ دو۔"

"دوسروں کے معاملات۔؟ صحیح کہہ رہی ہو۔ اچھا ہوتا میں تمہارا گھر برباد ہونے دیتا۔ عمیر بھائی کو تمہاری اصلیت پتا چلنے دیتا۔ میں نے تو احسان کا بدلہ ہی چکایا ہے۔ یاد کرو صرف تم نے نہیں رکھا تھا مجھے اس گھر میں۔ عمیر بھائی نے بھی رکھا تھا اسی لیے ان کی بہن کو بھی بچایا میں نے۔"

"تو بس کرو تقی! میرا گھر کیا بچایا تم نے۔ تم تو خود کو نہیں بچاسکے۔ مجھ سے چاہتے ہو کہ تمہارا احسان مانوں۔"

"خود کو اس لیے نہیں بچا سکا کہ مجھے تمہاری خیریت زیادہ عزیز تھی۔ اس لڑکی کی زندگی جہنم بنا کر صرف بددعائیں سمیٹ سکتی تھیں۔ ان ہی بددعاؤں سے بچایا میں نے تمہیں۔" وہ گلاس پٹخ کر کچن سے نکل گیا تھا۔

"بڑا احسان کیا میرے سر پر۔" ساہر بری طرح تپی تھی۔

☼ ☼ ☼

تقی نے ہی نہیں شفا نے بھی وہ رات آنکھوں میں

کاٹی تھی۔

جب بغیر غلطی کیے سزا ملے "آپ کو معتوب ٹھہرایا جائے تو انسان کے پاس سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لوگوں نے اس پر انگلی اٹھائی اسے غلط ثابت کیا۔ دکھ لوگوں کے رویے کا نہیں تھا دکھ تو یہ تھا کہ عمیر بھائی نے یقین کرلیا۔

پہلے پہل جب روحیل نے اس سے موبائل پر رابطہ کیا تو وہ حیران ہوئی۔ اس کے پاس اس کا پرسنل نمبر کہاں سے پہنچ گیا۔ وہ تین چار دن اس سے بات کرتی رہی۔ نئی نئی سرگرمی ہاتھ لگی تھی۔ صنف مخالف کی کشش سے انکار نہیں کیا جاسکتا پھر روحیل تو روحیل تھا۔ اسے ایک نامعلوم سا لطف آنے لگا۔ پھر ایک روز نماز پڑھ رہی تھی تو سلام پھیر کر اسے خیال آیا۔ نماز کے دوران بھی وہ مسلسل روحیل کے متعلق ہی سوچتی رہی ہے اور جو خیال آپ کو نماز سے بے رغبت کردے، وہ ٹھیک کیسے ہوسکتا ہے۔

کیا وہ کبھی عمیر بھائی کو بتاسکے گی کہ اس کی فون پر کسی لڑکے سے دوستی ہے؟ یقیناً "نہیں۔ تو جس تعلق کا ذکر وہ اپنے سب سے قریبی رشتے کے سامنے نہیں کرسکتی اس کے بے وزن ہونے کا اندازہ تو اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل انسان کے اندر ایک میٹر لگا ہوتا ہے، جو ہر وقت اسے سگنل دیتا رہتا ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے۔ کس چیز کو اسے دنیا سے چھپانا ہے کس کو نہیں چھپانا۔ جس تعلق کا ذکر آپ کھل کر زمانے کے سامنے نہ کرسکیں یا جس تعلق کو چھپانے کا سگنل دل دے، سمجھ لیں وہ غلط ہے۔

تو شفا پر اللہ نے احسان کیا اور وہ سمجھ گئی اس کے اور روحیل کے درمیان جو تعلق بن رہا ہے وہ غلط ہے۔ اسی روز سے اس نے روحیل سے بات کرنا چھوڑ دی۔ روحیل کی خود پسندی پہ یہ بات تازیانہ بن کر لگی اور وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

"اسے اس طرح کے مسیجز بھیجتا کہ وہ خائف ہوکر اس سے بات کرتی۔ پہلے پہل تو سچ بات ہے اس نے روحیل کی دھمکیوں کی بھی پروا نہیں کی تھی، لیکن آہستہ آہستہ وہ ڈرنے لگی اور ایک دوبار تو اس کی منتیں کرتے رو بھی پڑی۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب تقی نے اسے مشورے سے بھی نوازا تھا اور جس کا اس نے بہت برا بھی مانا تھا۔ پھر روحیل نے کہا کہ اس کے پاس شفا کی کچھ تصویریں ہیں۔ وہ نہ مانی۔ اس نے کب تصویریں بھیجی تھیں روحیل کو۔

لیکن روحیل نے دھمکی دی کہ وہ تصویریں عمیر کو بھجوادے گا۔ اس نے اتنا زچ کردیا کہ شفا کو اس سے ملنے کی ہمت کرنا پڑی وہ کوئی اچھی خوش گوار ڈیٹ پر نہیں گئی تھی، لیکن عمیر کو یہی تاثر ملا اس نے اپنی صفائی اس وقت بھی دینا چاہی تھی لیکن عمیر کو اس کی بات پر بھروسا نہیں تھا۔ شفا کو لگا اس کی غلطی ہے تو ناراضی تو بھگتنا ہی پڑے گی۔ لیکن اب جو ہوا اس نے تو حد ہی کردی تھی۔

عمیر کو اسے ایک دم سے مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے تھا، کم سے کم انہیں اس کی بات تو سننا چاہیے تھی اور پھر نکاح جیسا فیصلہ۔

کیا وہ اتنی ناقابل بھروسا لگتی تھی انہیں کہ راتوں رات پابند کردیا۔

یہ تو بڑی ناانصافی کردی بھائی نے۔ لیکن اب وہ خاموش ہی رہے گی۔ انہیں اس پر بھروسا نہیں تو یونہی سہی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مکمل ناول

نازیہ جمال

"مس! فیری ٹیلز میں تو شہزادی نے بدصورت مینڈک کو پوری طاقت سے دیوار پہ دے مارا تھا۔ جونہی مینڈک دیوار سے ٹکرایا تو وہ خوب صورت شہزادہ بن گیا۔ اس طرح شہزادہ اصل روپ میں واپس آجاتا ہے۔ لیکن میرے فرینڈ علی کو اس کی ماما نے ذرا ڈفرنٹ اسٹوری سنائی ہے۔"

حساب کا سوال حل کرتے ہوئے عطیب کو کچھ یاد آیا تو فوراً اس سے پوچھ بیٹھا۔ ٹیکسٹ بک کی ورق گردانی چھوڑ کر وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"علی کی ماما نے اسے کیا بتایا ہے؟"

"وہ کہتی ہیں۔ شہزادہ دیوار سے ٹکرانے سے واپس اپنی اصل شکل میں نہیں آیا تھا بلکہ جب شہزادی مینڈک کو چومتی ہے تو وہ انسان بن گیا' کتنا ڈفرنس ہے ناں ان دونوں باتوں میں' حالانکہ اسٹوری تو ایک ہی ہے۔" آٹھ سالہ عطیب کچھ اس معصومیت سے بولا کہ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"مائی سویٹ ہارٹ! وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گریم برادرز کی اسٹوریز میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اب معلوم نہیں ان کے اوریجنل کلیکشن میں کیا

تھا۔ شہزادی کا چومنا یا دیوار سے مینڈک کو دے مارنا۔ بہرحال غلط علی کی ملمانے بھی نہیں سنائی۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس جو اسٹوری بک ہے اس میں یہی لکھا ہو۔"

پیار سے جواب دیتے ہوئے اس کی نظر بے اختیار وال کلاک پہ پڑی۔ دن کا ایک بج رہا تھا۔ گلاس ونڈوز پہ پڑے بھاری پردے کی وجہ سے وہ پہر کا تعین کرنے سے قاصر تھی۔ تاہم کلاک نے اسے بخوبی باور کرا دیا تھا کہ اسے آج معمول سے دیر ہو چکی ہے۔

"ارے! کہاں چل دیں۔ کولڈ ڈرنک تو لو۔ کھانے کا بھی ٹائم ہو رہا ہے۔" اسی دم تازہ غسل لیے ہوئے نکھری نکھری سی سارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی، جس میں مینگو اسکواش کے دو گلاس رکھے تھے۔ اسے بیگ اور چادر سنبھالتا دیکھ کر بے ساختہ ٹوک دیا۔

"بس باجی! چلتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ کچھ دیر بعد عصر کی اذان بھی ہونے والی ہے۔"

"اوکے! اپنی سیلری تو لیتی جاؤ۔" گلاس اس کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد سارہ نے ٹیبل کی دراز سے پرس نکالا اور ہزار ہزار کے سات نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"بلال تم سے بہت مطمئن ہیں۔ عطیب کے ڈرامہ انگیز امز کا رزلٹ دیکھ کر مجھ سے کہنے لگے کہ اب عطیب کی ٹیوٹر کی سیلری بڑھا دینی چاہیے۔" سارہ نے مسکرا کر بتایا۔

"میرا کوئی خاص کنٹری بیوشن نہیں ہے۔ یہ عطیب کی اپنی محنت اور لگن ہے جو مطلوبہ رزلٹ لاتا ہے۔ آپ کا بیٹا بہت جینئس ہے۔ بعض اوقات تو مجھے بھی لاجواب کر دیتا ہے۔" دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس نے ایک نظر کیوٹ سے عطیب پہ ڈالی جو اب اپنی کتابیں سمیٹ رہا تھا۔

بھابھی کی ناراضی کے خیال سے گلاس غٹاغٹ چڑھایا۔ پیسے پرس میں ڈال کر وہ سارہ کو خدا حافظ کہہ کر جلدی سے باہر نکل آئی۔

جون کا آگ برساتا سورج روز کی طرح زمین کو دہکا رہا تھا۔ سیاہ تارکول کی سڑک دور تک ویران نظر آ رہی تھی۔ شہری حدود سے نکل کر سڑک پہ آتے ہی اس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیے تھے۔ سڑک تانبے کی مانند گرم تھی جس کی تپش کو وہ جوتی کے تلوے سے بھی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن وہ موسم کی شدت اور راستے کی طوالت کے بجائے صرف ان سات ہزار روپوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی پورے ایک مہینے کی محنت کا صلہ۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور ضرورتیں تھیں جنہیں ان سات ہزار روپوں نے پورا کرنا تھا۔

"کل سنڈے ہے ان شاء اللہ مارکیٹ کا چکر لگاؤں گی۔ یہ چپل تو آخری دموں پہ ہے۔ کسی وقت بھی دغا دے سکتی ہے۔ نئے شوز لوں گی۔ ساتھ میں کٹ پیسوں سے ایک دو سوٹ بھی۔ میرے پاس تو ڈل سوٹ ہیں۔ جن کے رنگ اور ڈیزائن نجانے کیا تھے۔ اب تو ڈھل ڈھل کر کسی بھی وقت دھجی بن سکتے ہیں۔ شیمپو بھی تو ختم ہے۔"

دل ہی دل میں شاپنگ لسٹ تیار کرتے ہوئے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے قدم سبز روغن والے لکڑی کے دروازے پہ جا کے رک گئے ہیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ صرف پٹ لگے ہوئے تھے۔ گھر میں چار سو تاریکی کا راج تھا۔

بھابھی کے کمرے سے روم کولر کا تیز شور آ رہا تھا۔ پیٹ میں چوہوں کی اچھل کود مچی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھا کچن میں چلی آئی۔ چادر اتارنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کے جونہی دیگچی میں جھانکا تو خاصی مایوسی ہوئی۔ صرف پیندے میں تھوڑی سی دال لگی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ صبح نصف دیگچی پکا کر ہی نکلی تھی۔ ہاٹ پاٹ میں بھی صرف آدھی روٹی بچی تھی۔

یہ کوئی آج نہیں، روز کا معمول تھا۔ کھانا نکالتے ہوئے بھابھی ہمیشہ اس کے وجود کو فراموش کر بیٹھتیں۔ اس کے حرف شکایت زبان پہ لانے سے قبل ہی بھیا کے سامنے الزام دھر دیتیں کہ کام سے جی چرانے کو وہ گن کے ہی روٹیاں پکاتی ہے۔ سالن بھی اتنا کہ بچوں کو پیٹ بھر کھلانے کے بعد ان کے لیے بھی نہیں بچتا اس کے لیے کہاں سے رکھتیں۔

محبوب لاڈلی بیوی جسے وہ ہزار چاؤ سے بیاہ کر لائے تھے، دن میں بھوکی رہ جائے۔ ایاز بھیا تڑپ ہی تو اٹھے۔

"اہمل! تم کم از کم چار روٹیاں اضافی بنا لو گی تو تمہاری صحت پہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سالن بھی کٹوری بھر زیادہ بنا لیا کرو۔"

بھیا کی ہدایت پہ من و عن عمل کیا۔ مگر نتیجہ توقعات کے برعکس نکلا۔

"غضب خدا کا۔ ایسا بے رحم دل ہے اس لڑکی کا تو۔ ذرا جو بھائی کی محنت کا خیال کر لے۔ ہاٹ پاٹ ہے تو آدھا روٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔ پورا ڈونگا روز ڈسٹ بن کی نذر ہوتا ہے۔ اپنا تن گھستا تو پتا چلتا۔ کوئی اندھی کمائی ہے، جو یوں لٹا رہی ہو، خبردار! کل سے ایک روٹی بھی اضافی نہ پکے۔ باسی روٹی کس کام کی۔ پورا حساب اور اندازہ رکھا کرو۔"

بھابھی کے واویلے سے گھبرا کر اس نے پہلے سے زیادہ محتاط ہو کر پورا حساب اور اندازہ لگا کر کھانا پکایا تھا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اس کے لیے سالن پیندے سے لگا ہوا ہی بچتا اور روٹی ایک آدھ۔ بھابھی کا مقصد بھیا کی نظروں میں اسے گرانا اور اس کی تذلیل کرنا تھا۔ جس سے بچنے کی خاطر وہ ان کی بے رحم فطرت کی تسکین خاموش رہ کر کیا کرتی تھی۔

کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرہ کیا تھا۔ ایک چھوٹا سا اسٹور روم جس میں ایک طرف گھر کا کاٹھ کباڑ، پرانے صندوق رکھے تھے۔ باقی جو جگہ بچی، وہاں اس نے کسی نہ کسی طرح اپنی چارپائی گھسا دی تھی۔ ساتھ میں اماں کے جہیز کی چوبی الماری جس میں اس نے اپنے گنتی کے چند جوڑے، کتابیں اور دوسری استعمال کی چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔

چارپائی پہ دراز ہوتے ہی اس کی نظر روز کی طرح الماری کے اکھڑے ہوئے پٹ پر گئی۔ چند سال قبل دائیں پٹ کو دیمک لگ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے کنڈا اکھڑنے سے پٹ لٹک گیا تھا۔ جی میں کئی بار الماری کی مرمت کا خیال، بلکہ خواہش پیدا ہوئی، لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ اسے ٹھیک نہ کرا پائی۔ تنخواہ کے پیسے ہاتھوں سے ایسے سرکتے کہ خبر ہی نہ ہوتی۔ ایک آزردہ نظر الماری پہ ڈالنے کے بعد وہ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صرف الماری پہ ہی کیا موقوف، گھر کا بیشتر سامان اماں کے جہیز پہ مشتمل تھا۔ اماں ڈپٹی کلکٹر کی بیٹی تھیں۔ ڈھیروں سامان لائیں۔ ابا بھی اعلا افسر تھے۔ معقول آمدنی۔ گھر نوع بہ نوع چیزوں سے آراستہ تھا۔

یہ ابا کی آمدن کا ہی اعجاز تو تھا کہ امل اور ایاز بھیا نے شہر کے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ اعلا پوشاکیں زیب تن کیں۔ من پسند غذا کھائی۔

پھر نجانے کس ظالم کی نظر ان کی ہنستی بستی زندگی کو لگ گئی۔ ابا دفتر گئے تو واپسی پہ ان کی لاش ایمبولینس میں آئی۔ کسی بے رحم نے اپنی گاڑی کی ٹکر سے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

اماں وابا کی باہمی محبت' ذہنی ہم آہنگی اور ایک دوجے کے لیے چاہت وارفتگی خاندان بھر میں ضرب المثل تھی۔ ابا کے جانے کے بعد اماں بھی احساس جدائی تھکیں' غم فرقت کو لوریاں دیتیں' خود بھی دو سال بعد ابا کے پہلو میں مٹی اوڑھ کر سو گئیں۔

وقت نے ایسی ظالم کروٹ لی کہ گزرے ایام صرف خواب و خیال بن کر رہ گئے۔ گھر سے خوش حالی تو ابا کے جاتے ہی رخصت ہو گئی تھی۔ محبت' سکون اور خوشیاں بھی وبے پاؤں نکل گئیں۔

ابا کی محنت' ایمان داری اور محکمے کی بے لوث خدمت کو دیکھتے ہوئے ایاز بھیا کو اسی دفتر میں درجہ دوم کی نوکری مل گئی اور امل جس نے مڈل تک شہر کے مہنگے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک سرکاری اسکول سے امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ایف اے کی تیاری گھر بیٹھ کر کرنے لگی' کیونکہ بھیا کی آمدنی کسی قسم کی عیاشی کی متحمل نہیں ہی سکتی تھی۔

یہ خیال سراسر ندرت بھابھی کا تھا۔ ورنہ گھر کے حالات تو پہلے سے بہت بہتر ہو چکے تھے۔

"گھر کے اخراجات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ تم اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات خود پوری کرنے کی کوشش کرو۔ کوئی سوئی فریم' کوئی سلائی مشین۔ خالی صورت بھی آگے نہیں چلنے کی۔"

ہر سال ایک ننھے مہمان کی آمد پہ بھابھی اس پہ چڑھ دوڑتیں۔ سلائی کڑھائی تو دور کی بات' اماں نے کبھی خود سے اٹھ کر اسے پانی بھی نہیں پینے دیا تھا۔ ہمیشہ "میری رانی' میری لاڈو" کہہ کر پکارتیں۔ ایک بار اماں کے سر میں درد کی وجہ سے اس نے انڈا ابال لیا تھا

اس پہ بھی ابا نے اماں کو بے بھاؤ کی سنا ڈالی تھیں کہ ان کی شہزادی سے تنکا دوہرا کرنے کا کام بھی نہ لیا جائے۔

زندگی تیرے رنگ ہزار۔

اب تو سارا دن کام میں جتے رہنے کے بعد چوتھے دن چولی کھول کر باتوں کو سلجھانے کا خیال اسے آتا۔ اپنی تعلیم کا بہترین مصرف اسے ٹیوشن کی صورت میں مل گیا تھا۔ سیلری کے دو تین ہزار اپنے پاس رکھنے کے بعد وہ ساری تنخواہ ندرت بھابھی کے حوالے کر دیتی۔ لیکن ان کی تیوری کے بل کبھی نہ جاتے۔ حد درجہ لالچی' حریص اور خود غرض فطرت۔ وہ دو تین ہزار بھی امل سے ہتھیا لیتیں۔ اماں کی ساری چیزیں اپنے قبضے میں لے لیں۔

برتن' کپڑے' پردے' مشینری۔ بس یہی الماری تھی جسے وہ کھینچ کھانچ کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ اپنی ماں کی یادگار نشانی اسے بڑی محبوب تھی۔ تب ہی تو اس کی مرمت کا خیال ہر وقت اس کے ذہن پر سوار رہتا۔ نیند کی گود میں سر رکھنے سے پہلے وہ ٹھان چکی تھی کہ وہ کل سب سے پہلے یہی کام کرے گی۔ مگر وائے ری قسمت! پہلے اس کی کون سی خواہش پوری ہوئی تھی' جو یہ آسانی سے ہو جاتی۔

اسی شام چائے پیتے ہوئے بھابھی نے پوچھ لیا۔

"امل! آج پانچ تاریخ ہے۔ تنخواہ نہیں ملی تمہیں؟"

"جی بھابھی! مل گئی ہے۔"

"وہی لگے بندھے سات ہزار ہوں گے۔ تم سماں سے کہتی کیوں نہیں کہ وہ تمہاری تنخواہ بڑھائے' مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے تنخواہ بڑھائی ہے۔ تم مجھے بتا نہیں رہیں۔" بھابھی کا انداز مشکوک تھا۔

نہیں بھابھی! بڑھائی تو نہیں' البتہ بڑھانے کا کہہ رہی ہیں۔ فی الحال تو یہی سات ہزار ہیں۔" خود پہ جبر کر کے وہ تحمل سے بولی۔

"اچھا خیر! جتنے بھی ہیں۔ گزارہ کر لوں گی۔ نوی' دوسرا ہفتہ ہے۔ دست اور الٹیاں چل رہی ہیں۔ بچہ

ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ کسی قابل ڈاکٹر کو دکھاتی ہوں۔ علینہ کے اسکول میں منگو پارٹی ہونے والی ہے۔ اس کا بھی پیلو سوٹ بنانا ہے۔ گھر کا ریگولیٹر بھی لینا ہے۔ کہاں سے اتنے خرچے پورے کروں میں۔" اخراجات کی ایک لمبی فہرست ان کی نوک زبان پہ ہمیشہ جاری رہا کرتی تھی۔

"بھابھی! مجھے اپنے لیے ایک دو لان کے سوٹ لینے ہیں۔ چپل بھی ٹوٹ چکی ہے۔" بے حد عاجزانہ لہجے میں ایک درخواست پنہاں تھی۔

یہ درخواست تھی یا دعوت مبارزت۔

"ہاں' ہاں' بھائی نے اپنا کلیجہ ساڑھ کے پالا پوسا۔ آج اس کی اولاد تنگی میں ہے تو مہارانی کو الٹے تللے سوجھ رہے ہیں۔ اپنا جھتا پالو۔ اوپر سے ان مفت کی جونکوں کو بھی جھیلو۔ بہنیں بھائیوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے نجانے کتنے جتن کرتی ہیں اور ایک یہ محترمہ ہیں نہیں گھر کی دال روٹی سے زیادہ اپنی خواہشات عزیز ہیں۔"

ندرت جاہلوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر اس کی ذات کے بخیے ادھیڑنے لگیں۔ رات بھیا کے آنے تک یہی واویلا جاری تھا۔

"امل! یہ ہر مہینے شور شرابا کیسا۔ تجھے کھلا سکتا ہوں تو تیرے وداع کی ذمہ داری بھی مجھ پہ ہے۔ تو کب سے کو پائی پائی جوڑ کر اپنا جہیز بنانے میں ہلکان ہو رہی ہے۔" ٹی وی میں محو ایاز بھیا کو بیوی کا شور سخت ڈسٹرب کر رہا تھا۔ جھنجلا کر ترشی سے اس سے مخاطب ہوئے۔

"جی بھیا! ٹھیک ہے۔" ایک شکوہ کناں نظر اپنے بھیا جائے پہ ڈال کے اس نے سات ہزار بھابھی کی ہتھیلی پہ رکھ دیے تھے۔ گھر میں ایک دم سکون در آیا تھا۔ بہت ناخوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

بس اس رات دیر تک اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"تت سنا ہے وہ تازگی' دلکشی اور رعنائی نظر نہیں آ رہی' جو ہم ہمیشہ سے اس حسین و جمیل مکھڑے پہ دیکھتے آ رہے ہیں۔"

آفس میں داخل ہوتے ہی سعد جوتوں سمیت گلاس ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ بے تکلفانہ حرکت ان دونوں کی گہری دوستی کی مظہر تھی۔

"بکواس مت کرو۔ میرے چہرے کے لیے یہ سارے زنانہ الفاظ رہ گئے ہیں؟ کوئی مردانہ وجاہت کو سراہنے والا لفظ نہیں ملا تمہیں؟" فرہاد مسکراہٹ دباتے ہوئے پیپرز کو ترتیب دینے لگا۔

"جی! آپ کو سراہنے' بلکہ سر چڑھانے کے لیے حسینوں' مہ جبینوں اور نازنینوں کا جم غفیر ہی کافی ہے۔ فی الحال تو میرا اشارہ اس الجھن کی طرف ہے' جو اس وقت صاف تمہارے چہرے پر نظر آ رہی ہے۔" سعد بغور اس کے چہرے کو تکتے ہوئے بولا۔

"خوب اندازہ لگایا تم نے۔ میں واقعی بہت ڈپریسڈ ہوں۔" ایک گہری سانس لے کر وہ رائٹنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر جھولنے لگا۔

"ڈپریشن کی نوعیت؟"

"یار! وہی ہر ماہ کا مسئلہ۔ گریٹی کی نرس کام چھوڑ گئی ہے۔" وہ قدرے جھنجلا کر بولا۔

"بہت خوب! یہ تو مسئلہ کشمیر سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔" سعد بے ساختہ ہنسا۔

"بی سیریس سعد! میں واقعی بہت پریشان ہوں۔ اب ایک ہفتے کے اندر ایک نئی نرس کہاں سے ڈھونڈوں۔ نیکسٹ ویک میری اپنی شکاگو کی فلائٹ ہے۔" سعد کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں؟ اب یہ نرس کس جرم کی وجہ سے اپنی روزی روٹی پہ لات مار بیٹھی؟" سعد ہنوز مسکرا رہا تھا۔

"بس یہی کہ سوتے میں خراٹے بہت زور سے لیتی تھی۔" وہ عجیب بے بسی سے بولا تو سعد قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"جو پچھلے مہینے اپنی نوکری سے برخاست کی گئی تھی غالباً" وہ جوؤں کی فیکٹری تھی۔ اور اس سے پہلے والی

کھاتی بہت زیادہ تھی۔ فرہاد! تم نے نوٹ کیا ہے گرینی جیسی ہمدرد، مہربان اور نرم دل خاتون صرف ان نرسز کے ساتھ ایسا کیوں بی ہیو کرتی ہیں؟ باقی سارے ملازمین کے ساتھ تو وہ اپنے بچوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔" سعد نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔ کچھ دیر پہلے والی شوخی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ سعد کی بات سمجھ نہیں سکا۔

"اس میں نہ سمجھنے کی کون سی بات ہے۔ وہ صرف پیار محبت اور اپنوں کی کمپنی چاہتی ہیں۔ جو یہ پیسوں کی خاطر کام کرنے والی نرسز انہیں نہیں دے پاتیں۔ انہیں من چاہی خوشیاں صرف تمہارے وجود سے ہی مل سکتی ہیں۔ اور جناب کے پاس وقت کہاں۔ ایک پاؤں نیویارک میں ہوتا ہے تو دوسرا لندن میں۔ کیا کیجیے! غم روزگار سے فرصت کیا ملے۔ یہاں تو غم جاناں بھی جی کو لگا ہوا ہے۔" سعد گہرے طنز سے بولا۔

"دس از ٹو مچ سعد! تم میری پرابلمز اچھی طرح سمجھتے ہو۔" سعد کے طنزیہ لہجے پہ وہ برا مان کر بولا۔

"میرا سارا بزنس باہر اسٹیبلش ہے۔ میں ہر دو ماہ بعد گرینی کے پاس چکر لگا تو لیتا ہوں۔" اپنی طرف سے اس نے ٹھوس توجیہہ پیش کی۔

"تم ان کی رئیل پرابلم نہیں سمجھ رہے ہو۔ بلکہ سمجھ کر بھی انجان بن رہے ہو۔ وہ احساس تنہائی کا شکار ہیں۔ ان کے دونوں گردے تقریباً" کام کرنا چھوڑ چکے ہیں۔ ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ انہیں گھر میں صرف خوشی، سکون، ہنگامہ اور رونق ہی مطلوب ہے۔ یہ ڈاکٹرز، نرسز نہیں۔ یہ ساری چیزیں انہیں تم، تمہاری بیوی اور تمہارے بچے ہی دے سکتے ہیں۔ بس اتنی سی تو ان کی خواہش ہے۔ جو تم بلین کمانے کے باوجود بھی پوری نہیں کرپارہے ہو۔" متاسفانہ انداز میں بولتے ہوئے سعد نے کافی کا گھونٹ بھرا، جو ابھی کچھ دیر پہلے یونہی رکھ گیا تھا۔ اس کا مگ ہنوز ان چھوا پڑا تھا۔ چہرے پر سخت اضطراب اور بے چارگی تھی۔

سکندر حیات اور شائلہ سکندر کے بعد اب گرینی ہی اس کا سب کچھ تھیں۔ جنہوں نے اپنی پرشفقت آغوش میں اس وقت لے لیا تھا، جب شائلہ اسے جنم دینے کے چند لمحوں بعد ہی ملک عدم روانہ ہو گئی تھیں۔

وہ ان دنوں ہارورڈ سے ایم بی اے کی تعلیم حاصل کررہا تھا، جب سکندر حیات حرکت قلب بند ہو جانے سے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اپنی محنت، ذہانت اور قابلیت سے چند سالوں میں اس نے اپنے والد کا کنسٹرکشن بزنس کئی ممالک میں پھیلا کر ممتاز کاروباری شخصیات میں اپنا نام شامل کرالیا۔ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے کے باوجود بھی بگڑے ہوئے امیر زادوں کی روش کبھی بھول کر نہ اپنائی۔

دوستوں کے حلقے میں "لیڈی کلر" کے نام سے مشہور ہونے کے باوجود کبھی اپنی دولت اور بے پناہ وجاہت سے غیر ضروری فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ اس کی قامت دل کو چھوتی۔ اس کی چال دھڑکنوں میں ہلچل مچادیتی۔ بقول سعد کے مقابل کو چت کرنے کے لیے اس کی جان لیوا مسکراہٹ ہی کافی ہے۔

بے حد ہینڈسم، اور وجیہہ فرہاد سکندر خود اس وقت چاروں شانے چت ہو گیا، جب نیوجرسی کے ایک کافی بار میں اس کی ملاقات جینفر ڈین سے ہوئی۔ گوری رنگت، گہری نیلی آنکھوں اور براؤن سلکی بالوں والی بدیسی حسینہ کے اس کو اسیر کرنے کی وجہ اس کی خوب صورتی نہیں، بلکہ حد سے بڑھی ہوئی ذہانت تھی جس نے فرہاد کو بے حد متاثر کیا تھا۔ جینفر پولیٹکس کی طالبہ تھی۔ انقلابی خیالات کی حامل، کئی ترقی پسند تنظیموں کی روح رواں بھی تھی۔

فرہاد کو اپنے کردار پر ہمیشہ ناز رہا کہ بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی۔ لیکن یہ دوستی ہمیشہ اخلاقیات و تمیز کے دائرے میں ہی رہی۔ یہ گرینی کی تربیت کا ہی اثر تھا اسی لیے تو جینی کے لیے اپنے دل میں پنپتے جذبات

اور اک ہوتے ہی اسے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ تاہم بے حد فرماں برداری اور اطاعت گزاری کے باوجود وہ گرینی کو پاکستان میں اپنی شادی سے مطلع نہیں کرپایا۔

جینی نے شادی کے وقت شرط یہی رکھی تھی کہ وہ تاحیات قیام اپنے وطن امریکا میں ہی کرے گی۔ کیونکہ پاکستان کی آب و ہوا اسے سوٹ ہی نہیں کرے گی۔ نئی نئی قربت کے خمار کے زیر اثر فرہاد نے اس کی ہر بات بخوشی مان لی تھی۔ لیکن یہ خوشی کچھ عرصے کی مہمان ہی ثابت ہوئی۔

اگر گرینی کے پاس زیادہ ٹائم بسر کرتا تو جینی فوراً" اسے اسٹیٹس آنے کا آرڈر دیتی۔ ادھر تین ماہ سے زیادہ کی غیر حاضری پہ گرینی اس کی یاد میں اتنی ملول رہا کرتیں کہ اپنی صحت خراب کر بیٹھیں۔

وہ تو عجیب مصیبت میں آن پڑا تھا۔ کبھی کبھی ان کی کھینچا تانی میں اسے یوں لگتا۔ جیسے اس کے اعصاب کام کرنا چھوڑ دیں گے۔ اس وقت بھی کنپٹیاں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے وہ سخت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ بے بسی اور بے چارگی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"دیکھو فرہاد! تم جینی کو سمجھاؤ۔ کنونس کرو۔ گرینی کی حالت ایسی نہیں کہ وہ ٹریول کر سکیں۔ تم جینی سے کہو چند سال کے لیے پاکستان آجائے۔ بہت ممکن ہے وہ گرینی کا دل جیت لے۔ اس صورت میں گرینی بھی امریکا جانے پہ رضامند ہو سکتی ہیں۔ پھر تمہارے لیے مینیج کرنا آسان ہوگا۔ مگر سب سے پہلے تمہاری وائف جینفر کا تم سے ایگری کرنا ضروری ہے۔ جسٹ کنونس ہر۔" سعد نے جینی کے متعلق اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے دوستانہ انداز میں اسے سمجھایا۔

فرہاد نے اپنی شادی سے سعد کو مطلع کیا تھا۔ سعد کو خاصی مایوسی بلکہ دکھ ہوا تھا۔ کیونکہ گرینی فرہاد کے لیے گھر کی شریف اور باکردار لڑکی کی خواہاں تھیں۔ یہ بات سعد بخوبی جانتا تھا۔ تاہم فرہاد کو بے حد خوش و سرشار دیکھ کر اپنی ناپسندیدگی چھپاتے ہوئے پرزور مبارکباد ضرور بھیج دی تھی۔ دونوں کا اسکول کے زمانے سے ساتھ تھا۔ تب ہی فرہاد اپنا ہر مسئلہ بلا جھجک سعد سے شیئر کر لیا کرتا تھا۔

سعد کا مشورہ سن کر وہ کچھ مطمئن تو ضرور ہوا تھا۔ تاہم چہرے سے مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔ غالباً" اسے جینی کے مزاج کا علم تھا۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے یہ بات سعد سے کہہ بھی دی۔

"تمہارا مشورہ اپنی جگہ درست ہے۔ مگر میں نے جینی کی اس شرط کو اول روز سے ہی مان لیا تھا کہ میں اسے پاکستان آنے پر مجبور نہیں کروں گا۔" اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

سعد کے چہرے سے تناؤ جھلکنے لگا تھا۔

"مسٹر فرہاد سکندر! بات تو آپ کی درست ہے۔ جینی کیوں اپنا مادر وطن چھوڑ کر یہاں کے گرد و غبار اور خوف و ہراس میں رچی فضا میں آکر آبسے۔ گرینی کو ہی چاہیے وہ اس عمر میں دیار وطن جاکر رہیں۔ اپنی مٹی سے محبت اپنی جگہ۔ لیکن پوتے اور اس کی بیوی کی مجبوری بھی تو دیکھنی چاہیے ناں۔" سعد گہرے طنز سے بولا۔

سعد کے طنز پر وہ کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل کی ٹون بج اٹھی۔

"ایکسکیوزمی!" کہہ کر وہ چیئر سے اٹھ کر سلائیڈ ونڈوز کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"اسٹوپڈ! ایک لڑکی کے لیے مکڑی بن کر ناچ رہا ہے۔ احمق کو اتنا اندازہ نہیں ہے جینی جیسی لڑکیاں تو کئی مل سکتی ہیں۔ مگر خلوص اور محبت سے گندھا گرینی کا وجود ایک بار کھو دیا تو تاعمر پچھتانا پڑے گا۔" کال لمبی ہو گئی تھی۔ چنانچہ سعد نے دل ہی دل میں لن ترانیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے چہرے پہ بے یقینی اور مایوسی اتنی واضح تھی کہ سارہ ایک پل کو شرمندہ ہو گئی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں اصل میں یہ ٹیوشن تمہارے لیے

بہت بڑا سہارا ہے۔ لیکن میں کیا کروں بلال بضد ہیں کہ وہ مجھے اور عطیب کو لیے بغیر شارجہ نہیں جائیں گے۔ بصورت دیگر کانٹریکٹ کینسل۔" سارہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

بلال، سارہ کے شوہر کو کمپنی ایک کانٹریکٹ کے تحت تین سال کے لیے شارجہ بھیج رہی تھی۔ بلال اپنے ساتھ اسے اور عطیب کو بھی لے جارہا تھا۔ کیونکہ بیوی بچوں کے بغیر ایک دن گزارنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ سارہ نے اسے اپنے شارجہ شفٹ ہونے کی خبر سنائی تو ایک لمحے کو وہ گم صم ہو گئی تھی۔

ہر ماہ مقررہ تنخواہ کے علاوہ سارہ اسے عید بقرعید پہ سوٹ اور عیدی کے نام پر اچھی خاصی رقم بھی دیا کرتی تھی۔

آمدنی کا اتنا اچھا وسیلہ ایک دم بند ہونے سے اس کا دل ڈوب سا گیا۔

"تم محنتی ہو۔ اکیڈمک ریکارڈ بہترین ہے۔ کسی بھی پرائیویٹ اسکول میں جاب مل سکتی ہے تمہیں۔ مایوس مت ہو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ ایک در بند ہو تو وہ کئی در کھول دیتا ہے۔" واپسی پہ سارہ نے اسے پانچ ہزار اور ایک خوب صورت ویلوٹ کا سوٹ دیا۔

وہ بوجھل دل کے ساتھ انہیں الوداع کہہ کر لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

"اللہ کتنا مہربان اور کارساز ہے۔ وہ ہماری فریاد کے بے یقین ہونے سے پہلے ہماری دعا قبول کر لیتا ہے۔" دو ہفتے قبل اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں جو الفاظ سارہ کے منہ سے سنے تھے۔ وہی الفاظ وہ انتہائی تشکر اور خوشی سے رباب کے سامنے ادا کر رہی تھی۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ رحمتِ رب کو کوئی حوالہ درکار نہیں ہوتا۔ بس ایک حیلہ مطلوب ہوتا ہے۔ خواہ روح کی بے قراری ہو یا ہاتھوں کا گدایانہ ارتعاش ہو۔" رباب نے بھرپور انداز میں اس کی تائید کی۔

سارہ کی طرف سے ٹیوشن ختم ہونے کے بعد مایوسی ناامیدی اور خود ترسی کی بگلی مارے وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی تھی۔ گھٹن اتنی زیادہ بڑھی کہ لگا کسی دم سانس رک جائے گا۔ گھر کے سارے کام نمٹانے کے بعد وہ فوراً اپنے کمرے میں آجاتی۔ اس کی واحد پناہ گاہ۔ جہاں بھابھی کے طنزیہ جملوں اور کاٹ دار نظروں سے وقتی نجات مل جاتی تھی۔

ہر ماہ اچھی خاصی رقم مل رہی تھی۔ گھر کا خرچا بڑی آسانی سے چل رہا تھا۔ ندرت پر بری طرح جھنجلاہٹ سوار تھی۔ ایمل کی صورت دیکھتے ہی پارہ ہائی ہونے لگتا جو ایک ٹیوشن ہاتھ سے جانے کے بعد مزید کوئی کوشش کیے بنا آرام سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر گھر بیٹھ گئی تھی۔

انہی بے کیف اور بوجھل دنوں میں رباب کی پیش کش نے اس کے لیے سوکھے دھانوں پہ ابر کرم کا کام کر دکھایا۔

"سچ رباب! مجھے انٹر پاس کو جاب مل سکتی ہے؟" خوشی سے کانپتے لہجے میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔ میں نے ہاشمی انکل کو تمہارا سارا بائیوڈیٹا بتایا۔ انہی کے ریفرنس سے تو مجھے بھی جاب ملی ہے۔ ورنہ آج کل رشوت کے دور میں ہم مڈل کلاس لڑکیوں کے لیے نوکری کہاں؟ ہاشمی انکل امی کے ماموں زاد بھائی ہیں۔ لیکن خیال اپنی سگی بہنوں کی طرح کرتے ہیں۔"

رباب اپنے انکل کی تعریف میں رطب اللسان تھی جن کے ریفرنس سے پہلے اسے اور اب ایمل کو مقامی فرم میں جاب مل گئی تھی۔ معقول تنخواہ، بہترین ماحول، فرم کے مالک کا قیام زیادہ تر بیرون ملک ہی تھا۔ لیکن سارے ورکرز اتنے محنتی اور فرض شناس تھے کہ سارا کام انتہائی نظم و ضبط سے چل رہا تھا۔ خاطر خواہ آمدنی نے ندرت بھابھی کے مزاج پر بھی اچھا اثر ڈالا تھا۔

ایمل اپنے رب کے ساتھ ساتھ ہاشمی انکل کی بھی بے حد شکر گزار تھی۔

☼ ☼ ☼

"اف خدایا! تمہیں تو سخت ٹمپریچر ہے ایمل!" رباب نے مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے بولی۔

"نہیں! بس تھیک ہوں۔" بھاری آواز اور سرخ تپتے ہوئے چہرے سمیت وہ ایک نظر میں سخت بیمار نظر آتی۔

"کیا خاک ٹھیک ہو۔ آج تم آفس سے آف کر لو۔ میں تمہاری بیو لے لوں گی۔" اس کے گرم ماتھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے رباب نے مشورہ دیا۔ ساتھ چادر بھی اس کے سر سے اتار لی۔

"کوئی ایسی خاص بیمار نہیں ہوں۔ موسمی فلو اور ٹمپریچر ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ آج آفس جانا ضروری ہے۔ آج سیلری ڈے ہے۔ بھابھی کئی دنوں سے پیسوں کا تقاضا کر رہی ہیں۔ گھر کا گیزر خراب ہے۔" وہ اس کے ہاتھ سے چادر لیتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"بھاڑ میں جائیں تمہاری بھابھی۔ تم نے ان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟ میرا دل چاہتا ہے تمہاری بے حس اور لالچی بھابھی کو ایسا تگنی کا ناچ نچاؤں کہ ہوش ٹھکانے آجائیں محترمہ کے۔ اس کے لیے مجھے تمہاری بھابھی کی بھابھی بننا پڑے گا۔" رباب نے غصے میں دانت پیسے۔ باوجود نقاہت کے اسے رباب کی بات پہ ہنسی آگئی۔

"خیر! یہ تمہاری حسرت، حسرت ہی رہے گی کیونکہ بھابھی کے دونوں بھائی میریڈ ہیں۔"

"ایمل! ابھی تک گھر میں ہو۔ آفس نہیں جانا کیا؟" ساتھ والے کمرے سے ندرت کی پاٹ دار آواز آئی۔

"وہ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتی بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں جانے کی۔ لیٹ جاؤ۔ پاگل ایمل! تمہاری طبیعت سخت خراب ہے۔"

رباب نے انتہائی نفرت اور غصے سے ساتھ والے کمرے کی طرف دیکھا۔ اور اس سے ملائمت اور نرمی سے بولی۔

"پلیز رباب! تم فکر مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ آج سیلری مل جائے گی تو راستے میں ڈاکٹر کو بھی دکھاتی آؤں گی۔ فی الحال تو چلنے کی کرو۔ دیکھو تو کتنی دیر ہو گئی ہے۔ کہیں بس نکل نہ جائے۔"

اس نے کچھ اس عاجزی اور لجاجت سے کہا کہ رباب گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر راستے بھر اس کی بڑبڑاہٹ رکی نہیں۔ بھابھی کو تقریباً" ہر طرح کے لقب سے پکارنے کے باوجود اسے سکون نہیں آیا تھا۔

ایمل کا بخار اب حد سے تجاوز کرتا جارہا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے ٹیبلٹ بھی لی تھی۔ تاہم کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ سرخ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ آفس آگیا۔

"حیات ایسوسی ایٹس" کی پانچ منزلہ بلڈنگ اپنے اسی طمطراق سے سامنے کھڑی تھی۔ آفس کے اندر آج غیر معمولی سی ہلچل محسوس ہوئی تھی۔

"خیریت تو ہے۔ آج کیا خاص بات ہے؟" رباب کو فکر ہوئی۔ آگے بڑھ کر نمو سے پوچھا۔

"آج فرہاد صاحب آرہے ہیں۔ وہ بھی پورے چھ ماہ بعد۔ صبح ہی صبح اطلاع ملی ہے۔" نمو نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

"اوہ! تو فرہاد صاحب آرہے ہیں۔" رباب نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ جبکہ ایمل کے ہوش اڑ گئے۔

"مگر فرہاد صاحب نے اچانک یہاں کا پروگرام کیسے بنالیا؟ پچھلی بار جب وہ پاکستان آئے تو یہاں کا وزٹ نہیں کیا تھا۔" رباب کو ابھی مزید تفصیل درکار تھی۔

"ہاں! لاسٹ ٹائم تو وہ محض دو چار روز کے لیے آئے تھے۔ مگر اس بار سنا ہے کہ ان کی گرینڈ مدر کافی بیمار ہیں۔ یا شاید یوریت سے بچنے کے لیے یہاں آرہے ہوں۔" نمو نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر ان کی اس "تفریح" میں ہمارے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔ دیکھنا! آج تو سیلری نہیں ملنے کی۔

آج تو ہاشمی صاحب کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑتی نظر آرہی ہیں۔" رباب کے تبصروں نے تو اہل کی بقیہ جان ہی نکال کے رکھ دی۔

"کیا بہت غصیلے اور تند مزاج کے آدمی ہیں فرہاد صاحب؟" وہ گھبراہٹ میں رباب اور ثمو کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"کیا تم انہیں نہیں جانتیں؟" ثمو نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"یار! یہ بے چاری نئی ہے۔ چار ماہ ہوئے ہیں اسے یہاں کام کرتے ہوئے۔ اور سر تو غالباً" چھ ماہ بعد چکر لگا رہے ہیں آفس کا۔"

رباب کی وضاحت سن کر ثمو کو اہل کے چہرے پہ صاف دکھائی دینے والی گھبراہٹ کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی۔

"سر نہ تو بلاوجہ غصہ کرتے ہیں۔ نہ کسی ورکر کی انسلٹ۔ ہاں! اصولوں کے پابند ہیں۔ نہ خود اصول توڑتے ہیں۔ نہ کسی کو توڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اپنے ورکرز پر انہیں پورا اعتماد ہے۔ اسی لیے تو سال میں ایک دو چکر لگا کر بے فکر ہو کر باہر رہتے ہیں۔ مگر ڈسپلن اور چیک اینڈ بیلنس کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے ہیں۔" ثمو کا لہجہ کسی قدر توصیفی تھا۔

"دیکھو اہل! تم ذرا خیال سے رہنا۔ جانتی ہو ناں کتنی مشکلوں اور سفارشوں کے بعد تمہیں یہ جاب ملی ہے۔ اسے گنوانا سخت نقصان دہ ہوگا۔ ہاشمی انکل کی سفارش تو کام کر گئی ہے۔ مگر اپنے پاؤں تمہیں خود جمانے ہوں گے۔" رباب نے ناصحانہ انداز میں اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" اس نے آنکھیں جھپک جھپک کے گرم سیال روکنے کی کوشش کی۔

"کچھ ایسا خاص کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ذرا ایکٹیو رہنا۔ یوں بھی تم جیسی ڈیو لڑکی کو سیکریٹری کی پوسٹ پر دیکھ کر انہیں شاید اچھا نہ لگے۔ کیونکہ یہ پوسٹ فل ٹائم ایفی شینسی کی متقاضی ہے۔" ثمو نے کڑا تبصرہ کیا۔

بخار نے کچھ کم نقاہت پیدا کی تھی۔ اس پر مستزاد یہ صورت حال۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ڈونٹ وری اہل! بی بریو۔ فرہاد سر جیسے لوگ جو ساری زندگی ابراڈ میں گزار دیں' وہ بولڈ لڑکیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ تم ذرا بہادری اور اعتماد سے کام کرنا۔" رباب اسے گرتا رہی تھی۔

سارا چکر تو اعتماد کا تھا۔ کم عمری میں والدین بچھڑ گئے۔ لاپروا بھائی' سخت گیر بھابھی' کیسی گزر رہی تھی زندگی۔ ہمیشہ احتیاط کے غلاف میں لپٹی ہوئی۔ کبھی کھل کر سانس نہ لیا۔ کبھی جی بھر کر نہ ہنسی۔ ماں باپ سر پر نہیں تھے۔ جوان جہان لڑکی۔ سو باتیں بن جائیں۔ ہوا کی آہٹ سے گھبرا کر خود میں سمٹنے والی اہل میں اگر اعتماد ہی ہوتا تو وہ چند ہزار روپوں کی نوکری کے لیے یوں آنسو بہا رہی ہوتی۔ بھابھی اور فرہاد سکندر دونوں کا خیال کسی عفریت کی طرح اس کے حواس کو جکڑے ہوئے تھا۔ اپنے کیبن میں آکر وہ کل کے بقیہ کام پورے کرنے لگی۔

ذرا دیر بعد ہی انٹرکام پہ ہاشمی صاحب نے اسے ایم۔ڈی کے آفس میں بلایا تو وہ لرزتے ہاتھوں سے ریسیور رکھنے کے بعد سر تھام کر بیٹھ گئی۔

پچھلے چار ماہ میں اس نے یہاں کا سب کام سیکھ لیا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اور اسے اس نوکری کی اشد ضرورت تھی۔ لہٰذا اس نے اپنی تمام تر صلاحیت بروئے کار لا کر ہاشمی صاحب کو مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن اب اس نئی صورت حال سے وہ سٹپٹا رہی تھی۔

کیبن سے نکلتے ہوئے وہ اپنا بخار بھول چکی تھی۔ محض اب کیا ہوگا؟ کی فکر سر پہ سوار تھی۔ کمرے کا خنک ماحول اس کے حواس کو اور بھی منجمد کیے دے رہا تھا۔

"گڈ مارننگ سر۔"

اندر داخل ہوتے ہی اس نے میکانکی انداز میں کہا۔ فرہاد سمیت ہاشمی صاحب بھی چونکے۔

"سر! یہ ہیں آپ کی نئی پی اے اہل حسن۔ پچھلے چار ماہ سے یہاں جاب کر رہی ہیں۔ اینڈ شی از اے گڈ ورکر۔"

ہاشمی صاحب کی تعریف پر اسے کچھ سکون ملا تھا۔ مگر جونہی نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے ایم۔ڈی کو دیکھا۔ سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔ فرہاد بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہیو آسیٹ مس۔۔۔ اہل۔۔۔"

اس کے گھبرائے ہوئے انداز پر اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"کیا کوالیفکیشن ہے آپ کی؟"

بیٹھتے ہی سوال ہوا تھا۔ اس نے کچھ تفکر سے ہاشمی صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ مگر اس کی یہ حرکت فرہاد کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔

"جی۔۔۔ ایف۔۔۔ اے۔۔۔"

"واٹ۔۔۔؟" جانے وہ حیران ہوا تھا یا غصہ۔ وہ اپنی جگہ کانپ سی گئی۔ آنکھوں میں نمی جمع ہونا شروع ہو گئی تھی۔

"سر! یہ بہت ہارڈ ورکنگ لڑکی ہے۔ میں نے ان کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے انہیں جاب دی ہے۔ تعلیم کم ضرور ہے۔ مگر یہ بہت ذہین ہے۔۔۔ اور آگے بھی تعلیم کنٹی نیو کرے گی۔"

ہاشمی صاحب نے فرہاد کے تیور دیکھے تو جلدی سے بولے۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ فرہاد بہت تند اور تیکھے تیوروں سمیت ہاشمی صاحب کو سن رہا تھا۔

"بٹ ہاشمی صاحب! دس از مائی آفس۔ یہ کوئی فلاحی ادارہ یا این۔جی او نہیں ہے۔ یو مسٹ کنسیڈر دا رولز۔" (آپ کو قوانین سمجھنے چاہئیں۔)

ان کے خاموش ہونے پر وہ سخت لہجے میں بولا اور پھر اس کی طرف مڑا۔

"لسن مس اہل! ہمارے یہاں اس پوسٹ کے لیے کم از کم گریجویٹ ہونا لازمی ہے۔ آپ کی اتنی کم تعلیم پر یہی ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو کہیں اور ایڈجسٹ کر دیں۔ سو میک اپ یور مائنڈ۔"

"پلیز سر! آپ میرا کام تو دیکھیں۔ ایم شیور آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔" کم آمیز تو وہ سدا کی تھی۔ لیکن اسے لگا اس وقت کی خاموشی بڑے گھاٹے سے دوچار کر دے گی۔

فرہاد کو قدرے حیرانی ہوئی۔ غالباً" اس کے بولنے کی امید نہیں تھی۔ اب کے بغور اسے دیکھا۔

سیدھی مانگ والی سیاہ سی چٹیا بنائے جو اس کی کمر سے نیچے جھول رہی تھی۔ آف وہائٹ اور ریڈ کاٹن کے پرنٹڈ سوٹ پہ دوپٹا سلیقے سے شانوں پہ جمائے وہ بے حد کنفیوز لگ رہی تھی۔ چہرے پہ نقاہت کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ انٹر کے حساب سے عمر بھی اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ تھی۔

"ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ "آپ کو کیا لگتا ہے' خود کو منوا سکیں گی؟" گہری سنجیدہ نظریں اسے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ نروس سی ہو گئی۔

"آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ سر!" مرتعش سا لہجہ غنائیہ تھا۔

فرہاد نے گہری سانس لی۔

"او کے اگلے ایک ہفتے تک میں آپ کو ٹرائل پر رکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد کا فیصلہ آپ کے ٹیلنٹ کی بنیاد پر ہوگا۔ ناؤ یو مے گو۔"

"جی سر۔۔۔" اسے لگا جیسے سات دنوں کی مہلت نہیں' بلکہ ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ خوشی کے بے پایاں احساس کو چھپاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاہم اس کی کرسٹل گرے آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"تھینک یو سر! آپ نے ایک ضرورت مند لڑکی کا خیال رکھا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے جاب دی ہے کہ یہاں کا ماحول اچھا ہے۔ نجانے اسے کہیں اور کیسا ماحول میسر آئے۔ ایسے معصوم وجود مٹی میں رل جائیں تو معاشرے کا اجتماعی نقصان ہے۔" ہاشمی صاحب بے حد شفقت سے اس کا ذکر کر رہے تھے۔

فرہاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاشمی صاحب اس کے والد سکندر حیات کے سیکریٹری' بلکہ قابل اعتماد دوست بھی رہے تھے۔ وہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ جتنا بھی جونیئر اسٹاف تھا' وہ ہاشمی صاحب ہی کا تعینات کردہ

تھا۔ وہ ان پر مکمل بھروسا کرتا تھا تب ہی تو ور کرز کی بھی چھان بین نہیں کی۔ ایمل بھی ان ہی کے ریفرنس سے آئی تھی۔ محض ابرار ہاشمی کے احترام کی وجہ سے وہ ایمل کو صاف جواب دیتے دیتے رہ گیا۔ لیکن اسے ایمل کی بھی کسی چیز نے متاثر کیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس کی کم تعلیم کو نظر انداز کر گیا تھا۔ مگر کس چیز نے۔۔۔؟ فرہاد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر زیدی کے بہترین علاج کے پیش نظر گرینی اگلے ہفتے ہی گھر آگئیں۔ تاہم اس مرتبہ کمزوری اس قدر بڑھی کہ ڈاکٹر نے بے حد احتیاط کی تاکید کی تھی۔

گو کہ جینی کی ناراضی کا خیال اغلب تھا، مگر گرینی کی صحت کے پیش نظر اس نے واپسی کا پروگرام مؤخر کر دیا تھا۔ گرینی کے لیے دوسری تجربہ کار نرس رکھ دی گئی تھی۔ پھر بھی اسے ان کی طرف سے فکر لگی رہتی۔

"کیسی ہیں گرینی؟" وہ چینج کیے بغیر ان کے کمرے میں چلا آیا اور گرینی کی تو جیسے جان تھی اس میں۔ اسے دیکھ کر نقاہت کے باوجود مسکرا دیں۔ محبت سے بولیں۔

"ٹھیک ہوں بیٹا! تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں۔"

"آج کا دن کیسا گزرا؟"

"بس! ٹھیک گزرا۔ تم آتے ہو تو تمہارے انتظار میں دن گزر تو جاتا ہے۔ ہاں! جب چلے جاتے ہو تو دن نہیں کٹتے' ہفتے نہیں گزرتے' مہینے سالوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ خالی گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔" گرینی کا لہجہ یاسیت زدہ تھا۔ موضوع ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ نظریں چرا کر رہ گیا۔

"خالی گھر کہاں سے ہوا؟ یہ اتنے سارے سرونٹ جو ہیں۔" جھکی نظریں' دھیما انداز' گرینی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر سنجیدگی سے بولیں۔

"دیکھو بیٹا! میں پچیس برس کی ہی تھی' جب تمہارے گرینڈ پا مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اگر شمائلہ اور سکندر۔۔۔ اور پھر تمہارا وجود نہ ہوتا تو میری سانسوں کی ڈور کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔ تنہائی سے میرا بہت پرانا ساتھ ہے۔ میری پکی سہیلی ہے۔ اکیلے پن سے میں کبھی نہیں گھبرائی۔ مجھے صرف تمہارا خیال ہے۔ نوکری کاروبار تو سب لوگ کرتے ہیں۔ مگر کس لیے؟ گھر بسانے کے لیے نا؟ گھر تب ہی بستا ہے' جب گھر والی آتی ہے۔ پھر بال بچے ہو جاتے ہیں۔ تو زندگی ان ہی رشتوں سے عبارت ہے۔"

گرینی اپنے پسندیدہ موضوع پہ آچکی تھیں۔ بلکہ جب بھی وہ کمپنی دینے کی غرض سے ان کے کمرے میں آتا وہ یہی موضوع لے بیٹھتیں۔ اب بھی انہوں نے بہت واضح الفاظ میں گھیر لیا تھا اسے۔

"اتنی بڑی دنیا ہے۔ تم ملکوں ملکوں گھومے ہو۔ کیا کوئی ایک لڑکی نہیں ملی جو ہمارے خاندانی وقار اور تمہاری پسند کے مطابق ہو؟" اسے خاموش پا کر گرینی نے استفسار کیا۔ وہ گہری سانس لے کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ملی تو ہے گرینی' میری پسند' میری محبت۔ مگر یہ خاندان اور اس کی ویلیوز!" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ان کی طرف مڑا۔

"آپ کے سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے گرینی!" وہ دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ چہرے سے پریشانی اور پشیمانی جھلک رہی تھی۔ گرینی نے شفقت سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"تو پھر سارا معاملہ مجھ پہ چھوڑ دو۔ بہت اچھے گھرانوں کی لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں میں نے' شریف' خوبصورت' باکردار۔۔۔"

"او کم آن گرینی! آپ "لڑکیاں" دیکھ رہی ہیں' فی الحال تو مجھے ایک "لڑکی" بھی قبول نہیں ہے۔" کچھ دیر پہلے چھائی ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنے کے لیے اس نے شگفتگی سے مسکرا کر کہا۔

"کیسے قبول نہیں۔ جب شیروانی پہن کر' منہ پہ سہرا ڈالو گے تو قاضی صاحب خود تم سے "قبول ہے' قبول ہے" کہلوا لیں گے۔" گرینی بذلہ سنجی سے بولیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

پھر باتوں کا رخ خاندانی رشتوں' میل ملاپ کی طرف مڑ گیا تھا۔ تاہم اس روز اس پہ گرینی نے یہ ضرور واضح کر دیا تھا کہ وہ اس کی شادی کے لیے بے حد سنجیدہ ہیں اور اب اس کی کسی لیت و لعل کو خاطر میں نہیں لائیں گی۔ ایسے میں صرف سعد کا کندھا ایسا تھا۔ جس پہ سر ٹکا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ویری ویری گڈ۔ اب یہ بتاؤ! تم شادی کب کر رہے ہو؟" پوری بات سن کر سعد نے مزے سے پوچھا۔ فرہاد کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"بی سیریس یار! آئی ایم رئیلی ٹینس۔ میں نے تمہیں مذاق کے لیے نہیں بلایا۔"

"اوہ! میں تو سمجھ رہا تھا موصوف نے چھوہارے کھلانے کے لیے یاد فرمایا ہے۔" سعد نے مصنوعی تاسف سے سر ہلایا۔ تاہم خود پہ فرہاد کی غصیلی نظر جمی پا کے فوراً" سنجیدہ ہو گیا۔

"دیکھو فرہاد! ہمارے بزرگوں کا واحد اثاثہ ہم ہی ہیں۔ وہ اگر ہمیں محفوظ و مامون دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو یہ ان کا حق اور ہمارا فرض ہے۔ انکل کی ڈیتھ کے بعد گرینی کا واحد خواب تم ہو۔ تمہاری خوشی' تمہاری شادی' تمہاری اولاد' تمہاری بیوی ان کی تمام تر سوچ ان ہی چار چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔"

"مگر میری بھی تو کوئی سوچ' کوئی لائف ہے سعدی؟" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ سعد نے بھنویں اچکاتے ہوئے قصداً" خفگی کا تاثر دیا۔

"اگر تمہاری مراد جینی سے ہے تو معاف کرنا! جس عورت نے تمہاری خاطر اپنا لائف اسٹائل تک چینج نہ کیا ہو۔ مذہب اور سوچ تو دور کی بات ہے۔ میں اسے گرینی جیسی محبت کرنے والی ہستی سے کمپیئر نہیں کر سکتا۔ اٹ از موسٹ ان فیئر۔"

"سعد پلیز! میں نے تمہیں یہاں جینی کی برائیاں بیان کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ جسٹ ٹیل می' میں گرینی کو راضی کیسے کروں؟"

"تو پھر یہاں شادی کر لو۔" سعد ایک دم بولا۔

"یو مسٹ بی جوکنگ۔" خفگی لہجے پہ غالب آئی تھی۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں آل ریڈی میرڈ ہوں۔ اول تو کوئی مجھے اپنی بیٹی دے گا نہیں۔ دوسرے میں بھی اس کے لیے راضی نہیں ہوں۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"راضی تو تمہیں ہونا ہی پڑے گا۔ کیونکہ میں تمہیں گرینی کی صحت کے ساتھ کھیلنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ سیکنڈلی رہ گئی لڑکی دینے کی بات تو تم جیسے ویل آف اور ویل ایجوکیٹڈ بندے کو بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟" سعد نے اطمینان سے جواب دیا تو وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھور کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پہ ہونے والی دستک نے توجہ مبذول کرالی۔

"یس! کم ان۔"

اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے لگ بھگ آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ فرہاد نے ایک ماہ کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے مستقل ہونے کی نوید بھی سنادی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی فطری گھبراہٹ پہ قابو نہ پا سکی تھی۔

"وہ سر! یہ آپ نے فائل منگوائی تھی۔" فرہاد کی تیکھی سخت نظروں سے گھبرا کر وہ بمشکل بولی۔ سعد پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

"تھینکس! یہاں رکھ دیں۔ اور ہاں مس ایمل! دو کافی کا آرڈر کر دیں اور کسی کو اندر نہ بھیجے گا۔ الس آ پرسنل میٹنگ۔ او کے! یو مے گو ناؤ۔"

"آپ کی تعریف؟" سعد نے اس کے جاتے ہی سوال کیا۔

"پی اے ہے میری۔" وہ بے زار سا ہو رہا تھا۔

"واقعی؟! ان بلیو ایبل۔۔۔"

"ہاں! ہاشمی صاحب نے بس کرٹسی میں آ کر رکھ لیا۔ جسٹ ٹیل می کیا یہ لڑکی اس قابل ہے کہ اسے پی

اسے بنایا جائے۔" سعد کے اظہار حیرت پہ وہ بگڑتے ہوئے بولا۔

"نہیں! ایسی لڑکی واقعی اس سیٹ کے لیے موزوں نہیں۔ اسے تو چراغ خانہ بننا چاہیے۔ کافی ینگ اور انوسنٹ ہے۔ یہ لعل و گوہر ضائع کرنے کے لیے نہیں بلکہ مخمل میں لپیٹ کر محفوظ مقام پر رکھنے کے قابل ہے۔ بائی دا وے کیا میرڈ ہے؟"

توصیفی لہجے میں بولتے ہوئے سعد نے استفسار کیا۔ چہرے پہ اچانک کسی گہری سوچ کا تاثر در آیا تھا۔

"کم آن۔ تمہیں یہ میرڈ لگتی ہے؟ ہارڈلی ٹین ایجر ہے۔ اسکول گوئنگ بچوں جیسی تو شکل ہے۔ ذرا سا سخت لہجے میں پکار لو یا تیکھی نظروں سے دیکھ لو تو ملٹ ہونے پر تل جاتی ہیں میڈم۔"

فرہاد نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

"ہوں۔ گویا اچھی لگی تمہیں۔" سعد کا انداز سرسری تھا مگر بات گہری تھی۔ فرہاد کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ گھور کر اسے دیکھا۔

"واٹ ڈو یو مین اچھی لگی۔ شی از مائی پی اے۔" وہ "پی اے" پہ خاصا زور دے کر بولا۔

"اور پی اے کا مطلب ہے پرسنل اسسٹنٹ۔"

"سو واٹ! بیوی سے زیادہ پرسنل اسسٹنٹ کون ہو سکتا ہے۔" سعد کی طرف سے اطمینان بھرا جواب موصول ہوا۔ فرہاد بری طرح بدکا۔

"سعد! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ میں تمہیں۔۔۔"

"پلیز فرہاد! پہلے میری بات سکون اور اطمینان سے سن لو۔ میں نے پہلے بھی تم سے کچھ نہیں چھپایا تھا لیکن ایک بات میں کئی دنوں سے بتانا چاہ رہا ہوں۔"

"کون سی بات؟" سعد کے گہرے سنجیدہ انداز پہ وہ ایک دم ٹھٹکا تھا۔

"ڈاکٹر زیدی نے مجھے کال کی تھی۔ گرینی کی رپورٹس آ گئی ہیں۔ گرینی کی کنڈیشن بہت سیریس ہے۔ پچھلے بائی پاس کے باوجود ان کو اکثر انجائنا اسٹروک ہو جاتا ہے۔"

"سعد! تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔" وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔ وہ حقیقتاً" شدید دکھ محسوس کر رہا تھا۔ جن سے محبت ہوتی ہے۔ ان کے بچھڑنے کا خیال ہی سوہان روح ہوتا ہے۔

"اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم ان کی کوئی بات نہ ٹالو۔ خوشی بیماری کا سب سے اچھا توڑ ہے۔ تنہائی ڈپریشن کی جڑ ہے۔ یہ لڑکی تمہاری پی اے مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ سادہ اور گھریلو سی۔ اگر تمہاری بیوی بنی تو یقیناً" گرینی کی بہتر دیکھ بھال کر سکے گی۔ تم با آسانی اسٹیٹس کے چکر لگا سکو گے۔"

فرہاد کے چہرے پہ قائل ہونے کا تاثر دیکھ کر سعد نے آخری ضرب لگائی۔ اسی دوران کافی آ گئی۔ اس کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیں اتنی واضح تھیں کہ سعد نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ جانا۔

☼ ☼ ☼

راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اپنی گہری نظریں اس کے سراپے پہ ٹکا دیں۔ جسے سعد نے ایک نظر میں ہی پسند کر لیا تھا۔

روٹین کے سادے حلیے میں اس کی سرمئی آنکھیں گھنی پلکوں کی باڑ سمیت جھکی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں نوٹ بک تھامے وہ حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ کمر پر جھولتی بالوں کی چٹیا اور چہرے کے اطراف ہالہ بنائے خوبصورت لٹیں۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی خاصی دلکش لگ رہی تھی۔ زیور کے نام پہ کانوں میں چھوٹی چھوٹی سی بالیاں تھیں۔

اس کی نظروں کا ارتکاز اہمل کو نروس کر گیا تھا۔ گھبرائے گھبرائے انداز میں اس نے دوپٹا شانوں پر پھیلایا تو کبھی ہونٹ کاٹے۔ "یا اللہ! یہ آج سر کی نظریں پولی گراف مشین کی طرح میرا جائزہ کیوں لے رہی ہیں؟"

"ہیو آ سیٹ مس حسن۔" وہ بیٹھ گئی۔

"میں آپ کی پرفارمنس سے مطمئن ہوں لیکن اسٹارٹ میں میں نے آپ سے بات کی تھی کہ آپ اس پوسٹ کی اہل نہیں ہیں۔ ممکن ہوا تو آپ کو نہیں

اور ایڈجسٹ کیا جائے گا۔ سو اب آپ کو یہ سیٹ چھوڑنی ہوگی۔"
ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا۔ ایمل کی تو روح کھنچنے لگی تھی۔ وہ لمحہ آگیا بالآخر جس کا اسے ڈر تھا۔
"آپ کو نرسنگ آتی ہے مس حسن!"
یہ کیسا سوال ہوا۔ وہ ناسمجھی سے فرہاد کو دیکھنے لگی۔
"آئی تھنک آتی ہوگی۔ ہر فیمیل میں محبت' خدمت اور ہمدردی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ میری گرینی ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ ان کی دیکھ بھال' ڈائٹ وغیرہ کا خیال رکھنا' گھر سنبھالنا۔ کیا آپ یہ کرسکیں گی؟ آئی مین میرے گھر جاکر؟" اسے بغور دیکھتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔ جس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔
"لیکن سر! مجھے آپ کے گھر جاکر کام کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ یوں بھی میں نے یہ ملازمت اس لیے جوائن نہیں کی کہ کسی کے گھر میں۔۔۔"
"کیئر ٹیکر کی ملازمت کروں۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ۔" اس کے اٹک اٹک کر بولے گئے جملے کو اس نے روانی اور اعتماد سے پورا کردیا۔ ایمل خاموش رہی۔
"دیکھیے مس حسن! دنیا میں انسان دو طرح کے کام کرتا ہے۔ بعض مرتبہ فنانشل سیکورٹی کے لیے تو کبھی پرسنل سیکیورٹی کے لیے۔ اینڈ آئی تھنک آپ کو ہر دو طرف سے اس کی ضرورت ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اس پروپوزل پر غور کریں؟"
بات اس نے ایسی کہی تھی کہ وہ چونک گئی۔ بھلا یہ کیسے جانتا ہے کہ اسے ذات کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ تحیر اور استعجاب سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا جو بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر لبوں سے لگا چکا تھا۔
"رہ گئی اجازت کی بات تو اس کے لیے میں کاغذی کارروائی کرنے کو تیار ہوں۔"
"کاغذی کارروائی۔۔۔ کیا مطلب؟"
وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ فرہاد سکندر کے لبوں پہ بے اختیار ایک تبسم آیا تھا۔
"میں سمجھ نہیں پارہا مس ایمل! آپ کو انوسنٹ کہا جائے یا نوش۔ میرا خیال تھا جتنے کلیئر انداز میں میں نے آپ سے بات کی ہے۔ آپ یقیناً سمجھ گئی ہوں گی۔ ان فیکٹ میں آپ کو پروپوز کررہا ہوں۔ ول یو میری می؟"
وہ میز کی طرف قدرے جھکتے ہوئے بڑے سادہ اور روز مرہ والے لہجے میں بولا تھا۔
"جی؟" وہ بھونچکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

گرینی کو مٹھی میں لینا سعد کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ فرہاد کی پیش قدمی کے بارے میں جان کر اس نے مناسب لفظوں میں ایمل کا تعارف گرینی سے کرایا تھا۔
"لڑکی مڈل کلاس ہے۔ والدین انتقال کرچکے ہیں۔ اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ رہتی ہے۔ پارٹیشن سے قبل ان کا خاندان اچھے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔"
"ہاں بیٹا! زمانہ بھی کسی کا رہا ہے۔ بہرحال مجھے لڑکی کی سیرت سے مطلب ہے' مالی حالت سے نہیں۔ کس چیز کی کمی ہے آخر۔"
گرینی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ منٹ کے ہزارویں حصے میں ایمل کو دیکھنے چل دیں۔ فرہاد شادی کے لیے مان گیا تھا۔ یہ خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ جسم و جاں میں ایک دم تازگی سی در آئی تھی۔ سعد حمیرا بھابھی کے ہمراہ انہیں ایمل کو دکھانے لے گیا۔ حمیرا بھابھی سعد کے بڑے بھائی اسد کی بیوی تھیں۔ بے حد خوش مزاج اور ملنسار حمیرا بھابھی کی گرینی سے بہت بنتی تھی۔
ایمل دو دنوں سے آفس نہیں آرہی تھی۔ فرہاد اس غیر حاضری کی وجہ خوب جانتا تھا۔ ان سب کو گئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ وقت گزاری کے لیے اس نے ٹی وی آن کرلیا۔ تاہم سوچ کا پنچھی جو ہانسبرگ کی طرف

محو پرواز تھا' جہاں جینی اپنی دوستوں کے ہمراہ چھٹیاں منانے گئی ہوئی تھی۔
"نجانے مجھے یاد کررہی ہوگی یا اپنی دوستوں میں بزی ہوگی؟" سوچ کا دائرہ پھیلتا جارہا تھا کہ اس کی سوچوں کے ارتکاز کو ان سب کی واپسی نے توڑ ڈالا۔
"خیریت؟ کیا رہا؟"
سعد سب سے پہلے اندر آیا تھا۔
"وہی جس کی امید تھی' ایمل کی بھابھی اتنے ویل آف لوگوں کو دیکھ کر فوراً "رشتہ" منظور ہوگئیں۔" سعد صوفے پر گرتے ہوئے بولا۔
"آئی سی! اور گرینی کو کیسی لگی؟" اسے قدرے اطمینان ہوا۔
"بہت اچھی' البتہ وہ اس کی کم عمری سے خائف تھیں۔ یہ ایج ڈفرنس کہیں بعد میں کامپلیکس پیدا نہ کروے۔ کچھ مزاج کے تضاد نے بھی انہیں فکر میں ڈال دیا ہے۔" سعد نے ریموٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"مزاج کا تضاد۔۔۔ واٹ ڈو یو مین؟" وہ بھنویں اچکا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"بھئی تم ٹھہرے آتشیں مزاج کے حامل اور وہ بے چاری معصوم لڑکی۔ تمہاری ایک گھوری کئی پاؤ خون خشک کرکے رکھ دے گی اس کا۔ ڈنک لہجہ' ماتھے پہ ان گنت تیوریاں۔۔۔ وہ بے چاری جان سے نہ چلی جائے کہیں۔" سعد کا لہجہ سراسر شرارتی تھا۔
"سعدی! یو۔۔۔" وہ مکا تان کر سعد کی طرف بڑھا جبکہ ہونٹوں پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھائی کے لیے محض پیسہ اہم ہے۔ رشتے' ناطے' خاندان' یہ کچھ معنی نہیں رکھتے ان کے نزدیک۔ صرف یہ دیکھتے ہیں' مزاج' طبیعت' کردار کچھ بھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ بس جھٹ سے ہاں کہہ دی۔ بھلا میں کیا بوجھ بن گئی ہوں۔ اور بھیا کو دیکھو! انہوں نے بھی بھابھی کی باتوں میں آکر فیصلہ سنا دیا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔
"کم آن ایمل! یوں رو دھو کر تم کفران نعمت کی مرتکب ہورہی ہو۔ سچ انسانوی ٹوئسٹ آیا ہے تمہاری زندگی میں۔ دن رات مصلے پہ بیٹھ کے شکرانے کے نوافل ادا کرو۔" رباب نے خلوص سے مشورہ دیا۔
"مذاق مت کرو رباب! جس شخص نے پی اے کی پوسٹ کے لیے مجھے ایک نظر میں ریجکٹ کردیا تھا وہ بیوی کے اہم ترین عہدے پہ کیسے فائز کرسکتا ہے۔"
دوپٹے سے ناک پونچھتے ہوئے وہ بھاری آواز میں بولی۔ جس میں کئی اندیشے چھپے تھے۔
"کم آن یار تمہاری بھولی بھالی صورت پہ دل آگیا ہوگا۔ بس اب تم یوں کرو کہ اپنے پندرہ سولہ سال عمر رسیدہ شخص کو مٹھی میں قابو کرنے کے سارے گر سیکھ لو۔ تم جیسی حسین اور کم عمر بیویاں تو شوہروں کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔ ڈیڑھ ہزار گز کا محل نما گھر' نوکروں کی فوج' پورچ میں کھڑی گاڑیوں کا تو شمار ہی نہیں۔ کم عقل لڑکی! تمہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے تھکنا نہیں چاہیے۔ ایک لڑکی کی اس کے سوا اور کیا چاہ ہوتی ہے؟"
رباب اس کے خوش آئند مستقبل کا خاکہ کھینچ رہی تھی۔ آنسوؤں کی برسات تھم چکی تھی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی' تاہم دل میں یک گونہ سکون اتر آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شادی سے تین دن پہلے مہندی کی رسم فرہاد نے ہٹ دھرمی دکھا کر روک دی تھی۔ لہٰذا محض نکاح کی تاریخ مقرر کردی گئی۔
حمیرا بھابھی اسے شہر کے بہترین بیوٹی پارلر میں لے گئی تھیں۔ گہرے سرخ بھاری لہنگے میں ملبوس کئی کلو کے حساب سے گرینی کے بیش بہا خاندانی زیورات سے آراستہ جب وہ حمیرا بھابھی اور رباب کی ہمراہی

میں میرج ہال میں پہنچی تو پھر سچ مچ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ماہر مشاطہ نے اس کے روپ کو یوں اجاگر کیا کہ ہر شخص مبہوت رہ گیا۔ گرینی تو اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ تاہم سیاہ تھری پیس سوٹ میں فرہاد نے اتنی سنجیدہ اور سرسری سی نظر ڈالی تھی اس پر۔

"لگتا ہے ساری کسر گھر جا کر نکالیں گے' ایک نظر بھی نہیں ڈال رہے' چلو اچھا ہے' ورنہ نظر ہٹانا محال ہو جاتا۔" حمیرا بھابھی نے اس کی بے توجہی فوراً" نوٹ کر کے چوٹ کی۔ وہ محض مسکرا دیا' جبکہ ساتھ بیٹھے نازک وجود میں ارمانوں کی ہلچل مچ گئی تھی۔

ایک طویل فوٹو سیشن کے بعد کھانا کھل گیا تھا۔

کیسی گھڑی آئی ہے
ملن ہے ، جدائی ہے

آبدیدہ سے بھیا نے جب اس کے سر پر وقت وداع ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ بھابھی نے بھی کھینچ کر گلے لگا لیا۔ ندرت بھابھی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اسے اپنے سارے دکھ اور غم بھول گئے تھے۔ ساری شکایتیں' گلفتیں اور شکوے کہیں دور جا چھپے۔ بچھڑ جانے کا خیال سب احساسات پہ حاوی تھا۔

"بہت نازک ہے تمہاری وائف فرہاد! اس کا بہت خیال رکھنا۔" حمیرا نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے فرہاد کو مخاطب کیا۔

"جی بھابھی! آئی نو ویری ویل کہ آبگینے ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں۔" اس نے پیچھے مڑے بغیر سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ڈونٹ وری بھابھی! میرا فرینڈ اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا بخوبی جانتا ہے۔" احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سعد نے شگفتگی سے ہانک لگائی تھی۔ گرینی مسکرانے لگیں۔

"ہاں مگر حفاظت ہی کریں' کہیں اس کانچ کی گڑیا کو اپنے آہنی وجود سے گزند نہ پہنچا دیں۔" حمیرا بھابھی نے ہنستے ہوئے خدشے کا اظہار کیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اہمل نے سہم کر حمیرا بھابھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لو جی۔ تم تو ابھی سے ٹھنڈی پڑ گئی ہو۔ ارے فرہاد سکندر کی مسز بنی ہو' دل گردہ مضبوط کر لو' ہمارے دیور جی کسی کرنل جنرل سے کم نہیں ہیں۔" انہیں ایک اور موقع ملا چھیڑنے کا۔

"یو از موسٹ ان فیئر بھابھی! آپ کو اس وقت میری تعریفیں کرنی چاہئیں۔ الٹا میری وائف کو مجھ سے ڈرا رہی ہیں۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"نہ بابا نہ! مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔" انہوں نے برجستگی سے جواب دیا تھا۔ ذرا دیر کے لیے کار کی فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔ ایسے ہی ہنسی مذاق کرتے وہ حیات ولا پہنچ گئے' جہاں اس کے استقبال کو گرینی نے خاص انتظامات کرا رکھے تھے۔

روشنی اور نور کے قمقموں سے جگمگاتا حیات ولا سیاہ آسمان پر سفید چاند کی مانند نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی' خوشی ہی خوشی تھی۔ ڈیڑھ ہزار گز پر پھیلا حیات ولا اندر سے اس قدر پر شکوہ تھا کہ وہ ٹھٹک سی گئی۔ کسی خواب کا سا گمان ہو رہا تھا اسے ہر شے پر۔

حمیرا بھابھی کچھ رسمیں ادا کرنا چاہ رہی تھیں۔ مگر فرہاد کسی رسم کا حصہ بننے کے لیے تیار نہ تھا۔

"پلیز بھابھی! آئی ایم سو ٹائرڈ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز اتنا سنجیدہ تھا کہ سب ہی چپ رہ گئے۔ تاہم اہمل کو جلد ہی بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔

وہ ڈریسنگ روم سے کپڑے تبدیل کر کے نکلا تو حمیرا بھابھی اسے بیڈ پر بٹھا رہی تھیں۔ جھک کر اس کے کان میں دبی دبی مسکراہٹ سے نہ جانے کیا کہا کہ وہ گھبرا کر ان کا ہاتھ تھام گئی۔

"چلو اب اطمینان سے بیٹھو۔ تمہارے مجازی خدا آ گئے ہیں میں چلتی ہوں۔"

"پلیز بھابھی۔" اہمل کے لب ہلے تھے۔ سراسیمگی اور گھبراہٹ کا عالم جدا تھا۔ حمیرا بے اختیار ہنس پڑیں۔

"کم آن اہمل! وہ غصہ ور ضرور ہے' مگر جلاد نہیں اور آج تم اتنی توبہ شکن لگ رہی ہو کہ ان کی ساری

گرم مزاجی ہوا نہ ہو جائے تو کہنا۔"

فرہاد ان کی سرگوشی سن رہا تھا۔ تاہم قصداً" انجان بنا رہا۔ پھر بھی اہمل سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش جب ناکام ہو گئی تو حمیرا نے متبسم انداز میں مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے اشارہ کیا' گویا کہہ رہی ہوں۔

"دیکھ لو اپنی دلہن کو' پھر ہم سے نہ کہنا۔" فرہاد کے چہرے پہ یکدم تناؤ آ گیا۔

"اہمل! بھابھی کو جانے دیں' انہیں آرام کرنا ہے' رات بہت ہو گئی ہے۔"

بظاہر لہجہ بہت نرم تھا' مگر اس میں چھپی سختی ایسی تھی کہ اہمل کا پورا وجود ٹھنڈا پڑ گیا۔ حمیرا معنی خیزی سے مسکرائیں اور دروازے کی طرف چل پڑیں۔

فرہاد دروازہ بند کر کے جوں ہی مڑا تو نظر سیدھی اس پہ پڑی۔ قدم بے اختیار اس کی جانب بڑھے۔ اس نے گھونگھٹ پیچھے سرکایا۔ واقعی اس کا حسن ہوش ربا اور معصومیت توبہ شکن تھی۔ آتش میں سادگی سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس اہمل حسن آج سراپا بجلی بچانے میں نہیں آ رہی تھی۔

فرہاد سکندر کے لیے نظر چرانا مشکل ہو گیا تھا۔ دل و دماغ پر بس ایک ہی کیفیت احساس بن کر چھا گئی کہ سامنے بیٹھا سجا سنورا وجود بس اس کا ہے۔ پور پور اس کے لیے سجا ہے۔ ایک جیتے جاگتے وجود پہ ملکیت کا احساس نشہ بن کر رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ استحقاق و ملکیت نے اسے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیا۔ بہت نرمی سے اس نے اہمل کا مرتعش وجود سمیٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح اس کی آنکھ دروازے پہ ہونے والی دستک پہ کھلی تھی۔ وال کلاک کی طرف نظر گئی۔ صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

فرہاد سکندر اپنا بازو آنکھوں پر رکھے بہت اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس کی نظر اس پہ ٹھہری گئی۔ پچھلے چند ماہ میں اس نے کبھی اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار یہ جسارت کر رہی تھی۔ پہلے کبھی اس کے غصے نے ہمت ہی نہیں دی۔ اسی اثنا میں دروازے پہ دوبارہ دستک ہوئی۔ سر پہ دوپٹا ڈال کے دروازہ کھولا تو سامنے حمیرا کھڑی تھیں۔

"اہمل! تمہاری بھابھی اور رباب وغیرہ آئے ہیں ناشتا لے کے۔ تم اور فرہاد جلدی سے نیچے آ جاؤ۔" حمیرا کہہ کر پلٹ گئیں۔ فرہاد ہنوز سو رہا تھا۔ اسے اٹھانا بھی ایک مرحلہ تھا۔ ہمت تو آخر کرنی تھی۔ بازو دھیرے سے ہلا کر جگانے کی کوشش کی۔

"اٹھ جائیے۔ سر!" مخاطب کرنے کے لیے کچھ اور نہ ملا تو سر ہی کہہ ڈالا۔

"کیا بات ہے' اتنی جلدی کیوں اٹھایا ہے؟" گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے وہ سخت ناگواری سے بولا تھا۔ اہمل کا دل دوبارہ سہم گیا۔

"وہ۔ بھابھی آئی تھیں۔" اس نے گھبرا کر وضاحت دی تو وہ جمائیاں لیتا واش روم میں گھس گیا۔

"پتا نہیں پوری زندگی اس شخص کے ساتھ کیسے گزرے گی۔ جس کے ساتھ ایک ایک لمحہ سہم سہم کر گزرتا ہے۔" گلابی سوٹ میں ملبوس گیلے بالوں کو سلجھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ حمیرا بھابھی چلی آئیں۔

آج وہ خاصی شوخ ہو رہی تھیں۔ وہ جھینپتے ہوئے ان کی ہدایتوں کے مطابق تیار ہوئی۔ کام دار فراک پاجامے میں اس کا پورا وجود جگمگا اٹھا۔ حمیرا بھابھی باہر نکلیں تو وہ جھک کر نازک سینڈل کا اسٹرپ باندھنے لگی۔ اسی لمحے فرہاد تولیے سے سر رگڑتا باہر نکلا۔ اس پہ نظر پڑی تو تھم سا گیا۔ وہ اسٹرپ باندھ کر سیدھی ہوئی تو اسے سامنے پا کر بے اوسان ہو گئی۔ بڑی گہری نظریں اس کا حصار کر چکی تھیں۔

"یہ کپڑے آپ کے لیے بھابھی نے۔"

وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی کہ اپنے شانوں پہ اس کے مضبوط ہاتھوں کا وزن محسوس کر کے بالکل چپ سی ہو گئی' بیڈ پہ رکھے سوٹ کی طرف اشارہ کرتا ہاتھ بھی

ڈھلک گیا۔ فرہاد کی مالکانہ حقوق لیے نظریں اس کا چہرہ جھلسائے دے رہی تھیں۔

"کپڑے انسان کا حسن نہیں 'بلکہ انسان کپڑے کی ویلیو بڑھاتا ہے۔ جیسے تم نے ان کپڑوں کا وقار بڑھایا ہے۔" وہ اس کے بندے کو چھیڑتا ہوا بولا تو وہ شرمگیں انداز میں مسکرا دی۔

"اہمل!" کچھ سوچ کے اس نے بے اختیار سنجیدگی سے اسے پکارا۔

"جی سر۔" دوسری طرف بھی ایسی ہی بے ساختگی تھی۔ فرہاد چونکا۔ وہ بھی یک دم ہونٹ بھینچ گئی تھی۔

"ناؤ آئی ایم یور ہسبینڈ یو کین کال می فرہاد۔"

اس کی یہ سادہ سی ادا فرہاد کو ڈگمگا سی گئی تھی۔ وہ اس کا رخسار ہولے سے تھپکا کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف چل دیا۔ اسی لمحے فون کی بیل گنگنا اٹھی۔ وہ مڑی 'فون نزدیک تھا' اس لیے اس نے آگے بڑھ کر اٹھالیا۔

"ہیلو۔ وئیر از فرہاد۔" دوسری طرف سے نسوانی آواز اور انگریزی لہجہ سن کر وہ ٹھٹک سی گئی۔

"کیو ہم دار ریسیور۔" اس کے یوں خاموش ہونے پہ باقاعدہ ڈپٹ کر کہا گیا۔

"کون ہے اہمل!" فرہاد کا برش کرتا ہاتھ رکا۔ وہ اس کی طرف مڑا۔ دوسری طرف جس استحقاق سے پوچھا گیا تھا' وہ نروس سی ہوگئی تھی۔ ایک بار پھر سر کہہ نئی مگر فرہاد خطرے کی گھنٹی محسوس کرتا تیزی سے آگے آیا تھا' فوراً" ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ہیلو جینی! اٹس یو؟"

فرہاد نے اسے جس لب و لہجے سے پکارا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ دونوں کے درمیان گہری آشنائی ہے۔ فرہاد نے اسے دیکھا اور باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ دل پہ بوجھ لیے باہر نکل گئی۔ جینی کے پاس فرہاد کا سیل نمبر تو تھا ہی' لیکن وہ بوقت ضرورت لینڈ لائن بھی استعمال کرلیا کرتی تھی۔ وہ باہر نکل تو گئی' مگر دل اندر چھوڑ گئی تھی۔ اس نے دھیرے سے دروازہ بھیڑ دیا۔ ادھر سے جنیفر گرج چمک کے ساتھ خوب برس رہی تھی کہ

پچھلے ایک ماہ سے نہ تو اس نے خود فون کیا اور نہ ہی اس کی کال ریسیو کی۔

"اینڈ ہو واز ریسیونگ دا فون؟ گرل از شی یور میڈ سرونٹ؟" اس کے بہانوں کو رتی برابر خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ رعونت سے پوچھنے لگی' تو وہ "میڈ سرونٹ" کے لفظ پر اٹک سا گیا پھر اگلا ایک گھنٹہ جینی کو منانے اپنے دیجکوں کا احوال سنانے میں گزر گیا مگر ادھر ہنوز ناراضی برقرار تھی۔ وہ اسے اسی ہفتے واپس آنے پر زور دیتی رہی۔ بالآخر معاملہ دس دن پہ ٹھہرا۔

"اوکے۔ مگر دس دن کا مطلب دس دن ہوتا ہے' ایک گھنٹہ بھی زیادہ نہیں۔"

بحث و تمحیص کے بعد اسے دھمکی دے کر فون بند ہو گیا تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"خیریت۔ یہ چہرے پہ بارہ کس خوشی میں بج رہے ہیں۔ کہیں سے بھی نئے نویلے دولہے نہیں لگ رہے ہو؟" سعد نے شگفتگی سے چھیڑا تو وہ انگلی سے ماتھا مسلتے ہوئے بولا۔

"پلیز سعدی! اٹس آ ہارڈ ٹائم فور می۔ مذاق کا موڈ نہیں ہے میرا۔"

"آئی ایم ٹو سیریس فرہاد! مسئلہ کیا ہے۔" سعد حد درجے سنجیدہ ہو گیا تھا۔ فرہاد کا بگڑا ہوا موڈ اسے کسی سنگین صورت حال کا پیش خیمہ لگا تھا۔

"تتھنک اسپیشل' مجھے نیویارک جانا ہے' وہ بھی اسی ہفتے۔" وہ بے حد اکھڑا ہوا لگ رہا تھا۔ سعد کی بھنویں تن گئیں۔

"جنیفر نے یاد فرمایا ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے' مجھے جانا تو ہے ہی' واپسی تو کرنی ہی ہے۔"

"تم واپس آئے ہو فرہاد! مائنڈ یو تم یہاں سے گئے تھے۔ سو واپسی کا سفر تو اس طرف کرنا ہوگا۔" سعد کا انداز جتاتا ہوا تھا۔ وہ تلملا تا اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے لفظوں میں مت الجھاؤ' جینی کو میری

ضرورت ہے۔ وہ میرے بغیر اکیلی ہو گئی ہے بٹی از مائی وائف۔"

"پلیز فرہاد! اگر تو دی پوائنٹ 'وہ تمہارے بغیر اکیلی نہیں ہے' بلکہ تمہیں ڈر ہے کہ کہیں وہ دوبارہ اپنی سابقہ زندگی میں نہ چلی جائے اور تم اکیلے رہ جاؤ۔" سعد کا لہجہ طنزیہ تھا۔ وہ سر تاپا جھلس گیا۔

"اوکس انف سعدی! میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ جسٹ ٹیل می کیا میں گرینی کو اہمل کی کسٹڈی میں چھوڑ کر جاؤں؟" وہ ہاتھ اٹھا کر آہنی لہجے میں بولا تو سعد لمبی سانس لے کر رہ گیا۔

"ضرور جاؤ' اہمل میری ججمنٹ کے مطابق بہت نائس لڑکی ہے۔ ہمدرد اور رشتوں کا خیال کرنے والی' جب وہ اپنی لالچی بھابھی کی خدمت کر سکتی ہے تو گرینی کی کیوں نہیں۔" سعد کا لہجہ سرد تھا۔ حقیقتاً" اسے فرہاد کے رویے سے دکھ ہو رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے اہمل مجھے کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ انسانوں کی اتنی پرکھ ہے مجھے۔" وہ "مجھے" پر بالخصوص زور دے کر بولا۔ فرہاد کچھ نرم پڑ گیا۔

"اٹس جسٹ چیٹنگ۔ تم نے خود کہا تھا اہمل سے شادی کے بعد میں اپنی سابقہ زندگی فری ہو کر کنٹی نیو کر سکتا ہوں۔ اہمل میرے پیروں کی زنجیر کبھی نہیں بنے گی۔ اسے صرف میں نے گرینی کی خاطر اپنایا ہے' ورنہ فیملی تو میں آل ریڈی بنا چکا تھا۔"

"بہت خود غرض ہو تم فرہاد سکندر۔" سعد تاسف سے بولا۔ "ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ ہو گئی۔ وہ معذب ہو کر رہ جائے گی' لیکن تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" سعد چیخ گیا تھا۔ جس پر وہ بری طرح مشتعل ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے! اب میں سمجھا تم نے مجھے ٹریپ کیا تھا۔ رشتوں کی نازک ڈور میں الجھا کر قید کرنا چاہا ہے۔ مسٹر سعد 'سن! مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا' تین بولوں کا جو رشتہ جوڑا ہے' میں اسے تین لفظوں میں جھٹکے سے توڑ بھی سکتا ہوں۔ جینی مائی فرسٹ لو اور مسز فرہاد ہے' تم نے اہمل سے میرا رشتہ جوڑا ہے' دل نہیں۔"

زہریلے سفاک لہجے میں بولتے ہوئے اس نے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تو جیسے لمحے بھر کے لیے گرم خون کی گردش رک سی گئی تھی۔

سامنے ہی وہ کھڑی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ پکڑ اس طرح تھام رکھی تھی جیسے ابھی گر پڑے گی۔ اس کی چمک دار آنکھوں کے ستارے بجھ چکے تھے۔ آنسو بنا آواز کے اس کے رخساروں پہ پھیلے جا رہے تھے۔ شاکی نظروں میں کئی شکوے مچل رہے تھے۔

وہ لب بھینچے ایک طرف ہو کر نکلتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

سارے ارمان کانچ کی کرچیوں کی صورت بکھر گئے تھے۔ پورا وجود زخمی زخمی ہو رہا تھا۔ کل تک وہ کتنی خوش تھی۔ زندگی اور تقدیر سے سارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ ابھی تو وہ اپنی خوش بختی پر پوری طرح نازاں بھی نہ ہو پائی تھی کہ کسی نے کانٹوں کے بستر پر گھسیٹ ڈالا۔

جینی کے فون اور لہجے پہ وہ ٹھٹکی ضرور تھی مگر بات اتنی سنگین ہو گی' اسے اندازہ نہ تھا دل لہولہو ہو رہا تھا' اشک تیزی سے رواں تھے۔ اچانک حمیرا بھابھی اندر چلی آئیں۔

"ارے یہ کیا' خیریت ہے نا؟" اسے روتے دیکھ کر وہ فوراً" آگے بڑھیں۔

"کسی نے کچھ کہہ تو نہیں دیا؟" وہ اس کا سر اٹھا کر پوچھ رہی تھیں۔ وہ اپنا غم بھول کر سٹپٹا گئی۔ اسے حمیرا سے کچھ کہنا چاہیے یا نہیں' اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

کیا پتا حمیرا بھابھی بے خبر ہوں۔" اس کے دل نے صلاح دی تھی۔

"نہیں بھابھی! بس ویسے ہی بابا اور اماں یاد آگئے تھے۔" آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ حمیرا کا دل پسیج گیا۔

"یہ تو نیچرل سی بات ہے' آج کے دن میکے والے یاد آتے ہیں' لیکن ہم سب بھی تو تمہارے اپنے ہیں۔

"گرینی تو بے حد لونگ اور کیئرنگ ہیں' تمہیں اپنے پیرنٹس کی کمی محسوس نہ ہونے دیں گی۔" وہ اسے بہلا رہی تھیں۔

"چلو آؤ' تمہیں اپنے کمرے میں چھوڑ آؤں' رو رو کر اپنا حشر کرلیا' کتنی محنت سے تیار کیا تھا میں نے۔ لو جی سنبھالو اپنی مسز کو' حیرت ہے آج کے دن بھی تمہارے ہوتے ہوئے اسے رونے کی فرصت مل گئی۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی حمیرا بھابھی نے باآواز بلند کہا تو وہ چونکا۔ اس پہ نظر پڑی تو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پہ رونے کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

"آج کا دن ہی ایسا ہوتا ہے' والدین یاد آجاتے ہیں۔" حمیرا نے اس کی آنکھوں میں استفسار پا کے وضاحت دی' پھر اہمل کو صوفے پہ بٹھا کے باہر چلی گئیں۔ فرہاد کافی دیر تک سگریٹ پھونکتا رہا۔ وہ نظروں کے حصار میں تھی۔

کریم کلر کے نیٹ کے کامدار کرتے اور دوپٹے کے ساتھ جامہ وار کا پرپل چوڑی دار پاجامہ' میک اپ اور جیولری سے مبرا چہرہ ضبط گریہ کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر ان کے درمیان خاموشی کلام کرتی رہی۔

"اہمل!" لہجے میں بلا کی نرمی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی۔ لب بستہ تھے۔ ایسی زخمی نگاہ تھی کہ فرہاد سکندر کا موم کے جیسا دل محسوس کیے بنا رہ نہ پایا۔

"پلیز یہاں آؤ۔" فرہاد نے اسے پکارا تو با دل نخواستہ اٹھنا ہی پڑا۔ صوفے سے بیڈ تک کا دو قدم کا فاصلہ طے کرنا بھی محال ہو رہا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ بائنتی پہ بہت تکلف سے ٹک گئی۔

"دیکھو اہمل! جو کچھ سنا جائے' ضروری نہیں کہ حقیقت ہو۔" اس کا جملہ ایسا تھا کہ اس نے جھٹکے سے جھکا سر اٹھایا۔ ویسی ہی ساحرانہ آنکھیں اور ویسا ہی اس کا زخمی فسوں۔

"آئی مین' یہ سچ ہے' میں نے تمہیں لائف پارٹنر سعد کے کہنے پر ہی سلیکٹ کیا اور یہ بھی سچ ہے جیسی میری پہلی بیوی ہے اور۔ پیار بھی۔" اس نے ہونٹ یوں کاٹے کہ خون چھلک آیا۔

فرہاد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے اپنی طرف کھینچا تو وہ میکانکی انداز میں کھنچی چلی آئی۔

"تم میری وائف ہو' میں بہت ریسپیکٹ کرتا ہوں تمہاری۔ یہ گھر تمہارا' گھر کی ہر چیز کی تم اونر ہو' گرینی بہت لونگ ہیں۔ آئی ہوپ! تم ان کو ایسے ہی ریٹرن کرو گی' کیونکہ تم محبت کرنے اور محبت کروانے کے لائق ہو۔"

وہ اپنا مضبوط بازو اس کے گرد حائل کیے بڑے نرم اور میٹھے لہجے میں بول رہا تھا۔ اہمل کا دل قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ خود کو فرہاد کے حوالے کرتے ہوئے اس نے کرب سے آنکھیں موندلی تھیں۔

اسے رشتے صلیب کی مانند کندھوں پہ اٹھانے تھے۔ شاید یہی اس کا مقدر تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر یوں لگا جیسے وقت رک گیا ہو۔ دن رات کا سیل رواں منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ ہر شے پر اداسی چھائی تھی۔ ایسے میں گرینی کی محبت اور ہر دم خیال رکھنے والی عادت نے اسے اس بے حسی اور خود فراموشی سے باہر نکالا۔

گرینی نے اس کی بے توجہی اور بے دلی نوٹ کر کے وجہ استفسار کی تو وہ چونک اٹھی۔

"گرینی کا خیال رکھنا' مجھے تم پہ ٹرسٹ ہے۔" پاس ہی ایک سرگوشی سنائی دی تھی۔ وہ سنبھل کے بولی۔

"کچھ نہیں گرینی! بس ایسے ہی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا۔"

"دل لگے بھی تو کیسے' فرہاد کو دیکھو! ابھی شادی کو ایک ہفتہ ہوا ہے اور وہ باہر چل دیا۔ کم از کم ایک ماہ تو دلہن کی سنگت میں گزارتا' گھومتا پھرتا' دعوتیں۔

گرینی اس کی توجیہہ کو اپنے انداز میں مفہوم پہناتے ہوئے ہنس کر بولیں تو وہ محض سر جھکا کر رہ گئی۔ گرینی واقعی محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ فرہاد نے انجانے میں ہی سہی اس پہ احسان کر دیا تھا۔

وہ مقدور بھر ان کا خیال رکھتی۔ ہمہ وقت ان کی کمپنی میں رہتی۔ وقت پہ کھانا، دوا، ورزش، البتہ خود سے بے نیاز رہتی، گرینی ٹوکتیں تو کپڑے بدل لیتی۔ زیور کے نام پر گرینی کے اصرار پر اس نے گولڈ کی چین، کانوں میں ٹاپس، کلائیوں میں طلائی چوڑیاں اور ناک میں ہیرے کی لونگ ڈال لی۔ اگر فرہاد کی محبت کے چند سکے ہی اس کی جھولی میں ہوتے تو اسے ان گہنوں کی قدر و قیمت صحیح معنوں میں ہوتی مگر جب وہ ہی نہیں تو سب کچھ بے کار لگتا تھا۔

نہیں دیکھنے والا جب کوئی
کھل جاؤ تو کیا، گہناؤ تو کیا

گرینی سمجھ رہی تھیں کہ اسے کون سا غم کھائے جا رہا ہے وہ کس لیے بولائی بولائی پھرتی ہے۔ فون کی ہر بیل اسے کیوں چونکا دیتی ہے۔ پورا مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ فرہاد نے گرینی سے تین بار رابطہ کیا، مگر جب وہ اہمل سے بات کروانے کا کہتیں تو وہ وقت کی قلت کا کہہ کر لائن کاٹ دیتا۔

اسے بخوبی علم تھا کہ وہ گرینی کا کتنا خیال رکھ رہی ہے۔ ہر کال پہ گرینی اس کے گن جو گا رہی ہوتیں۔

☼ ☼ ☼

اور ایک رات وہ اچانک چلا آیا تھا۔

آج اہمل کا برتھ ڈے تھا۔ رباب کا صبح فون آیا تھا۔ وہ ٹریٹ کا مطالبہ کر رہی تھی، ساتھ فرہاد سے ملنے والے گفٹ کو دیکھنے پر بھی اصرار کر رہی تھی، اب وہ اسے کیا بتاتی کہ ان کے درمیان گفٹ لینے اور دینے والا تعلق بنا ہی نہیں۔ اس رات گرینی کو دودھ پلا کر، کمبل اوڑھا کر وہ اپنے کمرے میں شادی کا البم کھول کر بیٹھ گئی۔

آنسو بنا آواز کے اس کے رخساروں پر پھیلنے لگے تھے۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

جس لمحے فرہاد ماسٹر کی سے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ سامنے جہازی سائز بیڈ پہ تصویریں پھیلائے وہ سوتے ہوئے کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔

وہ کچھ ٹھٹک سا گیا۔ شادی والے دن کی تصویر جسے سعد نے بڑی کروا کے اس کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دی تھی، اس کے بازو پہ دھری تھی۔ اے سی کی خنکی نے اس کے آنسوؤں کو منجمد کر دیا تھا۔

بے ساختہ اس کے لب بھینچ گئے تھے۔ تصویریں بہت کچھ باور کروا رہی تھیں۔ ایک نوبیاہتا لڑکی اور اس کے فطری جذبے کچلے جا رہے تھے۔

وہ خاموش سا اسے دیکھے گیا۔ کوئی فسوں تھا اس کے سراپے میں۔ ریشمی بالوں کا آبشار بیڈ سے نیچے گر رہا تھا۔ اس نے جھک کر اس کے بال ٹھیک کیے۔ بالوں کی نرماہٹیں اس کے پوروں میں اتر گئی تھیں۔ صبح بے حد خوش گوار ثابت ہوئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اپنے پہلو میں اسے جاگتے دیکھ کر وہ بے ساختہ ٹھٹک گئی۔

"آپ۔" یوں لگا جیسے وہ ابھی بھی نیند میں ہو۔

"کیسی ہو؟" فرہاد نے گمبھیر آواز میں ذرا سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کب آئے۔" فرہاد نے اس کی متحیر آنکھوں میں دیکھا، جہاں رات کی کارگزاری صاف نظر آ رہی تھی۔

"جب تم نے مجھے یاد کیا۔" نہ جانے کیسے اس کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا تھا اور وہ جو اسے اپنے اتنا سامنے پا کر حواس کھو رہی تھی، اسی بے ساختگی سے بولی۔

"میں تو آپ کو ہر وقت یاد کرتی ہوں بلکہ۔" جواباً" فرہاد کی مونچھوں تلے بھینچے ہوئے لبوں پہ مسکراہٹ پھیلی تو معاً" اسے اپنی بے اختیاری کا ادراک ہوا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" اس نے کہہ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر یک دم اس کی

نازک کلائی فرہاد کی گرفت میں آ گئی۔

"فی الحال چائے کی ضرورت نہیں، یہیں رہو۔ تم سے بات کرنی ہے۔"

لہجے میں نرماہٹیں جھلک آئی تھیں۔ وہ سراپا جیسے ان دیکھی آنچ میں جھلسنے لگی تھی۔ شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر وہی دھوکا دینے والا، جال بچھا کر شکار کو پھنسانے والا انداز۔ اسے لگا فرہاد کی گرفت اس کی کلائی سمیت اس کے سارے وجود کو جھلسا رہی ہے۔ جب یہاں تھا تو کسی چیز کی طرح برتا، چلا گیا تو پلٹ کر حال تک نہ پوچھا۔ محسوس ہو جانے والے انداز میں اس نے ہاتھ کھینچا تو فرہاد کی گرفت سخت ہو گئی۔ ناگواری کاٹ دار نظر اس پہ ڈالی، جس نے اسے سہما کر رکھ دیا تھا۔ فطری طور پر وہ بزدل تھی۔ وہ اس کے پہلو سے اٹھ نہ سکی۔

"گرینی بالکل ٹھیک ہیں، میں نے آپ کی ہدایت پر پورا عمل کیا۔ ان کے بی پی کا ریکارڈ فائل میں لکھ کر رکھا ہے۔ لا کر دکھاؤں؟"

اس کے پوچھنے سے پہلے ہی وہ کسی معمول کی طرح بول پڑی۔

ریشمی بال، سبز کاٹن کے سوٹ میں ملبوس، سر جھکائے، چہرے سے چھلکتا گلابی پن، فرہاد کی انگلیاں بے ساختہ اس کے سلکی بالوں میں جا ٹھہریں۔ وہ کسی طور نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں تھی، فرہاد پہلے ہی مرحلے میں ہار گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

راکنگ چیئر پہ آنکھیں موندے جھولتے ہوئے اس کی سوچوں کی پرواز جینی اور اہمل کے درمیان ڈول رہی تھی۔ جس میں اہمل کی چوڑیوں کی کھنک بار بار مداخلت کر رہی تھی۔

وہ شاید بیڈ کور ٹھیک کر رہی تھی۔ مسلسل اس کی کھن کھن کے باعث اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بے حد سادہ سی چٹیا بنائے سرخ و سیاہ لینن کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ روٹین کے حلیے میں تھی۔ اس پہ گہری نظر ڈالتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر اس نے گرینی کی پسند کردہ کسی ہائی کلاس فیملی کی لڑکی سے شادی کی ہوتی تو اسے اتنی سہولت اور آسانی ہرگز نہ ملتی، جتنی اہمل کے ہونے سے مل رہی تھی۔

رشتوں کو نبھانے اور بنا غرض کے اپنا فرض نبھائے جانے کا ظرف فرہاد نے صرف اس میں دیکھا تھا۔

سعد کا چناؤ کتنا درست تھا مگر اس لڑکی کو دیکھ کے اس کے اندر احساس جرم کروٹ لینے لگتا۔ خود سے شرم آنے لگتی۔ ایسی حساس اور جذبوں سے بھرپور لڑکی یوں ضائع کرنے کے لیے تو نہ بنی تھی۔ اس کا ذہن اسے کچوکے لگاتا۔ دل الگ دہائیاں دیتا، جس میں جینی کا عکس بسا تھا۔ جب تک وہ امریکا میں رہا اسے اس "احساس جرم" سے نجات ملی رہی مگر یہاں آ کر پھر سے ضمیر جاگنے لگا تھا۔

فرہاد کی نظروں کا ارتکاز اسے متوجہ کر ہی گیا۔ بے ساختہ اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ چائے پئیں گے؟" یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔ سخت نروس ہوتے ہوئے وہ اس طرح اس کی توجہ خود سے ہٹانے کی کوشش کیا کرتی۔ فرہاد کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مدھم سی مسکراہٹ آ رکی۔

"ہوں، لے آؤ۔" ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس نے جواب دیا۔ اہمل نے فرار ہونے میں قطعاً" دیر نہیں کی۔ یوں بھی فرہاد کو اس کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی۔

دس منٹ بعد جب وہ چائے کا کپ تھامے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو فرہاد بیڈ پہ نیم دراز موبائل پہ مصروف تھا۔ لبوں پہ مبہم مسکراہٹ اور گھور سیاہ آنکھوں کی چمک واضح باور کرا رہی تھی کہ سندیسے کس ہستی کو بھیجے جا رہے ہیں۔

اہمل کے دل پہ گھونسا سا آ لگا۔

"یہ چائے۔" نرم مگر سپاٹ لہجے آواز میں اس نے کپ بڑھایا۔

"کپ یہاں رکھ دو اور میرا سر دبا دو۔ سخت درد ہو رہا ہے۔" موبائل سائیڈ پہ رکھ کر عام انداز میں کہتے

ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"آپ ٹیبلٹ لے لیں نا۔" انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے آسان حل پیش کیا۔ درحقیقت اس کے حکم کی تعمیل کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔

فرہاد نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر ایک ناگوار نظر اس پہ ڈالی۔

"میرا وجود اتنا برا لگنے لگا ہے کہ سر دبانے کی روادار نہیں ہو۔" تلخ لہجہ' تیز نگاہیں۔ وہ اندر تک سہم گئی' جھٹ کانپتی ہوئی موی انگلیاں اس کی پیشانی پہ رکھ دیں۔ ایک ٹھنڈک سی اس کی رگوں میں اتری تھی۔ فرہاد نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی' جو اس وقت اس کی ہراساں صورت دیکھ کر بکھر جانے کو مچل گئی تھی اور پھر یہ اس کی ذہنی و جسمانی تھکان کا نتیجہ تھا یا ایمل کی مسیحائی کے لمس کا اثر' وہ دس منٹ میں گہری نیند سو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ بھی نہیں کہ ساتھ ہے میرے وہ ہم نفس
یہ بھی غلط ہے مجھ سے جدا ہو گیا وہ شخص

نیویارک سے آنے والی کالز کا تانتا بندھ گیا تو بالآخر اس نے رخت سفر باندھ ہی لیا۔

گرینی کو بہت دکھ ہوا تھا اس کے جانے کا۔ بالخصوص ایمل کو ساتھ نہ لے جانے کا مگر ایمل نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ وہ دونوں گرینی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جائیں گے۔ وہ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ پتا نہیں گرینی اس کے بہلاوے میں آئی تھیں یا نہیں۔ تاہم انہوں نے اسے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ جس نے فرہاد سے بڑھ کر ان کی خدمت کی تھی۔

اور ان ہی بے کیف' بے حد بوجھل دنوں میں جب وہ اس ستم گر کی بے اعتنائیوں اور جفاؤں پہ ماتم زدہ صورت بنائے پھر رہی تھی تو ڈاکٹر رابعہ نے اسے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی۔ کتنی ہی دیر تو وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"کم آن مسز فرہاد! اٹس ریئلی ٹرو۔" ڈاکٹر رابعہ نے اس کی حالت پہ مسکراتے ہوئے اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے وجود میں ایک نئے وجود کی کونپل پھوٹ پڑی ہے۔ گرینی کی خوشی کا تو عالم ہی جدا تھا۔ اس پر مسرت گھڑیوں کا انھوں نے برسوں انتظار کیا تھا۔

ایمل کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا' جب اس نے خود کو مکمل محسوس کیا۔ بے حد توانا اور مضبوط' ممتا کا فطری جذبہ اس کی زندگی کی اساس بن گیا تھا۔ ایسے میں فرہاد کا خیال ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔ جانے وہ کہاں تھا؟ وہ اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی اور دیکھنا چاہتی تھی کہ اتنی بڑی خبر پہ اس کا رد عمل کیسا ہوگا۔ کیا وہ بھی کئی دنوں تک اس کی طرح بے یقینی کی کیفیت میں رہے گا۔

معلوم نہیں کیوں محبت کرنے والے اپنے محبوب کے ہرجائی پن اور جفا جو رویے کو بھول کر اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ بے حد خوش تھی' ڈاکٹر نے اسے کئی ہدایات دی تھیں۔

فرہاد کا موبائل نمبر بند تھا۔ آفس والے نمبر پہ کوئی ریسیو کرتا تو میسج چھوڑ دیا جاتا۔ انتظار کی صلیب اس کے کندھوں پہ رکھی ہوئی تھی۔ پھر ایک دن فرہاد کا خود ہی فون آگیا۔ گرینی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"میری تو خیر تمہیں پروا نہیں' اپنی بیوی کو بھی فون نہیں کیا' حد ہوتی ہے لاپروائی اور بے گانگی کی بھی۔" وہ سخت خفا تھیں۔

ادھر سے وہی تاویلیں' عذر' مجبوریاں' بزنس' بزنس' بزنس' جنیفر کا نام تک نہ لیا۔ ایمل جانتی تھی وہ گرینی کے سامنے کبھی بھول کر بھی اپنی بدلسی بیوی کا نام نہیں لے سکتا۔ گرینی کا حد درجہ لاڈلا سہی پر ان کے کچھ ذاتی اصول بھی تھے' جن سے وہ انحراف کر بیٹھا تھا۔

"نرالا بزنس تم کر بیٹھے ہو' حالانکہ تمہارے باپ' دادا نے بھی یہی کاروبار بڑی خوش اسلوبی چلایا تھا۔ ساتھ میں بیوی بچوں کو بھی ٹائم دیا۔ تم آج کی نسل کے لوگ' خانگی زندگی کی نزاکتوں کو کیا جانو۔ فرہاد! تم باپ

بننے والے ہو۔ اپنی فیملی مکمل کرنے والے ہو۔" وانٹ ڈپٹ کو مؤخر کرتے ہوئے گرینی نے خوشی کی خبر کھنک دار لہجے میں اس کے گوش گزار کر ہی دی۔

"وانٹ گرینی! آر یو سیریس؟" بے تحاشا خوشی سے اس کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔ ساتھ بیٹھی ایمل نے تشکر سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کتنی دیر وہ بے یقینی کا اظہار کرتا رہا اور گرینی ہنس ہنس کر اسے یقین دلاتی رہیں۔

"اچھا لو اب ایمل سے بات کرو۔" گرینی اسے ریسیور تھما کر خود اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"ہیلو!" اس کی غنائیہ آواز گونجی تو فرہاد سکندر حیات کو اس کے لہجے میں چھپی بے تابی بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ خود کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی آنکھیں اور اس کا لہجہ اس کے دل کا حال بیان کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھتے۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں۔" دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دے' جیسے کٹی پتنگ ہوتی ہے یا خزاں رسیدہ پتا' ویسا ہی میرا بھی حال ہے مگر ہونٹوں پہ قفل ڈال لیے۔

"آئی ایم آل رائٹ۔ مجھے یقین نہیں آرہا گرینی سچ کہہ رہی ہیں' کیا یہ سچ ہے ایمل؟" وہ اب تک بے یقین تھا۔ تاہم لہجے میں کوئی خاص مسرت نہ تھی۔ اس کے جذبے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اس نے ست لہجے میں جواب دیا۔

"جی ہاں۔"

"بٹ یو آر ٹو ینگ ایمل! ابھی تمہارے لیے آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ کیا تم ایسے بچے کی ذمہ داری اٹھاؤ گی جس کا کوئی ...."

بے اختیار فرہاد کے لبوں سے سچ نکل گیا۔ یہ ادھورا جملہ اپنے اندر بہت معنی رکھتا تھا۔ ایمل کے خون کی روانی جیسے مدھم ہو گئی۔ یہ فرہاد نے کیا کہہ دیا تھا۔ اتنا شدید جھٹکا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گم صم ہو کر رہ گئی۔

"آئی مین ایمل! کیا۔" فرہاد اس کی طرف سے ایک دم خاموشی پہ نرمی سے بولا۔

"پلیز اور کچھ مت کہیے گا۔" یکدم اس نے تیزی سے بات کاٹ دی تھی۔ فرہاد یک لخت لب بھینچ گیا۔ جسم میں اتنی ناتوانی در آئی کہ ریسیور خود بخود ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جھولنے لگا تھا۔ بے اختیار گھٹنوں پہ سر ٹکا کر اس نے سسکیوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ تو آج آخری امید کا چراغ بھی گل ہوا۔ ہر طرف جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔

فرہاد نے کوئی خنجر جیسے دستے تک اس کے قلب میں اتار دیا تھا۔ اس کی انا' خودداری' وفا اور ضبط کا سرعام قتل ہوا تھا۔ آنکھیں لہو نہ روتیں تو اور کیا کرتیں۔

کتنی ہی دیر وہ گھٹی گھٹی آواز میں سسکتی رہی۔ مگر اگلے ہی پل وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر بہت سارے دن اسی طرح گزر گئے۔ فرہاد کا فون لینڈ لائن پہ آتا تو گرینی ریسیو کر لیتیں مگر جب ایمل کے نمبر پر کال کرتا تو وہ کاٹ دیتی —— دکھ ایسا تھا کہ باوجود خواہش کے وہ ضبط نہیں کر پا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غذا' دوا اور گرینی کی سخت دیکھ بھال کے باوجود وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر رابعہ نے وجہ ڈپریشن بتائی تو گرینی نے اسے کھری کھری سنا کر فوراً "آنے کا حکم دیا تھا" سو اسے دو ماہ بعد پاکستان آنا پڑا۔

شام کا وقت تھا۔ گرینی آرام کر رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں خالی الذہن بیٹھی تھی کہ مضبوط قدموں کی آہٹ پہ چونکی۔ وقت کی نبض ایک لمحے کے لیے تھم گئی۔ وہ دشمن جاں اس کے سامنے تھا' جس کی صورت نہ دیکھنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اسے دیکھے بغیر بھی یوں لگتا تھا جیسے جینے کا جواز ہی کوئی نہ ہو۔

وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا مگر ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پہ گلابی پن اترا' پلکیں لرزیں اور نہ ہی دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں۔ بس ایک بے نام سی

بے حسی جسم وجاں پہ چھا گئی تھی۔ البتہ سوگوار حسن ممتا کے رنگ میں ڈوب کر اور بھی جاذب نظر بنا رہا تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کی جھکی پلکوں پہ نظر جمائے ہوئے تھا۔ جس کے پیچھے نمی کا ایک طوفان مچلتا نظر آرہا تھا۔

"اچھی ہوں۔"

"وہ تو تم ہو۔" وہ قدرے مسکرا کر بولا۔ "بہت ویک لگ رہی ہو۔ کیا اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا؟" بے حد اپنائیت بھرا نرم لہجہ 'اہمل کو لگا وہ اس درجہ مسرت پہ رو پڑے گی۔

"میں ٹھیک ہوں سر! شاید آپ کافی عرصہ بعد دیکھ رہے ہیں تب ہی شاید۔"

"بہت دن بعد دیکھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو کچھ گزر چکا ہے۔ اسے میں بھول جاؤں' میں یہاں رہوں یا ابراڈ' ہمارے درمیان جو رشتہ ہے اسے ختم تو نہیں کیا جاسکتا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"ہاہ! کیا ہمارے درمیان واقعی کوئی ریلیشن ہے؟" وہ محض سوچ ہی سکی۔

"آپ گرینی کے کہنے پر آئے ہیں؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے۔" وہ اس کا یخ ہاتھ تھامے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"آپ کافی لمبا سفر کر کے آئے ہیں' ریسٹ کریں۔" نرمی سے کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے لیکن فرہاد نے اسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"یہاں بیٹھو' میں کچھ لایا ہوں' تمہارے اور جونیئر کے لیے۔" فرہاد نے ایک بیگ کھولنا شروع کیا' بچے کے لاتعداد کپڑوں اور کھلونوں سمیت اس کے لیے بھی بیش قیمت گفٹس تھے۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

بچے کے کپڑے اتنے بڑے تھے کہ چار سال بعد ہی پہننے میں آتے۔ اہمل کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کیا ہوا' کیا کچھ غلط لے آیا؟" ایک ایک چیز وہ بے حد چاؤ سے دکھا رہا تھا۔ دل پہ چھایا غبار چھٹنے لگا تھا۔ آنکھوں کے جگنو چمکنے لگے۔ چہرے پہ رنگ اتر آئے۔ اسے مادی چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی مگر فرہاد کا یوں آمادگی کے ساتھ اس معاملے میں دلچسپی لینا' اس کے دل و دماغ میں پھول کھلا گیا تھا۔

"بہت بڑے ہیں۔" اس کے سوال پر اس نے اپنی مسکراہٹ سمیٹ لی تھی۔ فرہاد ہلکا سا قہقہہ لگا کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"مجھے یہ سب چیزیں خریدنے کا سینس نہیں ہے' بس جو اچھا لگا' خریدتا چلا گیا۔ یو نو میں نے اپنے بچے کا امیج کیسا بنایا ہے' بالکل اپنے جیسا' اسمارٹ' کانفیڈنٹ اینڈ انٹیلی جنٹ' مگر اسے تمہاری طرح انوسنٹ اور لونگ بھی ہونا چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم بیٹا ہوگا یا بیٹی' بس میں نے ہر طرح کے کپڑے اور ٹوائز لے لیے۔"

ایسی بے اختیاری' ایسی محبت' وہ دم بخود رہ گئی۔ وہ بہت دیر تک اپنے خواب' خواہش بتاتا رہا' اپنے بچوں کے متعلق اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اپنے رویے اور اس ادھورے جملے پہ وہ بے حد نادم تھا۔ اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اس کے زخم مندمل کرنے آیا ہے۔ اسے دل سے قبول کیا ہو یا نہ ہو' اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ننھے مہمان کو دل و جاں سے خوش آمدید کہنے کو تیار ہے۔ وہ جتنے دن بھی رہا' اس کا رویہ بے حد خوشگوار اور حلاوت آمیز رہا۔ اہمل کو اپنے غم بھولنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

نہ اداس ہوں' نہ قرار ہے' میری کیفیت اک چراغ سی
وہ چلے گئے تو میں بجھ گیا جو وہ آگئے تو میں جل اٹھا

گزرتے وقت کو کون روک سکا ہے' اس کے لیے فرہاد بھی ایک اچھے وقت کی طرح تھا' جو جتنی دیر سے آتا' اتنی ہی جلدی چلا بھی جاتا تھا۔ وہ ہر ڈیڑھ' دو ماہ بعد آتا۔ کچھ دن رکنے کے بعد جانے کے لیے پر تولنے لگتا' تو اہمل کے اندر دراڑیں پڑنے لگتیں' یہ احساس حاوی ہونے لگتا کہ کچھ بھی ہو فرہاد' جینے کے بغیر نہ رہ سکتا۔

جینیفر اس کی اولین چاہت ہے' اسے بھلانا ناممکن ہوگا۔ جبکہ وہ ایسے رشتے میں منسلک ہے' جس کو اس نے مجبوراً بنایا اور نبھایا ہے اور ان ہی دنوں جب وہ زندگی کے اس پہلو پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی تھی کہ بارگاہ ایزدی میں اس کی دعائیں مستجاب ہوگئیں اور ایک خوب صورت صبح اس کے لیے بیٹے کی نوید لائی۔ تشکر سے رواں رواں رب تعالیٰ کی ثنا کہنے لگا تھا۔ گرینی کی تو خوشی دیدنی تھی۔ فوراً" ملازمین میں نقدی' کپڑے اور دیگر ضروریات زندگی کی اشیا وافر تعداد میں تقسیم کیں۔ مگر جسے آنا تھا' اس کی آہٹ بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔

بیٹے کی خبر پا کر وہ ایسا ہی خوش ہوا تھا جیسے سب توقع کر رہے تھے' تاہم آنے کے بارے میں اس نے عذر پیش کیا تھا۔

"میرا فی الحال آنا ممکن نہیں ہے گرینی! میں یہاں ایک کیس کی وجہ سے آؤٹ آف سٹی نہیں جاسکتا۔"

"کیس' کیسا کیس؟" گرینی کا دل دہل گیا۔

"کم آن گرینی! آپ پریشان نہ ہوں' میرے آفس کے ورکر کا کیس ہے' میری فرم کو انوالو کیا گیا ہے۔ بٹ ڈونٹ وری' سب سیٹ ہو جائے گا۔"

اس نے انہیں تسلی دی تھی۔ اہمل کو بھی فون پہ مبارک باد دی۔ وہ اس کے نہ آنے کا سن کر بالکل چپ ہوگئی تھی۔ اسے لگا جس کے انتظار میں اس نے طویل سفر کیا تھا' اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔

"میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا' ڈونٹ وری' بس تم جونیئر کا خیال رکھنا' میں اسے بالکل تندرست توانا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی طرح۔"

اب سمجھ میں آیا یہ کرم نوازی صرف اس لیے تھی کہ اس کی ذہنی الجھن اور جسمانی صحت کا اثر بچے پر نہ پڑے۔

"گرینی کے لیے تو بھی بیٹے کی خاطر۔ آخر یہ کب تک میرا استحصال کرتا رہے گا۔ میری جگہ کیا ہے رب العالمین کیا ہے میری حیثیت؟"

اس کا دل چلا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

کتنا سہل جانا تھا
خوشبوؤں کو چھولینا
بارشوں کے موسم میں
شام کا یہ اک منظر
گھر میں قید کرلینا
روشنی ستاروں کی
مٹھیوں میں بھرلینا
کتنا سہل جانا تھا
خوشبوؤں کو چھولینا
جگنوؤں کی باتوں سے
پھول جیسے آنگن میں
روشنی سی کرلینا
کتنا سہل جانا تھا
اے دل کی خوش فہمی
اس طرح نہیں ہوتا
تتلیاں پکڑنے کو دور جانا پڑتا ہے

☼ ☼ ☼

زندگی ایک ایسے موڑ پہ آگئی تھی کہ سوائے تقدیر کے اسے کسی اور سے شکوہ نہ رہا تھا۔

وقت کبھی گزرنے میں نہیں آتا اور کبھی یوں گزرتا کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ زندگی کا ایک سال ماضی کی گود میں جا گرا۔ اب تو موحد بھی پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ اہمل کا سارا وقت اس کے ساتھ چہلیں کرتے اور کھلانے میں گزر جاتا۔ لبوں سے کبھی بھول کر بھی فرہاد سکندر کا نام تک نہ نکلتا' جس کے آنے کی امید کا دیا وہ روز روشن کیا کرتی' ٹہنی سے پھول کی اک پتی بھی گرتی تو اس کے قدموں کی چاپ کا دھوکا ہوتا۔ فون کی ہر بیل' دروازوں کی چرچراہٹ پہ وہ چونک جاتی' جیسے ابھی وہ دہلیز پہ اپنے قدم رکھے گا۔

فرہاد کی اس درجہ لاتعلقی اور خود غرضی پہ گرینی کڑھ کر رہ گئی تھیں۔ پریشانی' الجھنوں اور ذہنی دباؤ نے ان

کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا ایمل بے حد پریشان ہو اٹھی۔

وہ ہلکا پھلکا انداز اپنا کر انہیں ڈھارس دینے کی کوشش کرتی۔

"مجھے یقین ہے وہ ضرور جلد لوٹیں گے' وہ قادر مطلق مجھے میری اوقات سے زیادہ نہیں آزمائے گا۔" اس کے لہجے میں ایقان بول رہا تھا۔

کرینی اس کے لفظ "یقین" پر ہی اسے حیرت سے دیکھ کر رہ گئی تھیں اس درجہ لاتعلقی' بے اعتنائی پر بھی یقین۔؟

☼ ☼ ☼

اس روز بھی وہ نماز پڑھ کر گرینی کی صحت اور موسیٰ کے لیے دعا مانگ رہی تھی کہ آنسو رخساروں پہ لڑھک آئے۔

سیاہ کاٹن کے سوٹ میں آنکھیں بند کیے انتہائی خشوع و خضوع سے دعا مانگتے ہوئے وہ اتنی مقدس و پرنور لگ رہی کہ اندر داخل ہوتے فرہاد کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

وہ چہرے پہ ہاتھ پھیر کر آنسو صاف کرتی جائے نماز سے اٹھ گئی۔ سامنے ہی بیڈ پہ گرینی آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔

"لیجیے گرینی! سوپ لے لیجیے۔" اس کا سنجیدہ لہجہ اور حلاوت سے بھرپور آواز فرہاد کی سماعتوں کا حصہ بن گئی۔

گرینی نے آنکھیں کھولیں تو موسیٰ ان کے پاس جانے لگا۔ ایمل نے اسے سرزنش کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ منظر اتنا مکمل اور خوب صورت تھا کہ اس کی تکمیل کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔

گرینی کو سوپ پلانے کے بعد نیپکن سے منہ پونچھنے کے بعد جوں ہی مڑی تو اسے دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

"میں آگیا گرینی! دیکھیے میں آگیا۔" وہ بے قراری سے آگے بڑھا تو باوجود لاتعداد شکایتوں کے گرینی کے نحیف بازو اس کے لیے وا ہو گئے۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ ایمل غیر محسوس انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں چلا گیا تھا میرے بچے! اپنی گرینی کے بڑھاپے کا خیال تک نہیں آیا تجھے۔" گرینی کے آنسو بہنے لگے تھے۔ فرہاد کو احساس ہوا تو انہیں خود سے الگ کیا۔

"بس یہیں تھا' آپ کے پاس' ذرا پرسنل الجھنوں میں پھنس گیا تھا' اینی وے' مجھے یہ بتایئے آپ اتنی ویک کیوں لگ رہی ہیں۔"

"میں انسان ہوں بیٹا! بوڑھی کمزور اور بے صبری' ایمل کی طرح سمجھا تھا تم نے مجھے' یہ تو بچی کا صبر ہے جو تمہاری نا انصافیاں اور بے اعتدالیاں برداشت کرتی رہی ہے۔"

نحیف اور نقاہت زدہ آواز میں اب وہ اسے ڈانٹ رہی تھیں۔ فرہاد نے ایک نظر سر جھکا کھڑی ایمل پہ ڈالی مگر موسیٰ نے ساری توجہ کھینچ لی۔

"مائی سن! یو آر جسٹ مائن۔" مچلتے موسیٰ کے چہرے کو وہ بے تحاشا چومتا چلا گیا تھا۔ کیسا حسین تحفہ دیا تھا ایمل نے' برسوں کی تشنہ خواہش آج سیراب ہوئی تھی۔ موسیٰ اس درجہ محبت کے مظاہرے پہ احتجاجاً "رورڑا اور ایمل کی طرف بانہیں بڑھا رہا تھا۔

"نو مائی ڈیر! آج نہیں' آج تم صرف اپنے پاپا کے پاس رہو گے۔" فرہاد نے اسے خود سے لپٹا لیا تو ایمل ڈھیلے قدموں سے چلتی باہر آگئی۔

"گرینی! آئی کانٹ بلیو کہ یہ میرا بیٹا ہے۔" گرینی اس کی بچکانہ سی بات پر ہنس پڑیں۔

"ماشاء اللہ چودہ ماہ کا ہے مگر لگتا ایسے ہے جیسے دو' ڈھائی سال کا ہو' ایمل نے بڑی جان ماری ہے اس کے لیے اور میرے لیے جس طرح تم اسے بے یار و مددگار چھوڑ گئے تھے کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنے حسن اور وقت کو بے قدرے شوہر کے انتظار میں ضائع نہ کرتی۔ میں بوڑھی عورت بھلا اسے روک سکتی تھی؟" گرینی کے لہجے میں تجربے کی گہرائی تھی۔

"جن معاشی حالات میں رہ کر وہ یہاں آئی تھی' دولت کی اس چکا چوند سے تو اس کی آنکھیں چندھیا جانی چاہیے تھیں' مگر اس کا دل تو جیسے تونگر ہے۔" گرینی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں' وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

"آئی نو گرینی! شی از آ وری نائس۔" اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔ گرینی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تو پھر اس بھلی مانس بچی سے کس چیز کا بدلہ لے رہے ہو کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟" گرینی دل گرفتی سے بولیں۔

"پہلے تو میں سمجھ نہ پائی' لیکن مجھے اب اندازہ ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہی نہیں ہے' جب ہی تو کئی کئی ماہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لیتے ہو۔ تم نے سوچا غریب گھر کی لڑکی ہے۔ منہ آگا نہ پیچھا' تم صرف میرے لیے ایک نرس لائے تھے' ایک کیئر ٹیکر اور بس۔ ایک بیوی کی تمہیں چاہ بالکل نہیں تھی۔" گرینی تو جیسے اسے پڑھتی ہی چلی گئیں۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ تڑپ کر سر اٹھایا۔

"نہیں گرینی! ایسی بات بالکل نہیں' میں نے اسے ایکسپلائٹ ہرگز نہیں کیا۔ جو ہوا وہ میری مجبوری تھی۔" وہ آزردگی اور شکستگی سے کہہ رہا تھا۔

"تو جاؤ' پھر اسے مناؤ' بیٹا! دنیا کی بہترین متاع نیک اور وفا شعار بیوی ہوتی ہے۔ یہ متاع گنوا دی تو پھر کیا پایا؟"

گرینی کی بات سن کر وہ سر ہلا کر باہر نکل آیا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں ہی اسے مل گئی۔ بے تحاشا روتی' شولڈر بیگ لٹکائے باہر نکلنے کو تیار۔

"کہاں جا رہی ہو؟" فرہاد کا لہجہ سخت تھا۔

"جہاں مجھے بہت پہلے چلے جانا چاہیے تھا۔" آنسوؤں سے بھیگتے لہجے میں بہ مشکل کہا۔

"مجھے پرپوز کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میں نرسنگ کر سکتی ہوں؟ مجھے اسی وقت
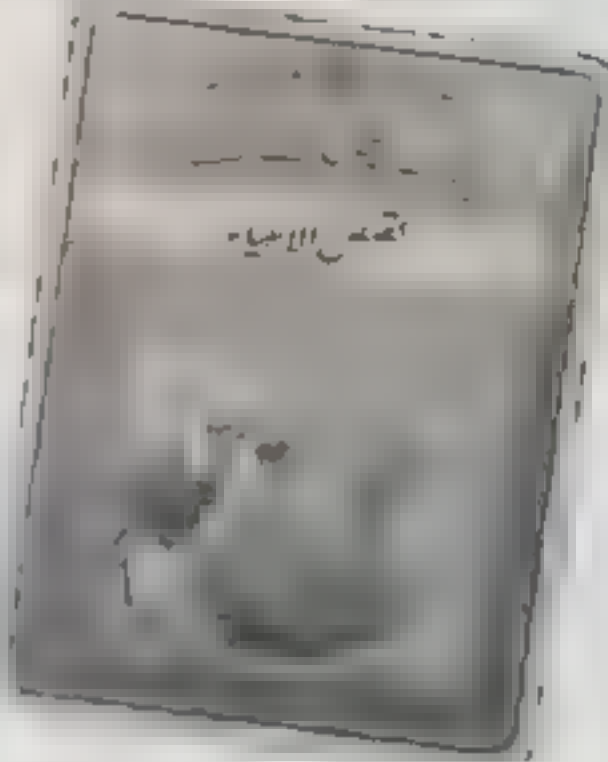
سمجھ لینا چاہیے تھا کہ مجھے یہاں ملازمت ہی کرنی ہوگی سو وہ میں نے کی۔"

وہ جب بھی فرہاد کے واپس لوٹ آنے کی دعا مانگتی تو ساتھ یہ بھی کہتی کہ یارب العالمین! اسے جب بھی بھیج تو صرف میرا بنا کر ہی بھیج اس کے دل میں سوائے میرے کسی دوسری ہستی کے خیال کا گزر تک نہ ہو۔ اب جبکہ وہ آگیا تھا تو یہ سوچیں اس کے دل و دماغ پہ بری طرح وارد ہو ئیں کہ وہ آیا تو ہے پر واپس جانے کے لیے' اسے پھر سے احساس جدائی کو تھپکیاں دینا ہوں گی' اس کے آنے سے غم کے بادل چھٹ گئے تھے مگر اس کے جانے کا سوچ کر دل افسردگی سے نڈھال ہوا جاتا۔ اسے جانا تو جینی کے پاس ہی تھا' جینی جو اس کی پہلی محبت' مسز فرہاد' اس کی خلوتوں کی ساتھی تھی۔ جو فرہاد سکندر کے دل کی جاگیر کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ سو وہ اپنی عزت نفس کو کب تک رگیدتی۔

فرہاد اس کی دلی کیفیت جانتا تھا' سو خاموشی سے اس کی سنے گیا' اس کا غبار نکل جانا ہی بہتر تھا۔

"ہر طرح سے کوشش کی آپ کے گھر کو اپنا گھر بنانے کی' مگر نہ بنا سکی' میں جانتی ہوں وہ آپ کی اولین محبت ہے اور میں۔۔۔ ایک سمجھوتا' ایک ضرورت اور بزنس ڈیلنگ۔"

قمیص کی آستین سے گال صاف کرتے ہوئے وہ فرہاد کو اس لمحے بالکل اسکول گرل لگی تھی۔ فرہاد کے چہرے پہ بے اختیارانہ سا تبسم آکر ٹھہر گیا۔

"تم چلی گئیں تو موسیٰ کا کیا ہوگا؟" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔ ایمل نے چونک کر سرخ آنسوؤں سے بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"تو اب آپ کو موسیٰ کے لیے گورنس چاہیے؟" لہجے میں کانچ کی کرچیاں چبھی ہوئی تھیں۔ فرہاد کے ماتھے پہ شکنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے ایمل! میں اتنا بینک بیلنس ضرور رکھتا ہوں کہ موسیٰ کے لیے گورنسز کی پوری بٹالین کھڑی کر سکوں۔" غصے میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر ہلکا سا جھنکا دیا تھا۔ ایمل کا دل حسب عادت ایک لمحے کے لیے بری طرح سہما مگر پھر نڈر ہو کر بولی۔

"ہاں' مگر میری طرح کوئی مفت کی چاکری نہیں کرے گی۔"

"ایمل! ہوش میں رہ کر بات کرو۔" اب کے وہ سراپا آتش فشاں بن گیا تھا۔ ایمل کی جان ہوا ہونے لگی۔

"میں برداشت کر رہا ہوں اور تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو' تم نے کیسے سمجھ لیا کہ تم میری مرضی کے بغیر یہاں سے نکل سکتی ہو۔ بولو۔" اس کے بازوؤں میں فرہاد کی انگلیاں پیوست سی ہو گئیں۔ کرب کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کرلیں' آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔

"پلیز! میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔ میری خدمتیں آپ کی توجہ تو شاید جیت لیں' لیکن دل کبھی نہ جیت سکیں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔" اس کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے وہ خشکی لہجے میں بولی۔

"کچھ کہنے کا موقع نہیں دو گی۔ بڑے سے بڑے مجرم کو بھی اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا جاتا ہے مگر تمہاری عدالت تو اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

سینے پہ بازو باندھتے ہوئے وہ نروس کر دینے والے انداز میں گویا ہوا تو ایمل کو یوں لگا جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"پہلے یہاں بیٹھ کر میری بات تسلی سے سن لو' پھر کوئی فیصلہ کرنا۔" وہ نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے تک لے آیا۔

"یہ سچ ہے' میں نے جینی کو پورے دل سے چاہا' اسے لیگلی (قانونی طور پر) اپنایا۔ اس کی ہر بات مانی لیکن وہ مجھے ٹیکن فار گرانٹڈ رگیدتی چلی گئی' یہاں تک کہ اس نے میرے بچے کو بھی ریجیکٹ کر دیا۔ مجھ سے چھپ کر ابارشن کرالیا' یہاں تک ہوتا تو ٹھیک' لیکن اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی میری برداشت سے باہر تھی۔ پھر یہیں سے میں نے تمہارا اور اس کا تقابل نہ چاہتے ہوئے انجانے میں شروع کر دیا۔ ہر بار تم حاوی رہتیں۔ جینی بالکل ہلکی ہو جاتی۔ ہاں ایمل فرہاد! تم نے مجھے مجھ سے چھین لیا ہے۔ موسیٰ کی شکل میں ایسی زنجیر میرے پاؤں میں ڈال دی کہ میں چاہوں بھی تو اس ریلیشن کو نہیں توڑ سکتا۔"

گہرے لہجے میں بولتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی ایمل کو بے ساختہ خود سے لگایا تو وہ جیسے کسی خواب سے چونکی۔

"یہ دیکھو میں نے جینی کو ڈائیورس دے دی ہے اور یہ آٹھ ماہ شکاگو میں مجھے اسی سلسلے میں گزارنے پڑے' کیونکہ جینی نے مجھ پر کیس کر دیا تھا۔ وہ مجھے کسی صورت نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔" فرہاد نے سائیڈ ٹیبل سے ایک فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

ایمل تو جیسے اس انکشاف کی آندھی میں ہچکولے کھانے لگی تھی۔ فائل تو کیا تھامتی' تھک کر اس کے کندھے پہ سر ٹکا گئی۔

"باقی وقت بزنس وائنڈ اپ کرنے میں لگ گیا۔ اب تمہارے' موسیٰ اور گرینی کے بغیر رہنا امپاسبل ہے۔ اسٹیٹس سے مکمل ناتا توڑ کر تمہارے سامنے ہوں اب کرلو فیصلہ۔"

وہ جواب میں کیا کہتی' بے اختیار روتی چلی گئی۔ یہ شکر کے آنسو تھے۔ اس کی دعائیں قبولیت پا گئی تھیں۔ اس کا یقین سرخ رو ٹھہرا۔ ساتھ بیٹھا شخص اماں کی دعائے نیم شبی کا انعام تھا۔ فرہاد نے گہری سانس بھر کر اس کے بال چوم لیے۔ جس نے اپنے آپ کو مکمل اس کی سپردگی میں دے رکھا تھا۔

"چلو بس' اب آنسو صاف کرلو' دیکھو تم نے میری اس قدر مہنگی شرٹ کی کیا حالت بنا ڈالی ہے۔"

"آپ کے لیے چائے لاؤں۔" اس نے راہ فرار ڈھونڈی۔ فرہاد کی شوخ' جذبوں کی لو دیتی آنکھوں کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ناٹ ایٹ آل' اب تمہارے یہ بہانے نہیں چلنے والے' ڈیر! میں یہاں مستقل آگیا ہوں۔ اگر تم نے اسی طرح فرار ہونے کے لیے چائے کے لالچ دیے تو بہت جلد مجھے چائے کا باغ خریدنا پڑے گا۔"

فرہاد کی شوخی عروج پہ تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں تھے۔ جائے فرار نہ تھی۔

"بس مجھے یہ یقین دو کہ تم نے میری خطائیں نظر انداز کر کے مجھے کھلے دل سے معاف کر دیا ہے۔"

ایمل کیا کہتی' کہنے کے لیے بچا ہی کیا تھا ۔۔۔

۔۔۔ اس نے فرہاد کے سینے میں اپنا منہ چھپا لیا۔ فرہاد نے اس اعتراف پر سرشار ہوتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

عفت سحر طاہر

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھیں مگر ان سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہیں۔ صالحہ مر چکی ہیں۔ ابیہا ان کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ' ابیہا کو امتیاز احمد کے سپرد کر جاتی ہیں۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً" رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں امتیاز احمد کو فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کر لیتا ہے۔

—۳—

تیسری قسط

معیز احمد کی آواز ابیہا کی سماعتوں میں کرنٹ بن کے دوڑی تھی۔ رنگت یوں سپید پڑی جیسے خون کا ایک قطرہ نہ ہو بدن میں۔

"اچھا ہی ہوا، یہ کال میں نے اٹینڈ کرلی۔ ابو تو شاید تاقیامت تمہارا یہ مطالبہ میرے کانوں تک نہ پہنچنے دیتے۔ مگر اب تم بے فکر رہو، میں خود بنفس نفیس یہ پیغام ان تک پہنچاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی طلاق کے کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔"

وہ جیسے بہت محظوظ ہو رہا تھا یا شاید بہت عرصے کے بعد سکون کی کیفیت میں آیا تھا۔ ایسا نے جھرجھری سی لے کر موبائل پرے پھینک دیا۔ اس کے وجود پر ہلکا سا لرزہ طاری ہو گیا۔ یک لخت ہی فہم و شعور کا دروازہ کھلا تو اندازہ ہوا کہ وہ غلطی نہیں، بلکہ فاش غلطی کر بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہوش میں تو ہو تم معیز۔۔" امتیاز احمد تو اس کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑنے لگے۔

"پورے حواس میں بات کی ہے میں نے۔ مجھ پر یقین نہیں تو اسے کال بیک کرلیں۔" وہ بلا کا پرسکون تھا۔

"میری زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا معیز! ہاں۔۔ میرے مرنے کے بعد تم لوگ اس سے جیسا چاہے سلوک۔۔"

ان کی یک لخت بھرا جانے والی آواز نے معیز کا سکون پوری طرح غارت کر دیا۔ وہ جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بہت آرام وہ کیفیت کو انجوائے کر رہا تھا، بے اختیار سیدھا ہوا۔

"ابو پلیز۔۔" تیز آواز میں انہیں ٹوک دیا۔ وہ رخ پھیرے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو محبت کرنے والے باپ بیٹے کے درمیان تناؤ کی سی کیفیت در آئی تھی۔

معیز نے ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑی اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

امتیاز احمد بے دم ہو کر اپنی کرسی پر گر سے گئے۔ ان کے ذہن و دل پر عجیب سا بھاری پن طاری ہونے لگا۔ گزرے وقت کی یاد نے شدت سے ان کے ذہن پر حملہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم دادی جان۔۔" صالحہ کی الھڑپن اور شوخی سے بھرپور آواز امتیاز نے اپنے کمرے تک سنی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وعلیکم۔۔" دادی کا انداز لٹھ مار سا تھا۔ انہوں نے نئے فیشن کے سلے فیروزی رنگ کے جوڑے میں چہچہاتی صالحہ کو گھورا، پھر گویا بے مروتی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے پوچھا۔

"نہ۔۔ میں پوچھوں تم صبح سویرے کدکڑے لگاتی ادھر کہاں پہنچ گئیں؟"

"کیوں۔ کیوں نہ آؤں۔ میرے دادا، میرے تایا کا گھر ہے۔"

وہ بے حد اطمینان سے بولی تو اماں کی تیوری چڑھ گئی۔ انہیں صالحہ کی بے جا آزادی اور منہ پھٹ ہونے پر کئی تحفظات تھے۔ مگر چونکہ دادی ساری کسر نکال لیا کرتی تھیں۔ اس لیے وہ بات کے بیچ کم ہی آتیں۔

صالحہ نے تخت پر دادی کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے پاندان میں ہاتھ مارتے ہوئے پسا ہوا کھوپرا نکال کر پھانکا۔ دادی نے اسے گھورتے ہوئے پاندان پرے اوٹ میں رکھ دیا۔

"اکیلی کیوں آئیں۔ اماں باوا کہاں تھے تمہارے؟" دادی اس کی فل کلاس لینے کے موڈ میں تھیں۔

امتیاز کا دل چاہا، وہ باہر جا کر سارا منظر بدل ڈالے مگر دادی اور اماں کے وضع کردہ اصول یاد کرکے آہ بھر کے رہ گیا۔

"کیا دادی جان! یہ اگلی گلی میں تو گھر ہے ہمارا۔ کون سا دوسرے شہر سے آرہی ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"اور ویسے بھی آپ کو تو پتا ہی ہے، ابا نے مجھے اجازت دے رکھی ہے اکیلے آنے جانے کی۔"

امتیاز اندر جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہل رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا۔ کسی بہانے باہر نکل کر اس پارہ صفت کا دیدار کرلیتا۔

"تائی اماں۔۔ امیت آیا ہوا ہے۔ ابا بتا رہے تھے۔" وہ بے تکلفی سے تائی اماں سے پوچھ رہی تھی۔

"ہائیں۔۔" دادی کا پوپلا منہ کھلا۔ اماں بدکیں۔

"امیت۔۔ پھر امیت بولی تو۔" اماں نے گھورا۔

وہ بڑے ناز سے جھنجلا گئی۔ "بھئی مجھ سے نہیں اتنا بھاری بھرکم نام لیا جاتا۔ امتیاز احمد۔۔ اب دیکھیں نا ایتابھ بچن کا نام کتنا لمبا ہے۔ اسے بھی سب امیت ہی کہتے ہیں۔"

اندر امتیاز کو جی بھر کے ہنسی آئی۔ اس کی توجیحات یوں ہی من پسند ہوتی تھیں۔

"ستیاناس۔۔ وہ ہندو، یہ مسلمان، کس سے ملا رہی ہے میرے امتیاز احمد کو۔" اماں خفا ہوئیں تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھئی۔۔ آپ لوگ بلاتے رہیں اسے یوں ہی۔۔ مجھے تو امیت ہی اچھا لگتا ہے۔ ویسے ہے کہاں وہ۔ چھپ کے بیٹھا ہے۔ میں نے نئے گانوں کی البم منگوائی تھی اس سے۔"

وہ کہتے ہوئے امتیاز احمد کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اماں کی "ارے سنو" تو دادی کی "ہائیں، ہائیں" اس نے کچھ بھی نہ سنا۔

وہ مزے سے امتیاز احمد کے کمرے میں گھسی تو وہ سامنے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"کس قدر خبیث ہو تم۔ دو دن سے آئے ہوئے ہو اور ایک چکر نہیں لگایا گھر کا۔"

صالحہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ جارجٹ کا فیروزی دوپٹا لاپروائی سے سر پر ٹکا اس کے روپ کی شان بڑھا رہا تھا۔ وہ فیروزی رنگ میں بہت حسین لگتی تھی۔ پھر امتیاز نے سوچا، کون سا رنگ اس پر نہیں جچتا؟ مگر اسے کوئی بھی رنگ یاد نہ آیا تھا۔

وہ ہر رنگ میں ہی خوب صورت لگتی تھی۔

"او دئیے۔۔ کہاں گم ہو؟" صالحہ نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔ وہ چونک کر مسکرا دیا۔

"میری کیسٹ لائے ہو یا نہیں؟" اس نے تحکمانہ پوچھا۔

"لایا ہوں مگر تم باہر چل کے اماں اور دادی کے پاس بیٹھو۔ وہیں دوں گا تمہیں۔"

امتیاز کو اپنے دل و دماغ پر پورا کنٹرول حاصل تھا اور گھریلو روایات کی پاسداری کا خیال بھی۔

"اوفوہ۔ ایک تو تم شریف۔ دو شریف۔ لو لیٹر بھی لکھو گے تو اماں، دادی کے سامنے ہی دینا۔" صالحہ نے طنز کیا۔

"تم جانتی تو ہو ہمارے گھر کا ماحول۔۔" امتیاز نے تنبیہا" اسے دیکھا تو اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

"جانتی ہوں۔ تب ہی تو دم گھٹتا ہے میرا یہاں۔ یوں چلو یوں نہ چلو، ایسے بولو ایسے ہنسو، بندہ نہ ہوا روبوٹ ہو گیا۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں خود کو عادی کرلو اس ماحول کا۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"معاف کرنا امیت جی! جو ہم سے دل لگائے گا۔ اسے خود کو سرتاپا بدلنا ہو گا ہمارے لیے۔"

اس نے بڑے ناز سے کہا تو اس کا معصوم سا غرور امتیاز کے دل کو لوٹ پوٹ کر گیا۔

"مگر کسی کی محبت میں تو خود کو بدلنا پڑتا ہے نا۔" وہ اس کی طرح بے باک و منہ پھٹ نہ تھا ورنہ صاف کہتا میری محبت میں تو تمہیں خود کو بدلنا ہی ہوگا۔

"صالحہ جلیل احمد۔ چاہنے کے لیے نہیں، بلکہ چاہے جانے کے لیے بنی ہے امیت جی!"

وہی پرغرور انداز۔ بھاری پپوٹوں والی غلافی آنکھیں شہابی رنگت اور مغرور ناک۔

وہ مغلیہ دور کی شہزادی دکھتی تھی۔

اس پر بڑے انداز سے اس کا امتیاز احمد کو "امیت جی" کہنا۔

اس تخاطب پر امتیاز کا جی چاہتا اپنی دنیا اس پر وار دے۔

وہ اس حسین بے پروا کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب ہی کسی نے زوردار ہاتھ مار کر بھڑے ہوئے دروازے کو دھکیلا تو کواڑ زوردار انداز میں کھل کر پیچھے دیوار سے ٹکرایا۔ وہ دونوں گویا اچھل ہی پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔" اس نے ڈرائیونگ کے دوران بجتے موبائل کو بنا دیکھے بٹن دبا کر کان سے لگایا تو ذہن منتشر سا تھا۔

"ہیلو معیز جی۔" وہی مدھم سا لب و لہجہ۔

معیز نے لب بھینچے۔ پھر تیوری چڑھا کر بولا۔

"جی۔ معیز بات کر رہا ہوں۔"

"تو کرتے رہیے نا۔ اچھا لگ رہا ہے۔" بے تکلفانہ مسکراتا ہوا انداز۔ معیز کے وجود میں شرارہ سا لپکا۔

"شٹ اپ۔ تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے کرنے کو۔"

"کام تو بہت ہیں مگر ان میں سب سے اول ہے، تمہیں کال کرنا۔" دھیمے سُروں میں کہتے ہوئے اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ اس لڑکی کی کالز معیز احمد کے لیے امتحان بن رہی تھیں۔ وہ اس کے نمبر کو بلیک لسٹ کرنے کا سوچ چکا تھا۔

"ترس آتا ہے مجھے تم جیسی ذہنی مریضہ پر۔ جس کے دل کو سکون تب ہی ملتا ہے جب وہ کسی رانگ نمبر پر اجنبی لڑکوں سے گھٹیا گفتگو کرتی ہے اور کچھ نہیں تو اپنے ماں، باپ کی عزت ہی کا خیال کر لو۔ شیم آن یو۔"

معیز کے لب و لہجے سے شعلے برسے تھے۔ اس نے موبائل آف کر کے ڈیش بورڈ پر ڈال دیا۔

درحقیقت اس کا موڈ سخت آف تھا۔ امتیاز احمد کا ابیہا کو یوں سب پر فوقیت دینا اسے بالکل بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

اسے اس معاملے میں اپنے ہاتھ مکمل طور پر بندھے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک وہ وقت تھا، جب اس کی مرضی کے بغیر امتیاز احمد ابیہا کو زندگی میں شامل نہ کر سکتے تھے اور اب وہ وقت آیا تھا کہ وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔

ماما کو بتا نا تو ان کی متوقع ذہنی و جذباتی حالت کا خیال آجاتا۔ اگر انہیں علم ہو جاتا کہ امتیاز احمد اپنی سابقہ منگیتر کی بیٹی سے جذباتیت میں کیا رشتہ جوڑ بیٹھے ہیں اور یہ بھی کہ معیز نے اس سارے میں کیا کردار ادا کیا ہے تو شاید نہیں، بلکہ یقیناً" انہیں ہارٹ اٹیک ہو جاتا اور اگر وہ امتیاز احمد سے ابیہا کو آزاد کرنے کی بات کرتا تو۔ اسے امتیاز احمد کی ابیہا کے حوالے سے جذباتیت یاد آگئی وہ اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مار کر رہ گیا۔

درحقیقت وہ بہت ذہنی پراگندگی کا شکار ہو رہا تھا۔ تب ہی بے اختیار اس نے گاڑی کا رخ تبدیل کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک چھوٹے مگر خوب صورت سے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا تھا۔

یہ عون عباس کے باپ کا ریسٹورنٹ تھا، جسے یونیورسٹی کے بعد رات گئے تک عون چلاتا تھا۔ کمرشل ایریا میں موجود یہ ریسٹورنٹ بہت کامیابی سے چل رہا تھا۔ اندر جا کر ایک سیٹ سنبھالتے ہوئے اس نے کاؤنٹر پر موجود عون پر نگاہ ڈالی۔ وہ لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔

معیز نے موبائل نکال کر اسے کال ملائی۔ عون نے سائیڈ پہ رکھا موبائل بنا دیکھے آن کر کے کان سے لگایا۔ اس کی نظر ابھی بھی اسکرین پر تھی۔

"ہیلو۔"

"معیز بول رہا ہوں، کیا کر رہے ہو؟" معیز اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"کام کر رہا ہوں یار۔"

"یقیناً" نیٹ سے نئی ریسپیز نقل کر رہا ہوگا۔" اپنے پھٹیچر ریسٹورنٹ کے لیے۔" معیز نے مسکراہٹ دبائی۔ اس کا موڈ بدلنے لگا تھا۔

"کام کیا ہے، وہ بولو۔ میں تمہاری طرح فارغ بندہ نہیں ہوں۔"

"اچھا۔ تو پھر دو کافی لے کر کارنر والی ٹیبل پر آجا، میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ روانی سے بولا۔ اس نے عون کو چونک کر ریسٹورنٹ میں نظریں دوڑاتے دیکھا۔ معیز کو وہیں بیٹھے اپنی طرف دیکھتے پا کر عون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آرہا ہوں خبیث! ویٹ کر ذرا۔"

معیز نے ہنستے ہوئے موبائل آف کر کے ٹیبل پر ڈال دیا۔ عون سے ملنا درحقیقت اپنی ذہنی کیفیت سے نجات حاصل کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا، اگر موجودہ کیفیت میں گھر پہنچا تو ذرا سا اشارہ پا کر شاید وہ سفینہ کے سامنے ہی دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا۔ اسی خوف نے اسے گھر جانے سے روکا تھا۔

کافی کے دو بھاپ اُڑاتے مگ — اس کے سامنے آئے تو وہ چونکا۔ عون کرسی گھسیٹتا اس کے سامنے بیٹھ رہا تھا، معیز سنبھلا مگر مقابل بھی زیرک تھا۔ چوک جاتا، ممکن ہی نہ تھا۔

"کیا بات ہے، دکھی محبوبہ کی طرح کن سوچوں میں کھوئے ہو؟"

"فی الحال تو یہی سوچ رہا تھا کہ تمہارے ریسٹورنٹ سے کچھ کھا پی کر کسی ڈاکٹر کے کلینک کو شرف بخشوں۔"

معیز نے خوب بدلہ چکایا تھا اور یہ عون عباس کی دکھتی رگ تھی، وہ بھڑکا۔

"تیری بیوی نہیں ہے، ورنہ میرے ہاتھ کی بنی کافی پینے کے بعد تو کبھی اس کے ہاتھ کی کافی نہ پیتا۔"

"ظاہر ہے۔ کافی سے نفرت ہو جاتی مجھے۔" معیز نے مسکراہٹ دبائی۔

"تو جس سے محبت ہے اسی کا بتا دے۔" عون نے بغور اسے دیکھا، ہلکا سا اضطراب جس کے انداز و اطوار سے ظاہر تھا۔

"محبت۔ شٹ۔ وقت کا زیاں۔" معیز نے حقارت سے سر جھٹکا۔ عون بے اختیار مسکرایا۔

"تجھ سے جیسے ہی ہوتے ہیں جنہیں بعد میں ہاتھ پاؤں باندھ کر محبت ایک کونے میں ڈال دیتی ہے۔"

"تجھے کیا لگتا ہے عون! مجھ جیسے بندے کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟ جسے پہلے ہی ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کونے میں ڈال دیا گیا ہو؟" وہ بے اختیار پھیکے سے لہجے میں کہہ گیا مگر پھر منٹ کے ہزارویں حصے میں ہی سو دفعہ پچھتایا۔ گویا چونکا تھا۔

جبکہ معیز کو خود کو سنبھالنے میں وہی ایک پل لگا۔ مگر عون نے بھی یقیناً" اس کا بے اختیار ہو کر بکھرنا اور پھر

فوراً" ہی خود کو سمیٹنے کی سعی کرنا محسوس کرلیا تھا۔ تب ہی ذرا بھی نہ کریدا۔

"ٹینس ہو؟" دوستانہ سا انداز یعنی بتانا ہے تو مرضی' نہ بتانا چاہو تو بھی۔۔۔

"ہوں۔۔۔" معیز نے گہری سانس لے کر کرسی سے ٹیک لگائی اور خود کو قدرے آرام دہ محسوس کیا۔

"تھا تو۔۔۔ لیکن اب خود کو بہتر محسوس کررہا ہوں۔" کچھ کہی ان کہی والا انداز۔

"دیکھا۔۔۔ ابھی تو صرف میرے ریسٹورنٹ کی ہوا کھائی ہے تو ساری ٹینشن ریلیز ہوگئی ہے۔ کافی پی کر تو ہلکا پھلکا ہو کر ہواؤں میں ہی اڑنے لگے گا۔ چل شاباش۔"

عون نے بھی موضوع بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ فوراً" ہی اسے پچکارا تو وہ ہنس دیا۔ عون کے ساتھ پون گھنٹہ گزار کر وہ وہاں سے نکلا تو پہلے سے بہت بہتر معیز احمد تھا۔

☆ ☆ ☆

دادی دروازے میں کھڑی خشمگیں نگاہوں سے پوتے اور پوتی کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے خدانخواستہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑلیا ہو۔

"نہ۔۔۔ میں کہوں صالحہ کی بچی! کوئی شرم حیا ہے بے تجھ میں کہ نہیں۔"

وہ چیخیں۔۔۔ امتیاز گھبرا سا گیا مگر صالحہ نہیں ڈری۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کے بل پڑگئے۔

"کیوں۔۔۔ میں نے ایسا کیا کردیا؟"

"اری نامراد۔۔۔ لوتھا کی لوتھا ہوگئی۔ یوں منہ اٹھائے لڑکے کے کمرے میں چلی آئی۔"

دادی کو صالحہ پر اعتراض نہ تھا۔ انہیں صالحہ کی آزاد طبع پر اعتراض تھا۔ ورنہ یہ رشتہ ان کی ذاتی پسند سے طے ہوا تھا مگر اب وہ دل سے چاہتی تھیں کہ صالحہ گھر بند ہو کر بیٹھ رہے۔ بالخصوص امتیاز احمد سے تو ضرور ہی پردہ کرے۔

"تو کون سا پرایا لڑکا ہے دادی! کزن ہے میرا اور پھر میں کون سا رات کے اندھیرے میں چھپ کے ملنے آئی ہوں اس سے۔ دن دیہاڑے آپ لوگوں کے سامنے اندر آئی ہوں۔"

صالحہ نے اس قدر اطمینان سے کہا کہ گھبرایا ہوا امتیاز بھی عش عش کر اٹھا۔

مگر اماں کو ہونے والی بہو کی طراری ایک آنکھ نہ بھائی' وہ تو پہلے ہی اپنی بھانجی کو امتیاز احمد کے ساتھ سوچے ہوئے تھیں مگر دادی نے ان کی ایک نہ چلنے دی تھی اور صالحہ کے پیدا ہوتے ہی اس کی ننھی سی انگلی میں امتیاز احمد کے نام کی انگوٹھی ڈال دی۔ تین سالہ امتیاز احمد اتراتا پھرا کہ اس کی دلہن آگئی ہے۔

"پھر بھی صالحہ بی بی۔۔۔ رشتوں کی نزاکت کا ہی تھوڑا خیال کرلیتے ہیں۔" اماں کے طنز ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔

"معاف کیجئے گا تائی اماں! اور اپنی غلط فہمی بھی دور کرلیجئے گا۔ میں کبھی اسے اپنا منگیتر سمجھ کے ملنے نہیں آئی ہوں اور نہ ہی وہ رشتہ میرے ذہن میں ہے۔"

وہ ترنخ کر کہتی وہاں رکی نہیں۔ کیسٹ ہاتھ میں دبائے شاکی نگاہ امتیاز پر ڈالتی نکل گئی۔

"کمال کرتی ہیں آپ دونوں بھی۔" امتیاز احمد جھنجلایا۔

"شرم کرو امتیاز احمد! تمہیں بھی چاہیے تھا اسے فوراً" ہی کمرے سے باہر نکال دیتے۔" اماں نے اسے گھرکا۔

"ہاں۔۔۔ ساتھ دو دھکے بھی نہ دے دیتا۔"

وہ خفا خفا سا کمرے سے نکل گیا۔ دادی پیچھے سے آوازیں دیتی ہی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ چچا کے لان میں موجود تھا۔ کرسیوں پر آمنے سامنے براجمان' صالحہ اور امتیاز احمد۔ مصور کی خوب صورت تخلیق جیسے کینوس پر مکمل تھی۔

یہ چچا کا گھر تھا۔ جہاں کی روایات مختلف تھیں۔ چچی چائے لینے اندر گئی تھیں۔ انہیں نہ تو بیٹی پر بے اعتباری تھی اور نہ ہی ہونے والے داماد پر۔

"اب غصہ تھوک بھی دو صالحہ! جانتی تو ہو اماں اور دادی کو۔"

امتیاز کا انداز "مرید" کا سا ہوتا تھا ملتجیانہ بھک منگا سا۔ وہ بھڑکی۔

"بس۔۔۔ میں اب کبھی بھی تمہارے گھر نہیں آؤں گی اور تم نے اپنی اماں سے اجازت لی یا ایسے ہی چلے آئے۔ یہ نہ ہو ماں بہو ادھر چھاپہ ماردیں۔" طنز کیا مگر امتیاز احمد سہہ گیا۔ صالحہ کے معاملے میں اس کی قوت برداشت کمال کی تھی۔

"ہاں۔۔۔ بس ایک ہی بار آنا وہاں' پورے اہتمام کے ساتھ۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"ہنہ۔۔۔" صالحہ کے انداز میں طنز کی آمیزش تھی۔ "میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔ تم کسی دوسری منگیتر کا بندوبست کررکھو۔ میں اس تھانے میں نہیں آنے والی۔"

"تم آؤ تو۔۔۔ تھانے دارنی لگوادوں گا تمہیں وہاں۔" وہ بے اختیار بولا تو صالحہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور جیسے بہت عاجز آکر بولی۔

"مجھے تو معاف ہی رکھو تم۔ ابھی بے عزتی کروا کے آرہی ہوں وہاں سے۔ ابا کو بتادوں تو یہ سارا چکر ہی ختم کردیں گے وہ۔"

امتیاز احمد نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"مذاق میں بھی ایسی بات نہ کیا کرو صالحہ! کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔"

"کاش۔۔۔" صالحہ نے آہ بھر کے آسمان کی طرف دیکھا۔

"تم بھی تھوڑا دھیان کیا کرو نا۔ اگر تم دادی اماں کے پاس بیٹھ کر میرا انتظار کرتیں تو وہ اتنا خفا نہ ہوتیں۔"

امتیاز نے نرم لفظوں میں سمجھانا چاہا مگر وہ جو پہلے ہی سلگ رہی تھی یکدم بھڑک اٹھی۔

"بس۔۔۔ دیکھا! اندر سے تم سب ایک ہی ہو' تنگ دل' تنگ نظر۔ میں کون سی رومانٹک گفتگو کررہی تھی تمہارے ساتھ بند کمرے میں بیٹھ کر۔"

"اوفوہ۔۔۔" امتیاز احمد گڑبڑایا۔

"یہ تھوڑی کہہ رہا ہوں میں یوں اکیلے۔۔۔ کسی لڑکے کے ساتھ۔۔۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ پوری آواز میں چیخی تو امتیاز احمد گھبرا سا گیا مگر وہ بخشنے والی نہیں تھی۔ لال تمتماتا چہرہ تیز تر تنفس' وہ اس پر الٹ پڑی۔

"کتنے لڑکوں کے ساتھ میں یوں اکیلے میں گفتگو کرتی رہی ہوں۔۔۔ اور تم۔۔۔ اکیلے لڑکے۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔" اس کا بس نہ چل رہا تھا "اپنے نہیں تو امتیاز احمد کے بال تو نوچ ہی ڈالے۔ وہ اور گڑبڑایا۔

"تم غلط سمجھیں۔ مطلب دادی اچھا نہیں سمجھتیں۔"

"میں بالکل ٹھیک سمجھتی ہوں امتیاز احمد!" وہ اونچی آواز میں بولی تو انداز تخاطب ہی سے ناراضی ظاہر تھی۔

"تم بس یوں ہی ننھے چوزے بنے اماں اور دادی کے آنچل تلے چھپے رہو مگر میرا دم گھٹتا ہے اس تنگ اور شکی ماحول میں۔ ہر وقت تائی اور دادی چھاپہ مار ٹیم کی طرح تیار بیٹھی رہتی ہیں۔" وہ حد درجہ متنفر تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یاد رکھو امتیاز احمد! اپنی اسی بزدلی کے ہاتھوں تم مجھے گنوا بیٹھو گے۔"
وہ تیزی سے اندر چلی۔ چچی جان چائے لے کر آرہی تھیں۔
"اسے کیا ہوا ہے۔" انہوں نے حیرت سے پوچھا تو وہ جو صالحہ کی بات کی گمبھیریوں میں پھنسا ہوا تھا۔ چونک گیا۔ پھر گہری سانس بھر کے جیسے خود کو ایک سنبھالا دینے کی کوشش کی۔
"ایسے ہی بس۔" چچی نے اس کے آگے چائے کا ایک کپ رکھا اور گھر والوں کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔
مگر امتیاز احمد کے خیالات کے تانے بانے صالحہ ہی کی باتوں سے الجھے ہوئے تھے۔ وہ یوں ہی ہوں ہاں میں جواب دیتا چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

✡ ✡ ✡

ایبہا کو خوف ہی رہا کہ امتیاز احمد فون کر کے اس سے اس بے وقوفی کے متعلق استفسار کریں گے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔
بلکہ اب تو ایک ہفتے سے امتیاز احمد کا فون نہ آنا اس کے لیے پریشانی کا باعث بننے لگا تھا۔
اسے خود پر ہنسی بھی آئی اور رحم بھی آیا۔
ماں کی محبت میں کھیلتی وہ لڑکپن میں پہنچی تو باپ کے خوف اور ذلت آمیز زندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک امتیاز احمد کا سہارا ملا تو اس پر بھی معیز احمد نامی شخص کا سایہ منڈلانے لگا تھا۔
خوف کا سایہ ہر پل "کچھ ہو نہ جائے" کا خوف اور پھر غیر متوقع طور پر امتیاز احمد کی کال آگئی۔
"کیسی ہو؟" سلام دعا کے بعد وہ سرسری انداز میں پوچھ رہے تھے۔ پسیجتے ہاتھ میں ایبہا کا موبائل پھسلنے لگا۔
"جی۔۔ ٹھیک۔"
"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"
"جی۔۔ ٹھیک۔"
"پیسوں کی تو ضرورت نہیں۔ شاپنگ وغیرہ؟"
"جی۔۔ نہیں۔" دل تو چاہا رو دے۔ کہہ دے کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ ایک ہمدرد شانے کی ضرورت ہے۔ جس پر سر رکھ کے وہ آنسو بہا کر دل کا سارا بوجھ ہلکا کر سکے۔
"اچھا۔۔ میں میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔ پھر کال کروں گا۔" بے حد فارمل سا انداز۔
ایبہا کو رونا ہی آگیا۔ یقیناً" وہ اس سے خفا تھے اور بات ایسی تھی کہ ایبہا خود سے شروع کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ اگر وہ خود سے بات کرتے تو شاید وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی جرأت کر ہی لیتی۔ اپنی ذہنی کیفیت ہی بتا دیتی۔ جس کے تحت وہ فون پر ایسی فضول ڈیمانڈ کر بیٹھی تھی۔
انہوں نے کال منقطع کر دی تو ایبہا کتنی ہی دیر موبائل ہاتھ میں لیے ایسے ہی بیٹھی رہ گئی۔
"کیا بات ہے۔ اس میں سے کچھ نکلنے والا ہے؟" حنا نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کی طرف اشارہ کیا تو وہ چونکی۔
"ہوں۔۔"
"اُف۔۔ ایک تو تم غائب دماغ پروفیسر لگتی ہو مجھے۔" حنا جھلائی۔ ایبہا کسل مندی سے بستر پر تکیہ سیدھا کرتی لیٹ گئی۔
"ٹیسٹ کی تیاری کر لی تم نے؟" اس نے حنا سے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

"ہاں۔۔ ڈیزائنر کا سوٹ لے کے آئی ہوں پہننے کے لیے اور اس بار پارلر سے تیار ہوں گی میں۔"
ایبہا مارے حیرت کے سر اٹھائے اسے دیکھنے لگی۔
"یہ کون سا ٹیسٹ ہے۔ جس کے لیے ڈیزائنر کا سوٹ اور پارلر سے تیار ہونا شرط ہے؟"
"کون سا ٹیسٹ؟" حنا نے لاعلمی سے پوچھا۔
"پولیٹیکل سائنس کے ٹیسٹ کی بات کر رہی ہوں۔ تیاری کی تم نے؟" ایبہا نے یاد دلایا۔
"ربش۔" حنا کے منہ میں جیسے کونین گھل گئی۔ "اب تو بڑی ہو جاؤ یار۔ کیا چھوٹے بچوں کی طرح کالج میں آکر بھی ٹیسٹ ٹیسٹ کھیلتی رہتی ہو۔ یہ انجوائے منٹ پلیس ہے مائی ڈیر۔ جتنا پڑھنا تھا وہ اسکول ایج میں ٹیچرز کی کسٹڈی میں پڑھ لیا۔ کالج تو بس انجوائے کرنے کے لیے آتے ہیں۔"
وہ بے زار سی ہو کر کہتی ایبہا کو متحیر کر گئی۔ وہ دھم سے اس کے پاس بیٹھی۔
"میں تو سیفی کے برتھ ڈے کی تیاری کی بات کر رہی تھی۔" بالکل غیر متعلق بات۔
"کون سیفی؟" ایبہا حیرت سے بولی۔
"بھول گئیں۔ میرا بھائی' ہوٹل میں ملی تھیں تم اس سے۔" حنا مسکرائی۔
"اچھا۔" ایبہا نے سر ہلایا۔ اسے واقعی حنا کے بھائی کا نام یاد نہ تھا۔
"ہمارے گھر میں پارٹی ہے اور سیفی نے تمہیں بھی انوائٹ کیا ہے۔" حنا نے مزے سے کہا تو وہ فی الفور بولی۔
"مجھے تو معاف ہی رکھو۔ تم جانتی ہو میں کہیں نہیں جاتی ہوں اور ویسے بھی کل مس عظمیٰ کا ٹیسٹ ہے۔"
"ہاں۔۔ اور تمہارا رباب احسن کے ساتھ کمپی ٹیشن ہے۔ جس میں تمہارا فرسٹ آنا بہت ضروری ہے۔" حنا نے طنز کیا جو ٹھیک سے سیدھا اس کے دل میں جا لگا۔
"میں اس سے جیتنے کے لیے فرسٹ نہیں آتی حنا! بلکہ میں اتنی محنت اس لیے کرتی ہوں کہ فرسٹ آسکوں۔ اپنا گریڈ بہتر بنا سکوں۔ میرا رباب سے نہیں بلکہ اپنی قسمت سے مقابلہ ہے۔"
"مذاق کر رہی تھی بابا' جانتی ہوں میں اچھی طرح۔" حنا فوراً" ہی پینترا بدل گئی۔ پھر اس سے منتیں کرنے لگی۔
"چلو نا یار۔۔ بہت مزہ آئے گا۔ مما سے بھی مل لو گی تب انہیں بھی بہت شوق ہے تم سے ملنے کا۔"
"ایم سوری حنا! میں ضرور چلتی اگر کل اتنا امپورٹنٹ ٹیسٹ نہ ہوتا تو۔" ایبہا نے سراسر بہانہ بنایا۔
"وہ تو صبح ہے۔ برتھ ڈے تو شام کو ہے۔"
"مجھے پرمیشن نہیں ہے حنا! تم جانتی تو ہو۔"
"دوستی میں سب چلتا ہے۔ پہلے بھی تو دو دفعہ تم ود آؤٹ پرمیشن گئی ہو میرے ساتھ۔"
حنا نے خفگی سے کہا تو ایبہا سوچ کر ہی رہ گئی۔ (اور اسی کے بعد میں نے یوں باہر نہ جانے کی قسم کھائی ہے۔)
"حنا پلیز۔ اتنا اصرار مت کرو کہ میں انکار کرتے کرتے شرمندہ ہونے لگوں۔ پھر کبھی سہی۔ آنٹی سے ملنے کا شوق مجھے بھی ہے۔ چلوں گی کبھی تمہارے گھر بھی۔"
ایبہا نے سلیقے سے بات سمیٹ دی۔ حنا اسے گھور کے رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

"ہیلو۔" بے تکلفی سے کہتے ہوئے کوئی دھم سے اس کے سامنے بیٹھا تو معیز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہنستی مسکراتی فریش سی رباب احسن۔
معیز اس کی وہاں موجودگی پر حیران ہوا۔

"ہیلو۔"
"پریشان ہو رہے ہو مجھے یوں اچانک دیکھ کر؟" وہ بے تکلفی سے اپنا موبائل اور گلاسز ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرائی۔
معیز احمد سنبھلا۔ شانے اچکا کر مخصوص انداز میں بولا۔ "ہوٹل کون سا میری ملکیت ہے۔ کوئی بھی آسکتا ہے یہاں۔"
"اور اگر تمہاری ملکیت ہوتا تو؟" رباب نے جملہ پکڑا۔
"تو۔" معیز نے گہری سانس بھرتے ہوئے گویا خود کو پُرسکون کیا۔ پھر اسے دیکھ کر قصداً" مسکرا کر بولا۔ "تو میں تمہیں ضرور کافی کی آفر کرتا۔"
"وہ تو میں اب بھی ضرور پیوں گی۔" رباب ہنسی۔ معیز نے ویٹر کو بلا کر دو کافی کا آرڈر دیا۔
"ویسے معیز! تمہاری یہ بیماری کتنی پرانی ہے؟" وہ سرسری سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ معیز چونکا۔
"کون سی بیماری؟"
"یہی۔ تنہائی کے دوروں والی۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔ معیز ہلکے سے ہنس دیا۔
"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں دوست بہت کم بناتا ہوں۔ اس لیے تنہائی میری ساتھی سمجھ لو۔"
"لیکن اب تمہیں میرے جیسی ایک اچھی دوست مل چکی ہے۔ تم اس بے کار سی تنہائی کو گیٹ آؤٹ کہہ دو تو اچھا ہوگا۔ کیونکہ میرا اس کے ساتھ گزارہ بہت مشکل ہے۔"
رباب نے دھونس بھرے انداز میں کہا۔ پھر وہ دونوں ہی ہنس دیے۔
یہ رباب احسن کا معیز احمد کی ذاتی زندگی میں پہلا قدم تھا۔ جو اس نے بہت اعتماد سے رکھا تھا اور جس پر معیز احمد کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شازی۔۔۔ شازی۔" وہ پورے گھر میں اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ خالہ جی نے کہا تھا وہ اندر ہی ہے۔
صالحہ ایک ایک کمرے میں دیکھتی آواز لگاتی کوریڈور سے مڑی تو زور سے کسی سے ٹکرا گئی۔
"آہستہ۔۔۔ سنبھل کے۔" کسی نے شانوں سے تھام کر نہ صرف اسے سہارا دیا بلکہ بڑے نرم لہجے میں پچکارا بھی تھا۔
وہ بہت دلکش سی خوشبو کے حصار میں گھری ماتھے پہ لگنے والی چوٹ سہلا رہی تھی۔ مردانہ آواز پر چونکی اور پھر شانوں پہ سلگتے لمس کا احساس کرتے ہی تڑپ کر پیچھے ہٹی۔
ہرنی جیسی آنکھوں میں وحشت سی اتری تو مقابل کو مخمور ہونے میں پل بھر ہی لگا۔

وہ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے
ہم ان کو اور پھر بار بار ان کو دیکھتے ہیں

شعر کو اپنے مطلب میں بگاڑ کر وہ ذرا سا جھک کر آداب بجا لایا تھا۔
صالحہ کے دل میں زور سے گدگدی سی ہوئی۔ وہ خوش شکل، خوش لباس سا شخص خوش گفتار بھی تھا۔
"شازیہ کہاں ہے؟"
وہ اسے جانتی نہ تھی اور نہ ہی اس سے پہلے صالحہ نے اس شخص کو کبھی شازیہ کے گھر دیکھا تھا۔ مگر بے اختیار ہی اس سے مخاطب ہونے کو جی چاہا۔

"ارے۔ ہم تو وہاں ہیں جہاں سے خود ہم کو ہماری خبر بھی نہیں مل رہی اور آپ شازیہ کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بڑے انداز سے بولا تو صالحہ جیسی منہ پھٹ اور آزاد طبع لڑکی کے ہاتھوں میں بھی پسینہ اتر آیا۔
"آپ کون ہیں؟"
"ہائے۔" اس نے جیسے سرد آہ بھری۔ پھر شرارت سے بولا۔ "کبھی ہم مراد صدیقی ہوا کرتے تھے مگر اب دل چاہ رہا ہے کہ تخلص کے طور پر آگے بے دل کا اضافہ کرلیں۔"
"صالحہ۔" شازیہ کہیں سے برآمد ہو ہی گئی تھی۔ جوش سے پکارتی چلی آئی۔ صالحہ کے سامنے کھڑے مراد کو اس نے گھورا۔
"آپ کیوں یہاں کھڑے ہیں جناب؟"
"میں تو جا ہی رہا تھا یار! یکایک زمین نے پاؤں جکڑ لیے۔" وہ ایک معنی خیز نگاہ خاموش کھڑی صالحہ پر ڈالتے ہوئے بولا۔
"اوفوہ۔ جائیے نا۔ اماں کو ضروری کام تھا کوئی۔" شازیہ نے اسے باہر دھکیلا۔
"یہ کون ہے؟" شازیہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے صالحہ نے پوچھا۔
"اماں کے بھانجے ہوتے ہیں دور پار کے۔ مگر چونکہ اماں سے محبت بہت ہے تو باقاعدگی سے ملنے چلے آتے ہیں۔" شازیہ نے بتایا، پھر پوچھنے لگی۔
"تمہیں تو کچھ نہیں کہہ دیا۔ دراصل بہت آزاد خیال اور منہ پھٹ سے ہیں۔"
صالحہ کو ہنسی آئی۔ "یعنی میرے جیسے ہی ہیں۔"
"ارے ہاں۔ بالکل۔" شازیہ بھی ہنسی تھی۔
"تم سناؤ۔ تمہارے امیت کا کیا حال ہے؟" صالحہ نے منہ بنایا۔
"کچھ مت پوچھو۔ وہ تو اماں اور دادی کے پلو سے بندھا بیٹھا ہے۔ نفرت ہوتی ہے مجھے اس گھٹے ہوئے ماحول سے۔" اس کی بے زاری حد سے سوا تھی۔ شازیہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ اتنا پیار کرنے والا بندہ ہے وہ۔ قدر کرو اس کی۔"
"ہنہ۔ اتنا دودھ کا دھلا پیار مجھے نہیں چاہیے۔" صالحہ نے سر جھٹکا۔ پھر بحث کرنے والے انداز میں بولی۔ "مرد کے پیار میں عورتوں جیسا خوف اور جھجک نہیں ہوتی۔ ایک بیباکی ہوتی ہے۔ نڈرپن ہوتا ہے۔"
شازیہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"شرم کرو صالحہ! اس کی عزت ہو تم۔ چچا کی بیٹی اور منگیتر بھی۔ مردانہ بے باکی تو وہ دکھاتے ہیں جنہوں نے فقط چار دن کی دوستی کرنی ہو۔ جس نے پوری زندگی کا ساتھ نبھانا ہو، وہ موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔"
"تائی اماں اور دادی کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟ اسے امیت کہہ دیا تو غصہ۔ اس کے کمرے میں جا کے بات کرلی تو نعوذ عائد۔ قسم سے ایسے وارد ہوتی ہیں جیسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے چھاپہ مار رہی ہوں۔" وہ سخت بے زار تھی۔
"شادی ہو جانے دو، پھر دیکھنا کتنے چھاپے پڑتے ہیں تمہارے کمرے پر۔" شازیہ نے اطمینان سے کہا۔
"ہنہ۔ پھر کس کی جرات۔" وہ تنکی۔
"وہی تو۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے صالحہ۔۔۔ ابھی تم دونوں کے درمیان کوئی شرعی بندھن تو ہے نہیں۔ اس لیے وہ لوگ اتنا خیال کرتے ہیں۔ بعد میں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔" شازیہ مسکرائی۔

"بہر حال۔ مجھے یہ سب پابندیاں بالکل بھی نہیں پسند۔ میں زندگی کو اپنی مرضی سے اپنے طور گزارنا چاہتی ہوں۔ میں زندگی کے اس دور کا بھی لطف اٹھانا چاہتی ہوں مگر یہاں تو اسے منگیتر سمجھنا ہی گناہ ہے۔"
"وہ اس لیے میری جان کہ منگنی کوئی شرعی رشتہ تو ہے نہیں۔ یہ تو بس ایک نشانی ہے کہ مزید رشتے نہ آئیں لیکن اسے رومانوی تعلق کی بنیاد بنا لینا تو سراسر ناعاقبت اندیشی ہے۔"
شازیہ بہر طور اس سے زیادہ سمجھ دار اور حقیقت پسند لڑکی تھی۔ صالحہ نے سر جھٹکا۔
واپسی پر گیٹ کے پاس دوبارہ مراد صدیقی سے ملاقات ہو گئی۔ اسے دیکھ کر وہ شازیہ سے بے تکلفی سے بولا۔
"بھئی... تم نے تعارف تو کروایا نہیں مہمان سے ہمارا۔"
"کروا دیا ہے مراد بھائی۔" شازیہ مسکرائی۔
"اور یہ... ؟" اس کا اشارہ صالحہ کی طرف تھا۔
"یہ میری دوست ہے صالحہ۔" شازیہ نے بتایا۔
"چلو اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ ورنہ میں تو پرستان کا رستہ بھولی کوئی پری سمجھ بیٹھا تھا انہیں۔" اس کی شرارتی نگاہ صالحہ کے ان چھوئے روپ پر ٹکی تھی۔
صالحہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ڈریں مراد بھائی... منگنی شدہ ہے یہ۔" شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار بولا۔
"تو کیا ہوا... شادی شدہ تو نہیں ہے نا۔"
"میں چلتی ہوں شازیہ!" وہ سنجیدہ سی ہو کر شازیہ سے بولی۔ پچھلی ہی گلی میں اس کا گھر تھا۔
"ارے ناراض ہو گئیں کیا؟" وہ پریشان سا ہوا۔ "اکیلی جائیں گی۔ کہاں جانا ہے میں ساتھ چلوں۔ چھوڑ دیتا ہوں۔"
"ہاں صالحہ... شریف آدمی ہیں۔ خیریت سے تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔ میری گارنٹی ہے۔"
شازیہ نے کہا تو وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ وہ پیچھے سے تیز قدموں چلتا اس کے ہم قدم ہوا تھا۔
"آپ ناراض ہو گئی ہیں کیا؟"
"میرا آپ سے کیا واسطہ...؟" صالحہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔
"واسطہ ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔"
وہ برجستہ بولا تو صالحہ کا دل یکدم تھم پڑا مگر پھر اس نے اپنے قدم تیز کر لیے۔
"آپ یہاں سے لوٹ جائیں۔ میرا گھر آ گیا ہے۔"
وہ اس کی جانب دیکھے بغیر آگے بڑھی اور گلی کا موڑ مڑ گئی۔ مراد صدیقی وہیں جما کھڑا جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

معیز کے کئی بار صفا چٹ انکار کے بعد بھی سفینہ نے رشتے والی سے تین چار لڑکیوں کی تصویریں منگوائی تھیں۔
"یہ دیکھو ذرا... اس کا رنگ ذرا دبتا ہوا ہے مگر یہ تینوں ہی اچھی ہیں۔"
سفینہ نے تصویریں ارزہ اور زارا کے آگے کیں تو زارا سے پہلے ارزہ نے جھپٹ لیں۔
"یہ لیں... ادھر ایک کی ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے اور ادھر بھائی کو اکٹھی تین تین۔"
"بے وقوف... تینوں سے تھوڑی کراؤں گی۔ ان تینوں میں سے میرے بیٹے کو جو پسند آئے گی اسے دیکھ لیں

گے۔" سفینہ نے پیار سے کہا۔

"اور جسے بھائی ریجیکٹ کریں گے۔ اسے تم دیکھ لینا۔" زارا نے کڑوے کریلے جیسا لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا۔ وہ تلملایا۔

"مطلب۔ میرے لیے بچی کھچی۔"

"اب اگر تمہارے جذبات فنا ہو چکے ہوں تو تصویریں مجھے دے دو۔" زارا نے اسے جلایا تو اسے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے ایزد نے تصویریں سینٹر ٹیبل پر پٹخ دیں۔ زارا ہنستے ہوئے تصویریں اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"ویسے ماما۔ بھائی کے لیے ایک اور لڑکی بھی ہے میری نظر میں۔"

زارا نے تصویریں دیکھتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا تو وہ چونکیں۔

"کون۔؟" تصویریں ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ مسکرائی۔

"وہ ان تینوں سے زیادہ خوب صورت بھی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے بھائی میں انٹرسٹڈ بھی ہے۔"

"کس کی بات کر رہی ہو تم؟" سفینہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"رباب کی بات کر رہی ہوں ماما۔" زارا کے لہجے میں جوش سا اتر آیا۔

"لو۔ ایک اور کو کھڈے لائن لگا دیا۔" ایزد بے ساختہ بولا تھا۔ سفینہ چونکیں۔

"تم سے معیز نے کچھ کہا؟" بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں ماما۔ نہ بھائی نے' نہ رباب نے۔ لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ رباب ان میں انٹرسٹڈ ہے۔" زارا نے یقین سے کہا تو سفینہ ہلکے پھلکے انداز میں بولیں۔

"چلو۔ معیز سے بات کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ پھر جو وہ کہے۔ محض رباب کے انٹرسٹ سے تو بات نہیں بن سکتی۔" زارا طمانیت سے مسکرا دی۔

شاید رباب اور معیز کے رشتے کا طے ہو جانا اس کے اور سفیر کے رشتے کی مضبوطی کے لیے اچھا ہو۔ یہ زارا کا ذاتی خیال تھا۔

"ماما جانی۔ ایک کنوارہ بے چارہ ادھر بھی بیٹھا ہے۔ مگر اس کے انٹرسٹ میں کوئی بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے۔" ایزد نے خفگی سے کہا تو انہوں نے مسکراہٹ دبائی۔

"سوری بیٹا جی! جب تک معیز کی بات نہیں بن جاتی تمہاری بات کوئی نہیں سنے گا۔"

"بالکل ظالم ماں لگ رہی ہیں جو بڑی بیٹی کی شادی نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹی کو بھی کنواری رکھ لیتی ہے۔" وہ یوں ہی الٹا پلٹا بولتا تھا۔

زارا اور سفینہ دونوں کو ہنسی آگئی۔

"دیکھنا زارا تم۔ اتنی دیر سے کریں گی تو دو کروں گا۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کے بولا تو ارادہ مصمم تھا۔

☆ ☆ ☆

رباب کی ہمت اور مستقل مزاجی کی وجہ سے معیز جیسا آدم بے زار اور اکھڑ (بن جانے والا) شخص جیسے زندگی کی طرف لوٹنے لگا اور اس کی یہ تبدیلی عون کی نگاہوں سے کیونکر چھپی رہ سکتی تھی۔

"کیا بات ہے میرے یار! بڑے چمک دمک رہے ہو۔ کوئی نیا سرف استعمال کر رہے ہو آج کل؟" اس کا اپنا ہی انداز تھا۔ معیز مسکرا دیا۔

"اگر کہوں ہاں تو۔؟"

"تو میں کہوں گا مبارک ہو۔ میرا یار زندہ باد۔" عون فی الفور بولا۔ معیز نے کچھ سوچا اور پھر نپے تلے انداز میں بولا۔

"بس یار۔ میں نے سوچا کہ بے نام سی ٹینشن اور بے کار سی چند بری یادوں میں الجھ کر زندگی برباد کرنے کا فائدہ؟ کچھ بھی نہیں۔ غلطی ہماری زندگی کی کتاب کا ایک صفحہ ہوتی ہے عون! اس کے لیے پوری کتاب کو پھینک دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ تو بس یہی سمجھ لو کہ میں ایک بے کار صفحے کے لیے پوری کتاب کو برباد نہیں کر سکتا۔"

"شکر اللہ۔" عون نے ہاتھ پھیلا کر اوپر دیکھا تو معیز ہنس دیا۔

"یہی میں تمہیں کہتا تھا یار! زندگی میں کبھی اپنے کیے ہوئے فیصلوں پر مت پچھتاؤ۔ ہاں سبق حاصل کرو' آگے بڑھنے کے لیے۔ مگر اس غلط فیصلے پر بال کھول کے تاعمر ماتم کرنا نری بے وقوفی ہے۔"

"اچھا۔ اب زیادہ سقراط بقراط بننے کی ضرورت نہیں۔ میں تیرے ہوٹل میں فری کا لنچ کرنے آیا ہوں۔ اپنا سنڈے برباد کرنے نہیں۔"

معیز نے اسے ٹہلایا۔ اس قدر ثقیل موضوع ہضم نہ ہو رہا تھا۔

"تو اب تک جناب نے کون سا لنچ ڈنر پے منت کر کے کھایا ہے۔ مجھے تو حسرت ہی رہے گی تجھ سے کچھ کمانے کی۔"

عون نے اس پر چوٹ کی تھی۔ معیز نے ہنستے ہوئے والٹ نکال کے ٹیبل کی سطح پر رکھا۔

"رہنے دے' رہنے دے' جمع کر رہا ہوں' ایک ہی بار لمبا چیک نکلواؤں گا۔" وہ یوں ہی ہمیشہ کہتا تھا۔

"تم بتاؤ۔ شادی کب کر رہے ہو؟"

معیز نے بڑے عرصے کے بعد عون کو اس موضوع پر کریدا۔ ورنہ تو جب سے اس نے خود کو اپنے آپ میں سمیٹا تب سے دوسروں کی زندگی میں دخل اندازی کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

عون نے گہری سانس بھری اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

"کیا بتاؤں یار! اپنی غلطی ہے جو ڈنڈے کی طرح سر پہ برس رہی ہے۔ ثانی کی بچی تو وہ سب بھولنے کو تیار ہی نہیں۔ اب تم ہی بتاؤ۔ میرا کیا قصور اس میں۔ بچپن کی منکوحہ۔ پسماندہ چھوٹے سے شہر میں پلی بڑھی گرمیوں کی چھٹیاں گاؤں کی حویلی میں گزارنے والی۔ میں سالوں بعد بڑی چاہت سے اسے دیکھنے گیا تو مٹی کا فرش لیپ رہی تھی۔ بالوں میں مٹی' منہ پہ مٹی۔ میں تو اس کا تعارف سنتے ہی الٹے پیروں بھاگا۔ آتے ہی امی کے سامنے شادی سے انکار کیا۔ ابا سے لعنتیں کھائیں۔ ہائے' پھر آپی کی شادی پہ اسے دیکھا۔ کیا رنگ و روپ تھا اور کیا غرور۔ سب سے جدا۔ اس لڑکی نے ایک نظر بھی مجھ پہ نہیں ڈالی اور میری ہر نظر فقط اسی تک گئی۔ میں نے قسم کھائی شادی کروں گا تو اسی حور شمائل سے۔ امی سے بات کی تو وہ ہنسیں۔ ابا کو بتایا اور پھر سب گھر والوں کو۔ خوب مذاق بنا میرا۔ وہ ثانیہ ہی تھی۔ ثانی۔ میری بچپن کی منکوحہ۔ اب بتاؤ۔ میں اس کے پیچھے مجنوں بنا پھر رہا ہوں اور وہ مجھے گھاس ڈالنے پہ بھی آمادہ نہیں۔"

عون کی داستان خاصی دل گیر تھی مگر معیز کو ہنسی آرہی تھی سن کر۔

"یعنی تو اپنی ہی بیوی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

"میں تو ہو گیا ہوں مگر وہ اب میرے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کے بیٹھ گئی ہے۔" عون نے منہ لٹکایا۔

"تو بڑوں سے کہہ کر رخصتی کروا لو۔ نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔ بھگا کے بھی لا سکتے ہو۔ سوری' اٹھا کے۔"

"ہاں۔ اٹھا کے لانے والا خیال تو بہت رومانٹک ہے۔ مگر یہ فقط خیال ہی ہے۔ وہ پوری ہل کو خان ہے۔"

عون نے باچھیں پھیلائیں۔
"تو تو گیا عون عباس، آ مر گیا ایک لڑکی پر۔" معیذ نے گویا اس کی مردانگی کو للکارا مگر وہ ہنس دیا۔
"مردیوں ہی کسی پہ نہیں مرمٹا کرتے معیذ احمد! اس کے لیے لڑکی میں کوئی خاصیت ہونا ضروری ہوتا ہے۔"
"اور اس میں کیا خاصیت ہے؟" معیذ نے بے اختیار پوچھا۔
عون نے آہ بھری۔
"وہ میری پہلی نظر کی محبت ہے یار!"
"اور وہ کون سی نظر تھی جو فرش کی لپائی کے دوران پڑی تھی؟" معیذ نے طنز کیا۔
"وہ اصل روپ تھوڑی تھا اس کا۔ اصلیت دیکھ کے تو میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ پڑھی لکھی سیقے والی۔ رشتوں کو نبھانے والی بس' میری مت ماری گئی تھی۔ الٹے پیروں دوڑا تھا۔"
"اب تو ناک سے لکیریں کھنچوائے گی وہ۔"
"ہاں... بات چل نکلی ہے۔ اب دیکھیں کہاں تک پہنچے۔" اس نے آہ بھر کے کہا تو معیذ ہنسنے لگا۔

☆ ☆ ☆

شازیہ کے گھر آنا جانا تو بچپن ہی سے تھا مگر ایک حد میں رہ کر لیکن جب سے مراد صدیقی آیا' صالحہ روزانہ دن میں ایک چکر شازیہ کے گھر کا ضرور لگاتی اور شازیہ نادان نہیں تھی۔
"منگنی ہو چکی ہے تمہاری صالحہ! ان چکروں میں مت پڑو' آگ کا کھیل ہے یہ۔"
اس نے مخلص بن کر سمجھایا مگر مراد کے خوب صورت لفظوں نے اس کے اردگرد جال سا بُن دیا تھا۔ جسے وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔
ایسے میں امتیاز احمد کہیں دور رہ گیا۔
مراد صدیقی کی آزاد خیالی اسے بہت بھاتی۔ وہ تعریف کرنے میں کنجوس تھا اور نہ پیار جتانے میں۔
"بچپن کی منگنیاں کھیل ہوا کرتی ہیں شازی! تم نے دیکھا نہیں ہمارے بڑے اسے کھیل ہی تو سمجھتے ہیں رعب' پابندیاں' ہنہ۔" وہ تنفر سے بولی۔
"دیکھو۔ امتیاز احمد کا ایک فیملی بیک گراؤنڈ ہے۔" مراد بھائی تو اکیلے' چھڑے چھانٹ' کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ پیسہ ہے' جائیداد بھی ہے تھوڑی بہت۔ مگر کوئی بڑا نہیں ہے سر پر۔ تب ہی تو بنجاروں کی طرح دونوں یہاں اور دونوں وہاں ڈیرے ڈالے رہتے ہیں۔"
شازیہ نے دبے لفظوں میں سمجھایا۔ مگر جو سمجھنا ہی نہ چاہے اسے کون سمجھا سکتا ہے؟ تب شازیہ نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔
وہ مراد صدیقی کے ساتھ بیٹھی گھنٹوں باتیں بگھارتی رہتی یا پھر مسحور سی اس کی گفتگو کا رس اپنے کانوں میں اتارتی رہتی۔
کب دل کے آئینے سے امتیاز احمد کی شبیہہ دھندلائی اور کب مراد صدیقی وہاں براجمان ہوا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

☆ ☆ ☆

زارا نے جو بات سفینہ کے دماغ میں ڈالی' وہ انہیں بھی بھائی تھی۔ واقعی اگر معیذ سے رباب کی شادی ہو جاتی تو سسرال میں زارا کے قدم مضبوط ہو جاتے' کیونکہ رباب گھر والوں کی بہت لاڈلی تھی۔

اسی سوچ کو لیے وہ امتیاز احمد کے پاس آ بیٹھیں۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اب معیز کی شادی کے متعلق بھی کوئی پیش رفت ہونی چاہیے۔" سفینہ نے دوستانہ انداز میں بات شروع کی تو انہوں نے چونک کر پہلے انہیں دیکھا۔ پھر ہاتھ میں تھامی کتاب بند کر کے رکھ دی اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ معیز پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش مت کرو۔ اسے اس ضمن میں اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے دو۔" وہ مضطرب لہجے میں بولے تو سفینہ مسکرائیں۔

"وہ میرا بیٹا ہے امتیاز احمد! تم دیکھنا بہت خوش ہوگا میرے فیصلے سے۔"

"اور تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" انہوں نے چبھتے انداز میں پوچھا۔

"میں نے سوچا ہے کہ معیز کے لیے رباب کا رشتہ لے لیتے ہیں۔"

"رباب کون؟" وہ چونکے۔

"ارے۔ زارا کی نند۔"

"نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ تمہارا یہ فیصلہ راست ہے۔" وہ بے اختیار بولے۔

"کیا مطلب۔ اچھی فیملی ہے اور لڑکی بھی معیز کے جوڑ کی ہے۔" سفینہ کو ان کے اعتراض پر اعتراض ہوا تھا۔

"مگر میں وٹے سٹے کی شادی کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا سفینہ! ایسا فیصلہ مت کرو جس سے کل کو زارا کی میرڈ لائف ڈسٹرب ہو۔" امتیاز احمد سنجیدہ تھے۔

"آپ فکر مت کریں۔ یہ سوچ مجھے زارا ہی نے دی ہے۔" وہ مسکرائیں۔

"زارا ابھی بچی ہے سفینہ۔ رشتوں کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتی۔ اسے نہیں پتا کہ کراس میرج کن قباحتوں کو جنم دیتی ہے۔"

امتیاز احمد گویا اس رشتے کے حق میں نہیں تھے۔ مگر سفینہ کا ان کے انکار کو اہمیت دینے کا قطعاً کوئی موڈ نہ تھا۔

"چلیں۔ زندگی تو معیز کو گزارنی ہے۔ اس سے پوچھوں گی پھر جو وہ کہے۔"

"تم کیوں اسے ڈسٹرب کرتی ہو سفینہ! ابھی اس کی یونیورسٹی کا فائنل ایر ہے۔ بزنس سنبھالنا ہے اس نے۔"

امتیاز احمد کو جانے کیا بے چینی لگی تھی۔

"سب ہو جائے گا' لوگوں کے نکمے بیٹے بیاہے جاتے ہیں۔ ہمارا تو ماشاء اللہ سے کامیاب بیٹا ہے۔" سفینہ مطمئن تھیں۔

"بھئی۔ جیسی تمہاری مرضی۔ تم جانو اور تمہارا بیٹا۔ ہمیں تو بس شادی میں بلا لینا۔"

وہ جیسے خفا سے ہوئے مگر ان کی خفگی سے قطع نظر سفینہ کسی اور ہی جوڑ توڑ میں لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شام کو ہی انہوں نے معیز احمد کو گھیر لیا۔ ان کی بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

"تو بے ماما۔ شادی کا توفی الحال سوچیے بھی مت۔"

"چلو منگنی ہی سہی۔ میرے دل کو تسلی ہو جائے گی۔" سفینہ کو بڑے عرصے بعد اس کا موڈ صحیح لگا تھا مگر اس نے اس کے لیے بھی انکار کر دیا۔

"سب کچھ کروں گا ماما آپ کی مرضی سے۔ لیکن فی الحال مجھے موقع تو دیں اسے سمجھنے کا۔"

اور سفینہ کے لیے یہی بات قابل اطمینان تھی کہ معیز ہمیشہ کی طرح شادی کے نام پر اکھڑا نہیں تھا۔ بلکہ اس نے رباب کو جاننے سمجھنے کے لیے وقت مانگا تھا' جو انہوں نے بخوشی دے دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ چچا کے گھر آیا تو صالحہ نے اسے ذرا بھی لفٹ نہ کروائی تھی۔ یوں ادھر ادھر کاموں میں مصروف تھی جیسے انہیں جانتی ہی نہ ہو۔ امتیاز احمد کو اس کے اس روپ اور انداز نے بھی مزہ دیا۔

کہ حسن کی تو ہر ادا ہی بے مثال لگا کرتی ہے۔

وہ چائے اس کے آگے رکھ کے جانے لگی تو چچی تخت پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں۔

امتیاز نے اس کا ہاتھ کلائی سے تھام لیا۔ صالحہ نے کھلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"کیا ہے؟" لٹھ مار انداز۔

"شش۔" امتیاز احمد نے چچی کے متوجہ ہو جانے کے ڈر سے اس کی کلائی چھوڑی اور بے ساختہ اسے گھورا۔

"ہنہ۔ بس۔ یہ ہے تمہاری بہادری۔ کبھی یہی ہاتھ اپنی اماں کے سامنے بھی پکڑا کرو نا۔ اکیلے میں کیوں فائدہ اٹھاتے ہو۔" وہ پھنکاری اور امتیاز کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"تم بات کو خوامخواہ بڑھا رہی ہو صالحہ!"

"بات ہی تو ختم کرنا چاہتی ہوں میں۔" وہ عجیب سے انداز میں بولی اور کچن میں چلی گئی۔

امتیاز احمد نے چند لمحے اس کی بات اور انداز پر غور کیا اور پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچ کر اٹھا اور کچن میں آ گیا جہاں وہ برات میں آٹا نکال رہی تھی۔

"یہ ناراضی کب تک چلے گی صالحہ؟" وہ سنجیدہ تھا۔

"یہ ناراضی نہیں ہے امتیاز احمد! مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے تائی اماں اور دادی کا رویہ برداشت نہیں ہوتا۔"

"شادی تمہاری مجھ سے ہونی ہے اماں یا دادی سے نہیں اور پھر تم یہ سوچا کرو کہ شادی کے بعد ان کا رویہ بدل جائے گا۔"

امتیاز احمد کے انداز میں مخصوص نرمی اور توجہ رچی تھی۔ وہ صالحہ کی جذباتی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ فوری فیصلے اور فوری عمل پر یقین رکھنے والی صالحہ ضدی بھی بہت تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ کرے یا اماں اور دادی کے خلاف دل میں بغض پال لے۔

مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صالحہ کی سلطنت دل تبدیل ہو چکی ہے اور اب وہاں بادشاہ کی سیٹ پر کوئی اور براجمان ہو چکا تھا۔

صالحہ شادی والی بات پر کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر آٹا گوندھنے لگی۔

مگر اس سے اگلے روز جب امتیاز احمد نے واپس لاہور جانا تھا تب وہ ہنستی کھلکھلاتی اسے خدا حافظ کہنے آ پہنچی۔

اماں کے ہاتھ کا بنا ناشتا کرتا امتیاز احمد دادی سے بھی خوب لاڈ اٹھوا رہا تھا۔

اماں اور دادی دونوں ہی نے یوں بے تکلفی سے صالحہ کا آنا اور امتیاز احمد کے ساتھ بیٹھ جانا پسند نہ کیا تھا۔

"ارے واہ۔ پراٹھا۔" صالحہ نے اس کی پلیٹ میں رکھے پراٹھے کا نوالہ توڑا اور اسی کے سالن میں ڈبو کر منہ میں رکھ لیا۔

"ہائیں۔۔۔ ارے حد ہوتی ہے صالحہ! وہاں سے دوسری پلیٹ پکڑ لے بیٹا! یہ کیا کہ اسی کی پلیٹ سے نوالے بھرنے شروع کردیے۔"

اماں شریعت کا دامن تھامے رکھتی تھیں۔

"کیوں۔۔۔ اس کو کوئی بیماری ہے کیا جو مجھے بھی لگ جائے گی؟" وہی نڈر اور پُراعتماد سا انداز۔

"کوئی بات نہیں اماں!" امتیاز احمد کے دل میں تو صالحہ کو دیکھتے ہی طمانیت اتر آئی تھی۔ نرمی سے بولا مگر اماں تو جیسے پھٹ ہی پڑیں۔

"خبردار امتیاز احمد! ہمارے گھر کی کچھ اقدار ہیں۔ خبردار! جو تم نے اس دیدہ ہوائی کی حمایت لینے کی کوشش کی ہو تو۔"

"اماں۔۔۔" وہ تو ششدر ہی رہ گیا۔ اماں اس بُرے طریقے سے تو صالحہ سے کبھی بھی نہ بولی تھیں۔

اور صالحہ۔۔۔ لمحہ بھر کو تو وہ ساکت ہی رہ گئی۔ دادی جو بھی کہتیں اسے وہ دوسرے کان سے اڑا دیتی تھی مگر اماں کا یہ انداز؟ ان کی سرد مہری تو اسے پتا ہی تھی۔ مگر ہونے والی ساس اس سے بری طرح متنفر ہیں' یہ اسے اندازہ نہ تھا۔

آج تو وہ اپنے دل اور جذبات پر پاؤں رکھتی امتیاز احمد کی طرف چلنے کی ایک کوشش کے طور پر یہاں آئی تھی صدق دل سے۔

مگر شاید۔۔۔ وہ امتیاز احمد کی قسمت میں نہ تھی۔

"منگیتر ہو مگر ہو تو نامحرم نا۔ کس کتاب میں لکھا ہے کہ نامحرم کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا جائز ہے۔" اماں کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو رہا تھا۔

امتیاز احمد نے صالحہ کو ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھتے دیکھا۔ وہ سختی سے لب بھینچے ہوئے تھی۔ جیسے ایک بھی لفظ نہ بولنے کی قسم کھائی ہو۔

"میں بات کرتی ہوں اس کے باپ سے۔" دادی بھی ناراض تھیں۔ "گھر میں کیوں نہیں ٹکتی تو۔ شادی ہونی ہے تیری اس گھر میں۔ یہی سوچ کے پردہ کرلیا کر۔"

اس نے ایک نگاہ امتیاز احمد پر ڈالی۔

صرف ایک نگاہ۔

بے حد کٹیلی بہت کچھ جتاتی ہوئی۔

وہ اماں اور دادی کے سامنے ان کے شرعی جواز کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ اگرچہ دل سے اسے صالحہ کی اس بے تکلفی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ اٹھ گئی۔

"بیٹھو نا۔۔۔" امتیاز احمد خود کو روک نہیں پایا۔ بے ساختہ بولا تو اماں نے تیزی سے کہا۔

"رہنے دو تم۔ اچھا ہے۔ اگر اسے اب کچھ عقل آگئی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی یہاں کے طور اطوار سیکھ لے گی تو فائدے میں رہے گی۔"

"چلو۔۔۔ چل کے میرے ساتھ ناشتا کرو تم۔" دادی کو خیال آہی گیا تھا۔

"کرلیا دادی۔۔۔ پیٹ بھر گیا آج تو۔"

وہ نارمل سے انداز میں اللہ حافظ کہتی تیزی سے باہر کی طرف بڑھی تو امتیاز احمد بے اختیار اٹھا۔

اماں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو ایک تنبیہی دباؤ کو محسوس کرتے ہوئے وہ وہیں بیٹھا رہ گیا۔ جبکہ دل تو کہ صالحہ کے قدموں کے ساتھ ہی لپٹا جارہا تھا اور صالحہ۔۔۔

وہ دروازے سے نکلنے تک اپنے پیچھے امتیاز احمد کی بلند ہوتی آواز کی منتظر رہی۔

وہ رک جائے گی۔ پلٹ آئے گی۔ مراد صدیق کی طرف کھلنے والا روزن بند کردے گی مگر نہ تو اسے اپنے پیچھے امتیاز احمد کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور نہ ہی اس کی بے تابانہ پکار۔

وہ نم آنکھوں اور سخت دل کے ساتھ اس گھر سے نکلی تھی اور شاید امتیاز احمد کی زندگی سے بھی۔

☼ ☼ ☼

وہ مسلسل امتیاز احمد کو کال کررہی تھی مگر وہ اٹینڈ نہیں کررہے تھے۔

وہ سردیوں کی شاپنگ کرکے آئی تو حنا نے اس کے پرس میں روپے دیکھ کر اسے بھی کھلے دل سے شاپنگ کروائی۔ مگر اس کے نتیجے میں اب وہ خالی پرس بیٹھی تھی۔

فائنل ایگزیمز سے پہلے سب لڑکیاں فری ہونے والی تھیں مگر اس سے پہلے فیس جمع کروانی تھی اور ہاسٹل کے ڈیوز بھی ادا کرنے تھے۔

حنا اس کی رونی صورت دیکھ کر خوب ہی ہنسی۔

"کون سی کنگال ہو تم۔۔۔ گھر فون کرو یار! ابھی کے ابھی بڑی سی رقم منگوالو۔"

مشورہ مفت تھا۔ ابیہا ہونٹ کاٹ کے رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ امتیاز احمد اس کے اکاؤنٹ میں اس ماہ پوری رقم بھجوا چکے تھے اور پہلے کچھ حنا نے ادھار لے لیے اور اب شاپنگ' وہ گویا اپنی اس ماہ کی پوری پونجی لٹا چکی تھی۔ حنا سے تو خیر کیا مانگتی' اس نے دل کڑا کرکے امتیاز احمد ہی کو کال ملائی مگر وہ کال ریسیو نہیں کررہے تھے۔ بلکہ مسلسل لائن کاٹی جاتی رہی۔
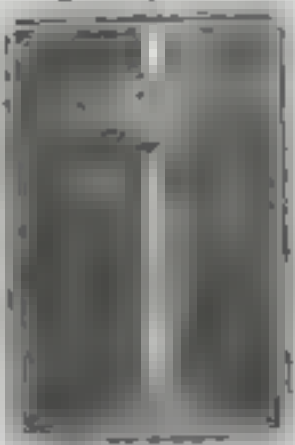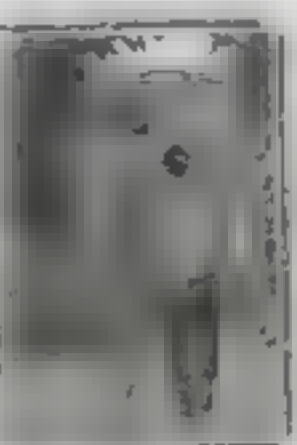
یعنی وہ کال ریسیو ہی نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

ابیہا کا دل پریشان ہونے لگا۔ پچھلی کال میں مختصر سی بات اور اب کال اٹینڈ نہ کرنا۔ کیا معیز احمد اپنی چال چل

چکا تھا؟

اس کی دھڑکن سست پڑنے لگی۔ پھر اچانک ہی اس کی کال ریسیو کرلی گئی۔

"ہیلو۔ ابہا بات کر رہی ہوں میں۔ آپ کال اٹینڈ نہیں کر رہے تھے تو مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔"

ابہا نے کال ملتے ہی بے تابانہ بولنا شروع کردیا۔ پھر چپ ہوئی تو ایک سناٹا سا چھا گیا۔ شاید وہ ابھی بھی خفا تھے۔

"ہیلو۔ ناراض ہیں آپ ابھی تک۔ وہ تو اس دن بس غصے میں میں نے پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیا اور آپ کے بیٹے نے آپ سے پتا نہیں کیا کہہ دیا۔" وہ شرمسار سی تھی۔

"بہت اچھے۔ یہ سب بھی میں والد محترم سے کہہ دوں گا اور کچھ؟"

وہ معیز احمد ہی تھا۔ ابہا کا دل رکتے رکتے بچا مگر پھر اس نے بڑی ہمت سے خود کو سنبھالا۔ اسے معیز احمد کا سامنا کرنا تھا۔ اپنی زندگی بدلنے کے لیے۔ مقابلہ کرنے کے لیے۔

"مجھے آپ کے والد صاحب ہی سے بات کرنی ہے۔"

"آخر تم ہماری زندگی میں سے نکل کیوں نہیں جاتیں۔" وہ جیسے ضبط کھو کر پھنکارا تھا۔

ابہا کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ مگر لہجے کی کمزوری کا مطلب تھا معیز احمد سے مات اور آج وہ ہمت کرنا چاہتی تھی۔ معیز احمد پر واضح کرنا چاہتی تھی کہ وہ امتیاز احمد کے فیصلے کی پابند ہے نہ کہ معیز احمد کے۔

"آپ مجھے یہ آرڈر نہیں کرسکتے' کیونکہ میں آپ لوگوں کی زندگی میں آپ کے والد محترم کی خواہش پر آئی ہوں۔ اپنی یا آپ کی خواہش پر نہیں۔"

وہ چپ رہ گیا۔

اب جانے کہنے کو کچھ سوجھا نہ تھا یا پھر وہ غیض و غضب کی کیفیت میں چپ تھا مگر ابہا نے اسی ہمت سے پھر کہا۔

"ان سے کہیے گا میرے اکاؤنٹ میں۔" لائن ایک دم سے کاٹ دی گئی' بے وہ جان موبائل کان سے لگائے کھڑی رہ گئی۔

وہ امتیاز احمد کی طرف سے مایوس ہونے لگی مگر اسی شام امتیاز احمد کا ڈرائیور اسے لینے آیا تو وہ متحیر رہ گئی۔

"شکر کرو تمہارے گھر والوں کو بھی ترس آیا تم پر۔" حنا نے اس کی بے یقینی پر اسے گھر کا اور ساتھ ہی ٹوک بھی دیا۔

"چینج تو کرلو' سلوٹوں سے بھری قمیص ہے تمہاری۔" وہ جلدی سے سامنے لٹکا سوٹ پہن کر سلیقے سے دوپٹا اوڑھتی آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وارڈن بھی امتیاز احمد کے ڈرائیور سے واقف تھی۔ سو اجازت کا مسئلہ ہی نہ تھا۔

ڈرائیور خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"کہاں جانا ہے ہمیں؟"

"صاحب نے فلیٹ پر بلایا ہے۔"

ڈرائیور نے مختصراً" بتایا تو اس نے سر ہلا دیا۔ اب ظاہر ہے امتیاز احمد اسے سفینہ کے گھر میں تو نہیں بلوا سکتے تھے۔ ڈرائیور اسے فلیٹ کے دروازے تک چھوڑ کر پلٹ گیا۔ ابہا کا دل ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔ اپنے تمام مسائل کا حل اسے دروازے کے پار دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ پایا تو تاب تھما کر کھا

دروازہ کھل گیا۔ وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی مگر سامنے کوئی بھی نہ تھا۔

ویل فرنشڈ فلیٹ کا ٹی وی لاؤنج اس کے سامنے تھا اور قدموں کے نیچے قیمتی کارپٹ۔

اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی تو وہ بے اختیار پلٹی۔ دروازہ لاک ہو چکا تھا۔

سامنے والے کو دیکھ کر ابہا دہشت زدہ سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

معیز احمد کے تاثرات نے اسے بے حد خوف زدہ کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے اصرار پر شازیہ' چچی کے سامنے موجود تھی۔

ضروری بات کرنے کا کہہ کر شازیہ اب ہول سی بیٹھی تھی مگر الفاظ تھے کہ نوک زبان پر آتے ہی نہ تھے۔ صالحہ نے آتے جاتے اسے گھورا تو اسے مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق بات شروع کرنا ہی پڑی۔

"صالحہ کی شادی کب کر رہی ہیں خالہ؟" چچی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بس۔ امتیاز احمد ذرا اپنے قدم صحیح سے جما لے' پھر شادی کی تاریخ دے دیں گے۔"

"اور اگر امتیاز احمد سے اچھا رشتہ مل جائے تو؟" خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر شازیہ نے کن اکھیوں سے چچی کے تاثرات دیکھے تو ان کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا' بچپن سے بات طے ہے امتیاز اور صالحہ کی۔ اب تک اس سے اچھا نہ ملا تو اب کیا ملے گا۔" انہوں نے رکھائی سے بات ختم کردی مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ بات ختم نہیں بلکہ ابھی تو شروع ہوئی تھی۔

"میرا ایک دور پار کا کزن ہے خالہ! بہت امیر ہے پڑھا لکھا۔ شریف کاروباری آدمی ہے۔" شازیہ نے دبے لفظوں سے کہا تو وہ کچھ اور ہی سمجھیں۔

"اچھا۔ تمہارا رشتہ ڈالا ہے انہوں نے۔"

شازیہ کا حلق خشک ہوا۔ صالحہ نے دور سے اسے آنکھیں دکھائیں اور بولتے رہنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں خالہ! اپنی صالحہ کے لیے۔ آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں اس کا۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی!" چچی کو جلال آیا۔

صالحہ جلدی سے وہاں آئی۔ ورنہ شازیہ ضرور ان کے عتاب کا شکار ہو جاتی۔

"اماں! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ مراد صدیقی سے مل کے تو دیکھیں' ہر لحاظ سے امتیاز احمد سے بڑھ کر ہے وہ۔"

وہ مزید دلیری سے بولی تو چچی نے کھینچ کے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میمونہ صدف

مکمل ناول

دیوار سے ٹیک لگائے اس نے اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کھردرے ہاتھوں پر ناخن نیلے پڑ رہے تھے۔ ہونٹوں کو سختی سے آپس میں پیوست کرتے اسے ان پر پپڑی جمے ہونے کا احساس ہوا۔ تب بھی اس کے گلابی ہونٹ اپنی تازگی میں بے مثال تھے۔ ڈبڈبائی نگاہوں سے اس نے ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ وہ سورج بھی ہر روز کی طرح اس کے دامن میں تکلیف اور آنسو بھر کر ڈوب گیا تھا اس کی زندگی کا [illegible] سینے میں دبائے۔ سورج کی زرد کرنوں میں اس کی سنہری رنگت زرد ہو گئی تھی۔ دور کسی مسجد سے اذان بلند ہو رہی تھی۔ نیچے جانے کا قصد کرتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو شدید بدبو کے بھبکے اس کے نتھنوں سے ہوتے سانس ساکن کرنے لگے۔ اسے [illegible] سینے پر ہاتھ رکھتے اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو کسی انجانی قوت نے اس کے وجود کو جکڑ لیا۔ تمام قوت مجتمع کرنے کے باوجود وہ وہاں سے انچ بھر بھی نہ ہل سکی تھی۔ سامنے سے آتا وجود اس کے اوسان خطا کرنے کو کافی تھا۔ لرزتے وجود کے ساتھ اس نے خوف سے جھرجھری لی۔ ہاں وہ وہی تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار کئی روپ میں مل چکی تھی۔ اس کی زندگی سے جڑا ایک بھیانک سچ۔ بے حد خوب صورت اور دراز قد شخص جس کی شخصیت پر حسن کی ملمع کاری بڑے ہی دلکش انداز میں کی گئی تھی مگر اس کے وجود سے اٹھتا تعفن اس کے سانس لینے کے عمل کو مشکل بنا رہا تھا۔ کوسوں دور ہونے کے باوجود وہ اس کی آنکھوں سے لپکتے شراروں کو اپنے وجود کے آر پار اترتا محسوس کر رہی تھی۔ وحشت سے اس نے آنکھیں میچ لیں۔

"گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بس یہی کہنے آیا ہوں کہ اپنے گھر والوں کو منع کر دو کہ ان کی کوئی کوشش کارگر ــــ نہیں ہونے والی جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں کبھی تمہیں نہیں چھوڑنے والا لاحاصل کوشش بے فائدہ ہے۔"

اس کی آواز کسی گونج کی مانند گویا دو پہاڑوں کے بیچ

ٹکراتے ہوئے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ کانوں سے بھرے حلق سے تھوک نگلنا بھی محال لگ رہا تھا۔

"دست خود بر ظلم کرو اور مجبور بھی۔ تم مجھ سے الگ نہیں ہوسکتیں۔" اس کے بہت قریب سے آواز آئی تو گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے حلق سے ابلی تھی۔

دیوار کا سہارا لیتے اس نے گرتے پڑتے وجود کو اٹھانے کی کوشش کی تو دماغ کے آگے گویا دھند چھا گئی۔ اتنی زور سے سر چکرایا کہ وہ وہیں ڈھے گئی۔ دماغ ماؤف ہونے سے پہلے اس نے دوبارہ اسے اپنے قریب آتے ہوئے دیکھا تھا گویا اب وہ اس کے کرچی کرچی وجود کو سمیٹ کر ہمیشہ کی طرح سب کے درمیان پہنچا دے گا۔

☆ ☆ ☆

"آئے ہائے لڑکیو! کدھر مرگئی ہو سب کی سب۔ یقیناً" کسی کونے کھدرے میں لگی ہوں گی۔ جب دیکھو موئے ڈائجسٹ اٹھائے سر نیہوڑائے تبصرے کرتی رہتی ہیں۔ ذرا جو احساس ہو کہ مائیں پورا دن کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہیں۔ ذرا ہاتھ ہی بٹا دیں۔ نانی!" سکینہ خاتون کچن کے دروازے میں' ہاتھ میں کفگیر لیے کھڑی زور و شور سے تقریر کررہی تھیں۔ سنانا ان ساتوں کو مقصود تھا۔

"ارے بھابھی بیگم! جانے دیں۔ بچیاں ہیں' دھوپ سینکنے اوپر چھت پر گئی تھیں۔ آپ لائیں میں باقی کے کام کرلوں گی۔ آپ جاکر آرام کریں۔"

بختیار بیگم جو وہیں برآمدے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ عجلت میں دعا مانگے بغیر جائے نماز تہ کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کیوں بھلا تم کیوں کرو؟ وہ نواب زادیاں کیوں نہ کریں۔ مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے پیدا کی تھیں ہم نے؟ کمبختوں کا دیدوں کا پانی ہی مرگیا ہے۔ چھٹی والے دن بھی محال ہے جو ماؤں کو آرام دیں۔ پہلے پڑھتی ہیں' پھر سر جوڑے سیر حاصل تبصرے کرتی ہیں۔ میں آج ہی شمعون سے کہتی ہوں کہ آئندہ اس گھر میں ڈائجسٹ آئے تو ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں تھماؤں گی۔"

بختیار بیگم کچن میں چلی آئیں۔ صبح ناشتے کے برتن جوں کے توں گندے سنک میں پڑے منہ چڑا رہے تھے۔ چولہے پر ایک طرف پریشر ککر میں گوشت چڑھا ہوا تھا تو دوسری جانب آلو ابل رہے تھے۔ بختیار بیگم آدھ گھنٹہ پہلے ہی بابر کے ہمراہ سودے سے لدی پھندی بازار سے لوٹی تھیں۔ سارا سودا وہیں کچن میں ایک جانب رکھ کر نماز پڑھنے چلی گئی تھیں کہ نماز کا وقت نہ نکل جائے۔ کچن کی حالت زار پر غور نہ کیا تھا۔ اب جو کچن کا رخ کیا تھا تو جا بجا بکھرے گندے برتنوں اور کام کو دیکھ کر انہیں احساس ہوا کہ سکینہ خاتون اپنے غصے میں حق بجانب تھیں۔ انہوں نے سر پر لپٹی چادر اتار کر کچن کے دروازے کے پیچھے لگی کھونٹی پر لٹکائی' سویٹر اور قمیص کی آستینیں موڑیں اور سنک میں دھرے برتنوں کے انبار کو نیچے لگی ٹونٹی تلے دھرا۔

پیڑھی گھسیٹ کر نل کھولے وہ تیزی سے ٹھنڈے پانی سے ہی ایک کے بعد ایک برتن دھونے لگیں۔ کمر کے درد کے باعث ان سے کھڑے ہوکر کام نہ ہوتا تھا۔ ان ساتوں پر اب انہیں بھی رہ رہ کر غصہ آنے لگا۔ صبح ان کے جانے سے پہلے جو چھت پر گئی تھیں تو اترنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ برتن دھو کر انہوں نے سمیٹ کر برتنوں والی ٹوکری میں رکھے اور چھری کی مدد سے چولہے پر رکھے آلوؤں کو چیک کیا۔ آلو گل چکے تھے۔

پانی سنک میں گرا کر انہوں نے ٹھنڈے پانی سے آلوؤں کو نتھار لیا اور ایک طرف نکال کر رکھے۔ وہ چولہے کے برابر رکھے دیگچے کی جانب متوجہ ہوئیں۔ دیگچے کا ڈھکن ہٹا کر اندر جھانکا تو گرما گرم چکن قورمے کی مہک آئی تھی۔ بھابھی بیگم کا مخصوص چکن قورمہ تیار تھا۔ گھر میں رات کے متنجن پلاؤ کے لیے گوشت چڑھا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے الگ الگ سالن بنتا تھا۔

وہ سبک روی سے چلتی گھر کے پچھلے حصے کی جانب آئی تھیں جہاں سے سیڑھیاں اوپر چھت کی جانب جاتی تھیں۔ بختیار بیگم نے چھت کی منڈیر سے جھانکا تو اوپر کا منظر دیکھ کر کھول اٹھیں۔ وہ ساتوں ایک طرف پرانی دری بچھائے آپس میں سر جوڑے ڈائجسٹ ہاتھ میں لیے زور و شور سے تبصرے کررہی تھیں۔

"غلط غلط۔ دیکھ لینا سکندر اور لیزا کبھی نہیں ملنے والے۔ لیزا' سکندر کی سچائی کا یقین نہیں کرے گی۔ جبکہ سکندر کے اپنے گھر والے بھی اس کے خلاف ہیں۔" ماریہ نے گھٹنوں کے بل آگے ہوکر مونگ پھلی کے شاپر سے مٹھی بھر کر مونگ پھلی نکال کر اپنے سامنے رکھی۔

"ماریہ بی بی! فرحت اشتیاق کی کہانیوں کا اختتام ویسے اچھا ہوتا ہے۔" کنول کی طرف داری پر صفیہ نے بڑا چکاتے فاتحانہ نگاہوں سے ماریہ کی جانب دیکھا۔

"تو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ متاع جاں ہے تو اور وہ جو زخم رکھتے تھے' کی تو کوئی اچھی اینڈنگ نہیں ہوئی تھی۔" سونیا نے ماریہ کی سائیڈ لی۔ اس کا چہرہ یکدم کھل اٹھا۔

"ایک لحاظ سے اچھی اینڈنگ ہی تھی۔" صفیہ نے انگلی اٹھاتے سونیا کو مزید بولنے سے روکا۔

"کم بختو! سب کی سب کلن لپیٹے بیٹھی ہو ادھر۔ نیچے تائی بیگم نے گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔"

"امی! وہ کیوں؟" سونیا کے چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت تھی۔

"صبح کی تم لوگ اوپر چڑھی ہوئی ہو۔ نیچے وہ اکیلی کچن میں لگی ہیں۔ فرحت بھی جو عیادت کے لیے خالہ کے ہاں جاکر بیٹھی ہے۔ تو لگتا ہے انہیں دوسرے زمانے کا چلہ کرکے ہی لوٹے گی۔ چلو اب نیچے اور آدھے گھنٹے میں سب کام نپٹاؤ۔ ڈیڑھ بجے تک کھانا دسترخوان پر چن دینا' ورنہ بھائی صاحب کے ہاتھوں شامت بلوانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج میں بھی نہیں بچانے والی۔" انہوں نے تنبیہی نگاہوں سے ان سب کو گھورا تو سب نیچے کی جانب دوڑیں۔

بختیار بیگم نے دری پر جا بجا بکھرے مختلف ڈائجسٹ سمیٹ کر ایک جانب رکھے۔ مونگ پھلی کے شاپر کو باندھ کر گرہ لگائی۔ مالٹے کے چھلکوں کو چن کر دیوار سے نیچے کھیتوں میں پھینکا۔ وہ کچن میں پہنچیں تو صفیہ روٹیاں بیل بیل کر توے پر ڈال رہی تھی اور ماریہ انہیں سینک رہی تھی۔ برابر والے چولہے پر کنزیٰ کڑاہی چڑھائے گرم دیسی گھی میں سوجی بھون رہی تھی۔ بھنی بھنی سوجی کی خوشبو سے ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ سونیا آلوؤں کو مسل کر ان میں مسالے تیار کرکے ڈال رہی تھی۔ جبکہ برابر کھڑی ثوبیہ جلدی جلدی ٹکیاں بناتی' تلتی جارہی تھی عطیہ رائتہ بنانے میں مصروف تھی۔ جبکہ کنول بھاگ بھاگ کر دسترخوان پر برتن لگا رہی تھی۔

ڈیڑھ بجے تک وہ ساتوں دسترخوان پر کھانا چن کر اپنی اپنی نشست سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ بابر' دادی کو ان کے کمرے سے لے کر وہیں چلا آیا۔

"ارے واہ جی واہ' آج تو چکن قورمہ بنا ہے۔ چھٹی کے دن ہماری واحد عیاشی تائی جی کے ہاتھ کا اسپیشل قورمہ ہوتا ہے۔" شمعون نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے قورمے کی مہک کو گہری سانس لے کر اپنے اندر اتارا۔

"تائی کا چمچہ!" سونیا نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔

"ارے جاؤ کوئی بھابھی بیگم کو منا لاؤ۔ وہ اپنے کمرے میں ناراض بیٹھی ہیں۔ اس سے پہلے کہ بھائی جان آجائیں۔" بختیار بیگم نے باری باری سب لڑکیوں کی طرف دیکھا تو سب آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگیں۔

"جاؤ نا سونیا بچے! تم بلا لاؤ۔ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔" دادی نے برابر جگہ سنبھالی تھی۔

"تو بھلا سونیا ہر کام میں پھنستی ہے۔ آگے جاتے گھٹنے ٹوٹیں اور پیچھے دیکھتے آنکھیں پھوٹیں۔" برے

بڑے منہ بناتے وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ عبدالغنی صاحب کے دسترخوان پر آنے پر سب لڑکے لڑکیوں کے باہر نکلتے دانتوں کو بریک لگی تھی۔

"تمہاری ماں کہاں ہے بابر؟" ان کا اشارہ اپنی زوجہ محترمہ سکینہ خاتون کی طرف تھا۔

"وہ بھائی صاحب بھابھی بیگم ناسازی طبیعت کے باعث آرام کررہی ہیں۔" فرحت بہار نے اپنے تئیں بات بنائی تھی۔

"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔ اور سامنے رکھے ڈونگے میں سے قورمہ نکالتے ہوئے کھلی نگاہ سے فرحت بہار کی جانب دیکھا۔

عبدالغنی صاحب نے قورمے کی پلیٹ دادی کے آگے رکھی تھی جو اس بات کا عندیہ تھا کہ اب سب کھانا شروع کرسکتے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے سامنے رکھے ڈونگے میں سے باری باری قورمہ ڈالا اور چنگیر میں سے روٹی نکالی۔ سونیا عبدالغنی صاحب کو سلام کرتے عطیہ کے برابر بنی اپنی جگہ پر آبیٹھی۔ بختیار بیگم نے سوالیہ نظروں سے اس کے جانب دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بختیار بیگم نے سکھ کا سانس لیتے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالا۔ سکینہ خاتون ستا چہرہ لیے عبدالغنی کے برابر آکر بیٹھیں تو انہوں نے ناقدانہ بیگم کا جائزہ لیا۔ "کیا ہوا ہے تمہاری طبیعت کو؟"

"طبیعت کو؟" انہوں نے اچنبھے سے استفسار کیا تو سامنے بیٹھی لڑکیوں کے چہروں کی ہوائیاں اڑی تھیں۔

"وہ بس سر میں درد تھا۔" انہیں چند لمحے لگے تھے۔ تمام صورت حال سمجھنے میں ویسے بھی کھانے کے دسترخوان پر رکھا رائتہ' آلو کے کٹلس اور سوجی کا گرما گرم بھاپ اڑاتا حلوہ ان کے چڑھے پارے کو قدرے نیچے لے آیا تھا۔

"چھٹی والے دن ان لڑکیوں کو کام پر لگایا کرو۔ آگے بھی پورا ہفتہ تم تینوں کو ہی کام کرنا ہوتا ہے۔"

انہوں نے رائتہ کا ڈونگا دادی کی جانب بڑھایا تھا۔ سکینہ خاتون نے ان ساتوں پر ملامتی نگاہ ڈالی تو وہ اپنی اپنی جگہ پانی پانی ہوگئیں۔

☆ ☆ ☆

"آج تو تم لوگ بچ گئی تھیں کام سے' شکر کرو کہ بچ گئیں۔" بابر اور شمعون ان کے کمرے کے وسط میں رکھی کوئلے کی انگیٹھی کے آگے بیٹھے ہاتھ سینک رہے تھے۔

"میری بہن قسم سے آج اماں بول پڑتیں تو تم لوگوں کے سر کے جو گنے چنے بال رہ گئے ہیں نا' وہ بھی نہ بچتے۔" بابر نے خصوصاً" کنول کے بالوں پر چوٹ کرتے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ جس کے بال بہت باریک ہونے کی وجہ سے کم لگتے تھے۔

ابھی کنول نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ کنزی بھاری سی ٹرے اٹھائے خراماں خراماں چلتی اندر داخل ہوئی تھی۔ "ہو بھئی گرما گرم کشمیری چائے پیو اور دعائیں دو۔"

"یہ کام کیا ہے میری بہن نے۔ جیتی رہو قسم سے شدید طلب ہورہی تھی اس وقت۔" شمعون نے پیار سے چھوٹی بہن کو دیکھا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں کوئلے کی انگیٹھی ان کے کمرے میں دہکا کر اسی طرح محفل جماتے تھے۔

گرمیوں میں ان کی یہ محفل اوپر چھت پر جمتی تھی۔ جہاں سامنے کی دیوار نہ ہونے کی وجہ سے کھلی ہوا آتی تھی۔

"ہم ستمبر کے تمام شمارے مکا چکے ہیں۔ اب تم ہمیں اکتوبر کے شمارے لادو۔" چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کنول نے چوکی پر بیٹھے شمعون کو مخاطب کیا۔

"ارے تم لوگ ابھی تک ستمبر کے شمارے چاٹ رہی ہو دسمبر کے مہینے میں۔" بابر نے گویا ان کا مذاق اڑایا تھا۔

"ہاں' یہ جو شہر جاکر ہمیں بروقت رسالے لاکر نہیں دیتا ہے۔ بس لوٹے پر خان کی دکان سے پرانے پرچے سمیٹ لاتا ہے۔" ثوبیہ نے دانت پیتے خباثت سے دانت نکالتے شمعون کو گھورا۔

"ایک تو میں معصوم اپنی جان پر کھیل کر ابا کی نظروں سے چھپتے چھپاتے تم لوگوں کے لیے ڈائجسٹ خرید کر لاتا ہوں۔ اوپر سے یہ باتیں۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے منہ پھلائے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔

"پورے ماہ تم لوگوں کے ڈائجسٹ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی مہینہ کے اختتام پر آرہا ہے' کوئی اگلے ماہ کے آغاز میں تو کوئی درمیان میں۔ میں پورا مہینہ جوتیاں چٹخاتا رہا کروں سرگودھا شہر کی۔" ایک ہی سانس میں کپ خالی کرکے اس نے ہاتھ جھاڑے۔ سارے جہاں کی مسکینی اس کے چہرے پر برس رہی تھی۔

"ایک اماں کافی نہیں تھیں محاورات میں طاق کہ تم نے بھی شاگردی کرلی ہے ان کی۔" سونیا نے ماں کے محاورات پر چوٹ کرتے شمعون کو گھر کا تھا۔

بابر ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "کدھر برادرم؟ ابھی تو ساڑھے نو بھی نہیں ہوئے۔" شمعون نے کلائی پہ بندھی گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"بس یار! نیند سی آرہی ہے آج۔ سونے جارہا ہوں۔" بابر نے جمائی روکتے ہوئے توجیہہ پیش کی۔

"نہ میرے بھائی! مجھے ان چڑیلوں کے نرغے میں چھوڑ کر آپ خواب خرگوش کے مزے لوٹنے جارہے ہیں۔ یہ تو مجھ ناتواں کے ساتھ کوئی انصاف نہ ہوا۔" شمعون اس کے سامنے آہنی دیوار کی مانند راستہ روکے کھڑا تھا۔

"نہیں یار! بستر گرم ہونے میں بھی گھنٹہ لگ جائے گا۔ تب کہیں جاکر نیند آئے گی۔" بابر کی بات میں دم تھا۔ ایک تو ان کے قصبے میں یوں بھی گیس جیسی نعمت نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو سردیوں میں پھر بھی وہ اس نعمت سے محروم ہی رہتے۔ جیسا ارد گرد کے وہ تمام قصبے رہتے تھے۔ جہاں یہ نعمت موجود تھی۔ ایک انگیٹھی وہ اس کمرے میں جلاتے تھے تو دوسری دادی کے کمرے میں جلتی تھی۔ جہاں ساتھ میں فرحت بہار اور بختیار بیگم بھی ہوتی تھیں۔ بختیار بیگم کے تو شوہر بھی باہر ہوتے تھے اور فرحت بہار جب سے بیوہ

ہوئی تھیں، اپنا کمرہ چھوڑ کر مستقل دادی کے کمرے میں ہی بسیرا کر لیا تھا۔ اپنے کمرے میں گھٹن ہوتی تھی اور دادی کا ساتھ کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ سردیوں میں لڑکے اپنا کمرہ چھوڑ کر اپنی چارپائیاں کچن میں بچھا کر وہیں سوتے تھے کہ وہ قدرے گرم ہوتا تھا۔ گرمیوں میں البتہ وہ دونوں اوپر مٹی کی بنی کوٹھری میں سوتے تھے۔ سوندھی مٹی کی بنی کوٹھری کی اپنی باس تھی جو عجیب طرح سے سحر میں مبتلا کیے دیتی تھی۔

بابر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ ساتوں اپنے اپنے بستروں میں دبکی ہنس رہی تھیں۔ ماریہ سونیا کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر سوتی تھی۔ کنول اور صفیہ بھی ایک ہی چارپائی پر سوتی تھیں، جبکہ ثوبیہ، کنزیٰ اور عطیہ دو چارپائیاں جوڑ کر سوتی تھیں۔ ان تینوں کی چارپائیاں کمرے کے آخر میں رکھی پیٹی کے برابر بچھی تھیں۔

"چلو صفیہ! تم اٹھ کر انگیٹھی اور لائٹ بجھاؤ۔ آج تمہاری باری ہے۔" ان ساتوں نے ہفتے کے دن بانٹ رکھے تھے۔ انگیٹھی اور لائٹ بجھانے کے لیے اور آج صفیہ کی باری تھی۔ منہ کے زاویے بگاڑتے اس نے اوپر سے لحاف اتارتے ایک طرف کیا اور چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے انگیٹھی تک آ گئی۔ پاس دھری تپائی سے پانی کا جگ اٹھا کر انگاروں پر انڈیلا اور بتی گل کرتی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی اپنے بستر کی جانب بڑھی۔

"چلو بھئی شروع کرو اب۔" اندھیرے میں ابھرنے والی پہلی آواز سونیا کی تھی۔

"صبر تو کرو مجھے لیٹ تو لینے دو۔"

"تو ابھی تک تم بستر پر نہیں پہنچیں؟"

عطیہ نے اپنے موبائل کی تلاش میں ہاتھ بستر پر پھیرا، تاکہ اس کی ٹارچ آن کر سکے۔ تب ہی ایک چیخ بلند ہوئی۔

"ہائے کم بخت صفیہ میری پسلیاں توڑ ڈالیں۔" چیخنے والی سونیا تھی۔

صفیہ اپنی چارپائی پر پہنچنے کے بجائے اپنی چارپائی سے پہلے والی پر جا پہنچی تھی۔ عطیہ کا ہاتھ کپڑوں کی پیٹی پر رکھے اپنے موبائل سے ٹکرایا تو اس نے ٹارچ آن کی۔ صفیہ، سونیا کی چارپائی کی پائنتی پر ٹکی تھی۔

"لکھ لعنت" سونیا پسلیاں سہلاتے واپس لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

"بس بھی کریں نا اب۔ کنزیٰ باجی آپ اپنا ریڈیو لگائیں نا۔ سگنل پکڑنے میں بھی ٹائم لگتا ہے۔" ماریہ نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ لحاف اوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ماریہ چھوٹی ہونے کے باعث دیوار کی طرف سوتی تھی۔

کنزیٰ نے جوں ہی ریڈیو آن کیا کمرے میں ابھرنے والی بھانت بھانت کی آوازیں دم توڑ گئیں۔ جو واحد آواز اب ریڈیو پر ابھر رہی تھی۔ وہ ڈی جے حسنین کی تھی۔ ساتوں دم سادھے اسے سن رہی تھیں۔ جب گانا لگا تو کنول نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"واہ واہ کیا آواز ہے اس بندے کی۔"

"آواز سے زیادہ انداز متاثر کن ہے۔" وہ عطیہ تھی۔

"میں تو اس بندے کے سینس آف ہیومر کی مداح ہوں۔" ثوبیہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

"شکر ہے اس ویرانے میں یہ اسٹیشن تو آتا ہے یہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ ورنہ تو اس کال کوٹھری میں دم گھٹ جاتا ہمارا۔" سونیا اپنی ہی ترنگ میں بولے جا رہی تھی۔ ماریہ نے غصے سے لحاف پرے دھکیلا۔

"کیا ہے ماریہ! ٹھنڈ آ رہی ہے نا۔" سونیا نے اسے ڈپٹا۔

"مجھے گانے کیوں نہیں سننے دے رہے آپ لوگ۔" وہ منہ بنا کر بیٹھی تھی۔

"ہم تو محض حسنین جی کو سنتے ہیں۔" ثوبیہ نے جی پر زور دیا۔

صفیہ منہ سر لپیٹے چند ثانیے بعد ہی گہری نیند میں جا چکی تھی اور اب اس کے ہیبت ناک خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔

"لو جی شروع ہے راگ ملا۔" کنول جو اس کے برابر لیٹی تھی۔ کان بند کر کے بیٹھ گئی۔

"اس جیسے بے سرکوئی گا سکتا ہے۔"

تب ہی عطیہ کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔

"لو بھئی شمعون صاحب کا میسج ہے کہ تم چڑیلوں کے قہقہے پورے گھر میں گونج رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تایا ابا کسی دیو کی مانند حاضر ہوں خاموشی سے سو جاؤ۔" عطیہ مسکراتے لبوں سے اس کا میسج باآواز بلند پڑھ رہی تھی۔

"وہ بے چارہ وہاں باورچی خانے میں تپ رہا ہوگا نا۔ بابر تو سو گیا ہوگا۔" ثوبیہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

کچن ان کے کمرے کے بالکل ساتھ تھا۔ لہٰذا بند کمرے میں گونجنے والے قہقہے باآسانی سنے جا سکتے تھے۔ مگر تایا ابا کے کمرے تک آواز جانا ناممکنات میں سے تھا۔ جن کا کمرہ برآمدہ عبور کر کے کچے صحن کے آخر میں تھا۔ ان کے کمرے کے برابر کمرہ بڑا کمرہ کہلاتا تھا۔ جسے وہ بطور بیٹھک مہمانوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس سے اگلا کمرہ لڑکوں کا تھا جو سردیوں میں اس وقت خالی پڑا ہوتا تھا۔ لڑکوں کے کمرے سے اگلا کمرہ دادی کا تھا۔ جس کا ایک دروازہ لڑکوں کے کمرے میں ہی کھلتا تھا۔ دادی کا کمرہ برآمدے کا اختتام تھا۔ اس سے آگے کچی زمین شروع ہوتی تھی جہاں طرح طرح کی سبزیاں اگی ہوئی تھیں۔ سکینہ خاتون جب بیاہ کر اس گھر میں آئی تھیں تو بے مصرف پڑے اس کچے حصے میں سبزیاں اگا کر ہر روز خرچ ہونے والی رقم کو بچا کر جس سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا وہ آج بھی برقرار تھی۔ زمین کے اس کچے حصے سے اگلا کمرہ فرحت بہار کا تھا۔ جو اب مختار بیگم کے زیر استعمال تھا اور ساتھ آخری کمرہ عبدالغنی اور سکینہ خاتون کا تھا جہاں تک ان کے گونجتے قہقہے پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے تھے۔ اس لیے اس معاملے میں وہ بھی خاص احتیاط نہ برتتی تھیں۔

"بس کرو نا اب، ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ صبح نماز کے لیے آنکھ نہیں کھلے گی۔" کنزیٰ نے موبائل تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"ہمیں تو نہیں پڑھنا نا نماز۔" سونیا نے دانت نکوسے۔

"پڑھنا چاہیے نا تب ہی تو۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"ہاں تم تو پڑھتی ہو نا، تو تم کون سا محفوظ ہو؟" سونیا اس کی ادھوری بات کا پس منظر بخوبی جان گئی تھی۔

"اچھا اب لڑنا بند کرو۔ سب آیت الکرسی پڑھو، چاروں قل بھی اور خود پر پھونک کر سونا۔" عطیہ نے موبائل کی ٹارچ آف کر کے پیٹی پر واپس رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"واہ واہ آج تو مزہ آ گیا تائی اماں۔۔ ایک اور ہو جائے۔" شمعون کے ان توصیفی کلمات پر گرما گرم پراٹھے بیلتی سکینہ خاتون کا ڈھیروں خون بڑھ گیا تھا۔ فوراً "اس کے صدقے واری جاتی" اگلا پراٹھا بیلنے لگیں۔ وہ دو پراٹھے چائے کے ساتھ ختم کر کے مزید پراٹھا نوش فرمانے کا پروگرام رکھتا تھا۔

فرحت بہار پاس رکھی پیڑھی پر بیٹھی آملیٹ کے لیے باریک پیاز کتر رہی تھیں۔ صبح کا ناشتا وہ سب بڑے اہتمام سے وہیں باورچی خانے میں ہی نیچے پیڑھی پر بیٹھ کر کرتے تھے۔ جیسے جیسے سب اٹھتے جاتے، منہ ہاتھ دھو کر کپکپاتے بدن اور بجتے دانتوں کے ساتھ باورچی خانے کا رخ کرتے۔ صبح صبح سلنڈر کے چولہے پر ہلکی آنچ پر سنکتے [illegible] انڈوں کی مہک پورے باورچی خانے میں رچی [illegible]

"اب اٹھو گے تم؟ میں کب سے [illegible] سے میں کھڑی انتظار کر رہی ہوں کہ جناب کا ناشتا [illegible]"

"ارے کھانے دے کیوں بچے کو نظر [illegible]"

سکینہ خاتون اس کی سب سے بڑی حمایتی تھیں جو سب لڑکیوں سے کسی طور ہضم نہیں ہوتا تھا۔

صفیہ اور سونیا کب کی ناشتا کر کے اپنے اسکول کی طرف نکل گئی تھیں۔ ان دونوں نے بی اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور ایک قریبی اسکول میں تدریس کے شعبے میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ چند ثانیے قبل ماریہ بھی بابر کے ساتھ موٹر سائیکل پر اپنے اسکول روانہ ہو چکی تھی۔ وہ دسویں کلاس کی طالبہ تھی۔ بابر اسے اسکول چھوڑتا ہوا اپنے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ روانہ ہو جاتا تھا۔ جہاں وہ کمپیوٹر کے شارٹ کورسز سکھاتا تھا اور شام میں کسی قریبی ٹیوشن سینٹر میں ٹیوشن کلاسز لیتا تھا۔ ثوبیہ اور کنول دونوں گھر بیٹھے پرائیویٹ بی اے کر رہی تھیں اور ساتھ میں ایک دستکاری اسکول سے سلائی بھی سیکھ رہی تھیں۔ دونوں اکٹھے ہی دس بجے کے قریب پیدل دستکاری اسکول جاتی تھیں۔ بچی تھیں وہ اور کنزیٰ جو روز شمعون کے دیر سے جاگنے کے سبب کالج سے روزانہ لیٹ ہوتی تھیں۔

کنزیٰ سرگودھا شہر سے بی ایس سی اور عطیہ بی کام کر رہی تھی۔ شمعون دونوں کو موٹر سائیکل پر اڈے تک اتارتا اور وہاں سے دونوں مطلوبہ بس کے ذریعے شہر تک آتی تھیں۔ خود شمعون تایا ابا کے ساتھ پھر نو بجے تک دکان کے لیے نکلتا تھا۔ تایا ابا یعنی عبدالغنی صاحب کی وہیں سرگودھا شہر کے قریب ہی اینٹوں کی بہت سی بھٹیاں تھیں۔ تایا ابا کو وہاں چھوڑتا وہ خود سرگودھا شہر میں اپنی فوٹو شاپ پر چلا جاتا۔

دنیا جہاں کی خوبیوں کا حامل شمعون باسط پڑھائی کا چور نکلا تھا۔ ایف اے کر کے ہی تعلیم کو خیرباد کہہ کر اپنی فوٹو شاپ دکان کھول لی تھی۔

عطیہ کی کشادہ پیشانی پر پڑنے والی ناگوار سلوٹوں میں جوں اضافہ ہوا تو شمعون وہیں پر اٹھا چھوڑ کر ہاتھ چنگیر میں رکھے دسترخوان سے پونچھتا جست لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"ارے ناشتا تو پورا کرتا جا۔" فرحت بہار نے بے اختیار ٹوکا۔

"چاچی جی! اگر مزید یہاں بیٹھا رہا تو یہ محترمہ میری کچی موڑ دیں گی۔" اس نے بڑی دلچسپی سے اس کے تپے ہوئے روپ کو دیکھا تھا۔

وہ کلستی تملاتی باہر کی جانب بڑھی تو شمعون کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ نے احاطہ کر لیا۔ اپنی یہ کزن اس کے دل کے کچھ زیادہ ہی قریب تھی۔

"اوکے تائی اماں! باقی پراٹھے ادھار رہے۔" شرارت سے مڑتے ہوئے اس نے سکینہ خاتون کو مخاطب کیا تو وہ بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لینے لگیں۔ بلاشبہ ان کا یہ بھتیجا گھر بھر کی رونق تھا۔

عبدالغنی گھر کے بڑے بیٹے اور سرپرست تھے۔ بہت بچپن ہی میں یتیمی کی چادر اوڑھے انہوں نے ابا کے اینٹوں کی بھٹیوں کو بڑی جانفشانی اور محنت سے سنبھالا تھا۔ اپنے تین چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں کی ذمہ داری بخوبی نبھاتے عبدالغنی بچپن سے ہی بڑے سنجیدہ اور سمجھ دار تھے۔ سکینہ خاتون جب ان کی زندگی میں بیاہ کر لائی گئیں تب ان کی عمر کوئی بیس سال تھی۔

عبدالغنی سے چھوٹے عبدالباسط تھے جو شروع سے لاہور میں رہ کر پڑھے تھے۔ خود تو عبدالغنی حالات کے باعث کچھ خاص نہ پڑھ سکے۔ مگر باقی بھائیوں کو اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ ایف ایس سی کے بعد ڈپلوما کر کے عبدالباسط سعودیہ چلے گئے تھے۔

عبدالباسط سے چھوٹی راحیلہ تھیں، جن کی میٹرک کے بعد ہی عبدالغنی نے اپنے دوست کے ساتھ شادی کر دی جو مسقط میں مقیم تھے۔ لہٰذا شادی کے فوراً بعد راحیلہ باہر چلی گئیں۔

راحیلہ سے چھوٹے عبدالکریم تھے جو سرگودھا شہر میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ عبدالکریم نے بھی بی اے لاہور رہ کر ہی کیا تھا۔ مگر واپس آ کر کوئی نوکری کرنے کے بجائے کاروبار کرنے کو ترجیح دی۔ کسی کی نوکری کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

عبدالباسط اور عبدالکریم کی شادیاں اماں نے اپنی بھتیجیوں بختیار بیگم اور فرحت بہار سے کی تھیں۔ دونوں بہنیں ہی فطرتاً سادہ مزاج اور ملنسار تھیں۔

ارباب عبدالغنی صاحب کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو پڑھائی کی غرض سے لاہور گیا اور ماسٹرز کرنے کے بعد وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ارباب کی اس بے اعتنائی نے عبدالغنی کو اندر سے اتنا توڑا تھا کہ انہوں نے پھر گھر کے کسی بچے کو تعلیم یا نوکری کی غرض سے لاہور نہیں جانے دیا۔ ارباب سے چھوٹا بابر اور اس سے چھوٹی سونیا اور پھر عطیہ تھیں۔

عبدالباسط کے دو ہی بچے شمعون اور کنزیٰ تھے۔ باہر سیٹل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی فیملی کو وہیں اپنے آبائی گھر میں ہی رکھا تھا کہ یہ دادی کی بھی خواہش تھی۔

عبدالکریم کا انتقال تب ہوا جب ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ماریہ تیسری میں تھی۔ ماریہ سے بڑی ثوبیہ اور کنول دونوں جڑواں تھیں اور ان سے بڑی صفیہ تھی۔

"سنو شمعون! واپسی پر آتے ہوئے شہر سے بسکٹ، سموسے اور گرما گرم جلیبیاں لے آنا۔" عجلت میں چپل اٹھاتا شمعون یکدم پلٹا تھا۔

"کیوں خیریت؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں وہ آج کچھ مہمان آ رہے ہیں سونی کو دیکھنے۔" تائی اماں کی آنکھوں میں چمک تھی۔

"سمدھیانے والے آ رہے ہیں۔" وہ یکدم پھر سے شرارت پہ آمادہ نظر آیا تو سکینہ خاتون مسکرا دیں۔

"جو خدا کو منظور ہو بیٹا۔ بس دعا کرو کہ سب خیریت سے گزر جائے۔" وہ بھی دل میں سونیا کے لیے دعا کرتا ہوا باہر کی جانب لپکا۔

☼ ☼ ☼

"آج تو وہ آنٹی رشتہ پکا کر کے ہی جائیں گی۔ قسم سے اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ یقیناً" دیار دل کی فارہ ایسی ہی ہو گی۔" ثوبیہ نے شوخی سے اس کے بازو میں چٹکی کاٹی تو وہ ہنس دی۔

"بس جی دعا کریں اندر آنے والا رشتہ بھی ہینڈسم سے ولی جیسا ہو۔" کنول کے کہنے پر سب کے لبوں سے آمین بلند ہوا تو سونیا کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بالکل پاگل ہو گئی ہو تم لوگ تو۔ مجھے کوئی ولی نہیں چاہیے۔"

"ہائیں تو پھر؟" وہ سب حیرت سے گویا ہوئیں۔

"مجھے ابھی کچھ دن لگیں گے "کا دانیال عابد پسند ہے۔" ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ لیے اس نے جواب دیا تو کنزیٰ فوراً بولی۔

"تو جی دانیال عابد نے انا مقصود کے ساتھ جو کیا وہ بھول گئیں جناب۔"

"میری کوئی دوست رباب سلیم نہیں ہے۔ البتہ تم میں سے کوئی آستین کا سانپ نکل آئے تو اور بات ہے۔" عطیہ نے دو کڑے اس کے ہاتھوں میں پہنائے تھے۔

"سنا ہے جیجا جی کا بڑا سا شوروم ہے فرنیچر کا سرگودھا شہر میں اور خیر سے اکلوتے چشم و چراغ ہیں۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی۔" عطیہ نے سب کو معلومات بہم پہنچائیں۔

"خیر سے دو کلو مٹھائی لائے ہیں جناب۔" صفیہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"لے لو ان محترمہ کو کھانے کی پڑی ہے۔ اپنا پھیلا ہوا سراپا جا کر آئینے میں دیکھو۔ خیر سے سونی کے بعد تمہاری باری ہے۔" کنول نے اسے شرم دلائی۔

"ویٹ از ناٹ مائی پرابلم، پیٹ از مائی پرابلم۔" اس نے اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کو تاسف سے دیکھا۔

"یہ صرف پرابلم نہیں ہے میڈم، یہ تو پرابلم کا پہاڑ ہے۔"

وہ ناراض ہو کر باہر چلی گئی تو سب ہی ہنس دیں۔ سونیا نے عطیہ کو گھر کا۔

"ٹھیک کیا ہے بالکل۔ اسے شرم نہ دلائی گئی تو ایک

دن خطوط طول بلد اور ارض بلد پر پھیلا یہ رقبہ پھٹ جائے گا۔" کنول نے عطیہ کی کارکردگی پر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

"چلو سونی! اب تم کچھ دیر شرمانے کی اداکاری ہی کرلو۔ ویسے پھاڑے اندر مت جانا۔"

"ارے او لڑکیو سونی تیار ہوئی کہ۔۔۔" باہر سے اپنی ہی دھن میں آتی سکینہ خاتون بری طرح چونکی تھیں۔ کاسنی رنگ کے گھیرے والے فراک پر بڑا سا دوپٹا سر پر اوڑھے' ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی دھار لگائے۔ کانوں میں سفید موتیوں کے ہی آویزے پہنے دمکتا روپ لیے سامنے بیٹھی لڑکی پر ان کی نظر نہ ٹک رہی تھی۔ دل ہی دل میں اپنی بچی کی لاکھ بلائیں لیتی اور لرزتے دل کے ساتھ آنکھوں میں در آتی نمی کو انہوں نے صاف کیا تو سب ہی مغموم ہوگئیں۔

"چلو وہ لوگ بار بار پوچھ رہے ہیں تمہارا۔" ان کی لرزتی آواز پر ایک سایہ سب کے چہروں پر لہرا گیا تھا۔ اندر بیٹھی خاتون جو بختیار بیگم کے ساتھ باتوں میں محو تھیں۔ اسے اندر آتا دیکھ کر چونکیں۔ "ماشاء اللہ" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے پھسلا تھا۔ اپنے بھدے نقوش اور پکے رنگ والی بیٹی کی جانب انہوں نے بڑی داد طلب نظروں سے دیکھا۔ جس کی نگاہوں میں بھی واضح پسندیدگی ابھری تھی۔ دادی' عبدالغنی' بابر اور شمعون پہلے ہی سے اندر براجمان تھے۔

"یہاں بیٹھو' ہمارے پاس آکر۔" اپنی بیٹی کے برابر انہوں نے اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔ وہ ان کے برابر آکر نظریں جھکائے بیٹھ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ میٹھی میٹھی نظروں سے اس کے رنگ و روپ کو نہارتی رہیں۔ سب لڑکیاں ہی باہر لائن بنائے' دروازے سے کان لگائے کھڑی تھیں۔ یہ رشتہ بابر کی وساطت سے آیا تھا۔ خاندان اور لڑکا دونوں بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لہٰذا سب کی ہی مرضی تھی اس رشتے میں اور سب یہی چاہتے تھے کہ بغیر کسی بدمزگی کے تمام امور سرانجام پاجائیں۔

"کیا کرتی ہیں آپ بیٹا؟" مہمان خاتون نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"میں پڑھاتی ہوں۔" بڑی شائستگی سے اس نے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ۔" فرحت بہار چائے کے لوازمات لیے اندر داخل ہوئی تھیں۔

"پڑھانے کے علاوہ آپ کیا کرتی ہیں؟" برابر بیٹھی لڑکی نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "گھر کے کام کاج اور رسالے پڑھنا۔" اس نے رسان سے جواب دیا۔

"ارے واہ! مجھے بھی رسالے پڑھنے کا جنون ہے۔" اس نے فرحت بہار کے ہاتھ سے گرما گرم چائے کا کپ تھامتے ہوئے بڑے جوش سے جواب دیا تو وہ مبہم سا مسکرادی۔

"کون سی رائٹر آپ کی فیورٹ ہے؟ میری تو عمیرہ احمد' نگہت عبداللہ' نمو بخاری' فائزہ افتخار' فرحت اشتیاق' ماہا ملک' نگہت سیما' رخسانہ نگار عدنان بہت ہی فیورٹ ہیں۔" وہ سب معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"کوئی رہ گیا ہے؟" عطیہ بڑبڑائی تو ان سب کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ لڑکی ان ہی کی طرح باتونی ہی تھی۔

"ہماری بس فرحت اشتیاق ہی زیادہ فیورٹ ہیں۔" اس نے چائے کی چسکی بھرتی لڑکی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"کون سا کردار پسند ہے۔ آپ کو فرحت کے ناول کا؟"

"ہر کردار ہی پسند ہے۔ سارے ہیروز ساری ہیروئنز۔"

"مجھے تو عالی بہت پسند ہے پر اسے جب اتنی قسطوں کے بعد مرا ہوا پایا تو میں بہت ہی روئی تھی۔ فرحت نے اچھا نہیں کیا۔" وہ دل مسوس کر بولی تو باہر کھڑی لڑکیوں نے بمشکل اپنی ہنسی دبائی۔

"اگر عالی نہ مرتا تو وہ ناول بیسٹ کیسے ہوتا؟" ...

کہانیوں میں ہیرو مر جاتے ہیں۔ وہی امر ہو جاتی ہیں۔" دکھ تو انہیں بھی بہت تھا۔ مگر اب سوگ مناتے بہت وقت گزر گیا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے ویسے۔" بسکٹ منہ میں رکھتے وہ بھرے منہ سے بولی۔

"ویسے مجھے "دل سے نکلے ہیں جو لفظ" کی ودیعہ کمال اور عمر حسن بھی بڑے پسند ہیں۔" سونیا نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ حلق میں جیسے کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ اس نے اپنے تھوک کو نگلتے حلق کو تر کرنے کی کوشش کی۔ مگر بے فائدہ۔ اس کے حلق میں پھندا سا لگنے لگا تھا اور تنفس یکدم تیز ہوگیا تھا۔ بدن میں انگارے سے بھر گئے تھے۔ اس نے گردن پر ہاتھ رکھ کر جیسے خود کو کسی کی گرفت سے آزاد کرنے کی سعی کی۔

"اماں۔۔۔" گھٹی گھٹی سی آواز پر سب ہی چونکے۔ سکینہ خاتون فوراً" اس کی طرف لپکیں۔ "کیا ہوا ہے سونی تجھے؟" باہر کھڑی لڑکیوں نے خوف سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"پھر سے وہی۔" صفیہ کی بڑبڑاہٹ پر سب ہی جیسے ڈھے سی گئیں۔

"اماں وہ۔ وہی ہے پھر سے۔ میرا گلا۔ مار دے گا مجھے۔" نامکمل جملے بولتے اس نے اپنی جانب پانی کا جا گلاس اندر انڈیل لیا۔ مہمان خاتون اور ان کی بیٹی نے تحیر سے برابر بیٹھی انگارہ بنتی لڑکی کی جانب دیکھا جو گلا پکڑے صوفے سے نیچے لڑھک گئی تھی۔ جسے لپک کر سکینہ خاتون نے تھام لیا اور ان کے لب نیچے ورد کرنے لگے۔

"گلا۔ میرا گلا۔ ہائے اماں۔" وہ درد سے بلبلا رہی تھی اور ساتھ بیٹھے مہمان کچھ بھی سمجھنے سے قاصر بس ٹکر ٹکر سب دیکھتے چلے جارہے تھے۔

"یہ کیا ہورہا ہے بچی کو؟" لبوں پر مچلتے سوال کو الفاظ کا جامہ پہنا ہی دیا گیا۔ زرد چہرہ لیے بختیار بیگم نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"بس۔ بس۔ ذرا طبیعت بگڑ گئی ہے۔ گھبرا گئی ہے شاید۔" اپنے ہی الفاظ ان کی زبان کا ساتھ دینے سے انکاری تھے۔

خاتون نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹی کو اشارہ کیا۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بختیار بیگم اور فرحت بہار نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر بے سود تھا سب۔

"سات سات بیٹیوں کا بوجھ ہے اس گھر پر مگر نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے اس گھر کی خوشیوں کو۔ کب ہم اتار پائیں گے اس بوجھ کو۔" سکینہ خاتون نے سونیا کو تھپکتے روتے ہوئے آنسو صاف کیے۔

"سکینہ ایسے مت کہو۔ بچیاں بوجھ نہیں ہیں ہم پر۔ فرض ہے یہ ہمارا۔" دادی نے ان کے الفاظ کی سنگینی کو کم کرنا چاہا۔ مگر دروازے میں کھڑی سب لڑکیوں کے چہرے سے دکھ ٹپک رہا تھا۔ سکینہ خاتون کو احساس ہوا کہ دکھ اور غصے میں وہ کیا بول گئی ہیں۔ مگر اب کیا فائدہ تھا اس احساس کا۔

عبدالغنی کسی شکست خوردہ شخص کی طرح سر جھکائے بڑے کمرے سے باہر چل دیے۔ سامنے بیٹھا شمعون دکھ بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی اس زندگی سے بھرپور لڑکی کو اس حال میں دیکھ رہا تھا۔ کسی نے ایک گھونسا دل پر مارا تھا۔ یہ سب کب سے ہوتا آرہا تھا۔ اسے ٹھیک سے یاد تھا۔ مگر پچھلے پانچ ماہ سے ایسا کچھ بھی غیر معمولی نہیں ہوا تھا۔ پھر آج اچانک یوں۔

آج سے تقریباً" آٹھ ماہ قبل لاہور میں سکینہ خاتون کی رشتے کی بہن فردوس کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔ عبدالغنی صاحب کے کہنے پر وہ سکینہ خاتون' سونیا اور کنزیٰ کے ہمراہ لاہور گیا تھا۔ ان ہی دنوں راحیلہ پھپھو بھی بمعہ فیملی پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ مگر فی الحال ان سے ملنے نہیں آئی تھیں۔ وہ لاہور میں ہی اپنے سسرال میں رہائش پذیر تھیں۔ وہ چاروں سویرے نکلے لاہور کے لیے نکلے تھے۔ فنکشن دن کے گیارہ بجے کا تھا۔ ہال میں پہنچتے ہی وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ سونی اور کنزیٰ' نزہت خالہ سے جو بختیار بیگم اور فرحت بہار کی

سگی بہن تھیں مل کر وہیں ایک طرف ٹک گئیں۔ سکینہ خاتون وہیں سامنے والی نشست پر براجمان اپنے رشتے کی بہن کلثوم اور حمیدہ سے پرجوشی سے مل رہی تھیں۔ سونیا نے ایک اچٹتی سی نگاہ ہال پر ڈالی جو برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بے ہودہ قسم کا میوزک کان کے پردے پھاڑنے کے لیے کافی تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی آنکھیں چندھیا سی جاتی تھیں۔ مکس کیدرنگ کے لنکشن میں تمام لڑکیاں خوب لیپا پوتی کیے خوب ٹھٹھے لگا رہی تھیں۔

"کنزیٰ! سفر کی دھول نے ہمیں تو بھوتنیاں بنا ڈالا ہوگا۔" کنزیٰ بوجھل دل کے ساتھ اس نامانوس سے ماحول میں ہونق بنی بیٹھی وہاں کی چکاچوند سرگرمیاں دیکھ رہی تھی۔

"تو رہیں نہیں تو کیا؟ اس سے بہتر ہے کہ منہ دھو آئیں۔ مٹی کی جو دس دس انچ تہ جمی ہے۔ وہ تو کم از کم صاف ہوگا۔"

سکینہ خاتون نے متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ شاید وہ ان دونوں کو ہی تلاش رہی تھیں۔ اچانک ان پر نظر پڑتے ہی ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

"تو اماں کو اب کیا ضرورت آپڑی ہے؟" سر پر ٹکا دوپٹا سلیقے سے جماتی وہ طوعاً "وکرہاً" تھکی تھکی مرے مرے قدموں سے ان کی طرف چل دی۔ کنزیٰ وہیں بیٹھی رہی تھی۔

"یہ میری بڑی بیٹی سونیا ہے۔" انہوں نے بڑی گرم جوشی سے سونیا کا ہاتھ دبوچتے اسے متعارف کرایا تھا۔ سونیا نے ہولے سے سلام کیا تو وہ دونوں سلام کا جواب دے کر آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر کے مسکرائیں۔

"بیٹا! یہاں تو سب اپنے ہیں۔ آپ نے یہاں کیوں دوپٹا لے رکھا ہے؟" وہ خالہ حمیدہ تھیں۔ ان کا ہاتھ اس کے دوپٹے کی جانب بڑھا تو وہ بدک کر پیچھے سرکی۔ انہوں نے کھسیا کر ان دونوں کی جانب دیکھا۔

"وہ بس حمیدہ! دراصل گھر کی سب بچیاں ہی باقاعدگی سے سر ڈھانپتی ہیں۔ عبدالغنی صاحب کو نہیں پسند یوں بچیوں کا ننگے سر پھرنا۔ بس عادت سی بن گئی ہے اب ان کی۔"

توجیہہ پیش کرتے اماں نے اس کے سر پر ٹکے دوپٹے اور اسے کڑے تیوروں سے گھورا تو اس نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

"خالہ حمیدہ سنا ہے اپنے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش پاکستان آئی ہوئی ہیں۔ یہ تمام مائیں اور ان کی بیٹیاں شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے گرد بھنبھنا رہی ہیں اور جن میں اماں سرفہرست ہیں۔" سونیا نے تپتے ہوئے سکینہ خاتون کو نظرانداز کیا جو خالہ حمیدہ کے ہمراہ دور سے اسے اپنی جانب بلا رہی تھیں۔ کنزیٰ نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔

سامنے ٹیبل پر دھرا گلاس اٹھا کر اس میں پانی بھرتے ہوئے جوں ہی اس نے منہ سے لگایا تھا کہ ایک شائستہ سی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"تم سکینہ کی بیٹی ہو نا؟" اسے یکدم اچھو آگیا تو وہ بری طرح کھانسنے لگی۔

ان خاتون نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں آیا پانی صاف کرتے ہوئے ان کی جانب ممنونیت سے دیکھتے گلاس تھام لیا۔ اس پورے ہال میں شاید وہ واحد خاتون تھیں جنہوں نے بہت سلیقے سے اپنی چادر ایسے اوڑھ رکھی تھی کہ ان کے بال اور گردن مکمل طور پر ڈھانپے گئے تھے۔ ان دونوں کو پہلی نظر میں ہی وہ خاتون بے حد نفیس سی لگیں۔

"میں تمہاری دور پرے کی تائی ہوں۔ محمودہ، تمہارے ابا کے ممیرے بھائی اسلم کی بیوی۔" ان کا لہجہ بے حد شائستہ تھا۔ دونوں نے ادب سے سلام کیا۔

"تم دونوں یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ سب کے درمیان چلو نا۔"

"وہ۔ تائی۔ ہم یہاں ایزی ہیں۔" زبان کی لکنت دور کرتے ہوئے کنزیٰ نے بڑے رسان سے بات مکمل کی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ فردوس آپا نے تو تقریب رکھ کر ہمارے جیسوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔" انہوں نے قدرے ناگواری سے کہتے ہال کی طرف دیکھا جو ہال کم میرج بیورو کا آفس زیادہ لگ رہا تھا۔ تمام مائیں اپنی بنی سنوری بیٹیوں کو بیٹوں کی ماؤں کے سامنے بڑھ چڑھ کر پیش کر رہی تھیں۔

"تو ادھر دیکھو چاچا دلاور کی نور چشمی کو آج تو وہ رنگ روپ ہے جناب کا کہ اس کے آگے باقی لڑکیوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔" سونیا کی نظروں کے تعاقب میں اس نے بھی دیکھا تو مارے حیرت کے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ گہرا سرخ رنگ کا کھلے گلے اور بغیر آستینوں کا ٹخنوں تک آتا فراک جس کے اوپر بھاری کام سے مزین دوپٹا اوڑھے، بال کھلے چھوڑے اک ادا سے اٹھلا کر چلتی ہال میں تمام خواتین سے مل رہی تھی۔

وہ دلہن کی بہن تھی اور اس حوالے سے اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ ہال میں موجود تمام خواتین و حضرات اس کے ہال میں آنے کے بعد اس سے نظریں نہ ہٹا سکے۔

"ہائے میرے بھائی کا تو ایمان ہی جا تا رہے گا۔ کیسے کیسے شاہکار دیکھ رہا ہے بیٹھا۔" کنزیٰ نے ہال میں نظر دوڑاتے شمعون کی جانب دیکھا جو لاپروا سا بیٹھا موبائل پر لگا ہوا تھا۔

کھانا لگا تو سب حسب معمول کھانے پر ایسے ٹوٹے جیسے ہفتے بھر کی بھوک جمع ہو۔ "آنٹی! آپ نے صحیح سے لیا نہیں۔ لائیں میں آپ کو لا دوں۔" نازنین بے حد شیریں لہجے میں کہتی تائی محمودہ کے سر ہوئی۔

"نہیں بیٹا، میں اتنا نہیں کھاتی، ہاضمے کا مسئلہ ہے۔" انہوں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھپکتے عذر پیش کیا۔ سکینہ خاتون بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں جو وہیں ٹک گئی تھیں۔

"تکلف مت کیجیے گا بالکل بھی۔" کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتی وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی ادا سے بال جھٹک کر بولی۔ سکینہ خاتون نے اشاروں کنایوں میں سونیا کو تائی محمودہ سے گفتگو کرنے پر اکسایا۔ مگر وہ سر جھکائے اپنے کھانے میں جتی رہی۔ سکینہ خاتون بس دانت پیس کر رہ گئیں۔

"چلیں امی جی مجھے اسپتال پہنچنا ہے۔" ایک خوب صورت اور ہینڈسم سا لڑکا آکر تائی محمودہ سے مخاطب ہوا۔ تائی نے اس سے نازنین کے ساتھ ساتھ ان کا بھی تعارف کرایا۔

"ماشاء اللہ جواد پتر کیسا کڑیل جوان ہو گیا ہے۔" سکینہ خاتون نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیسے ہیں فواد آپ؟ اور آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟" نازنین آگے کو جھک کر اس طرح بیٹھی کہ اس کے گلے کی نمائش ہے جہاں وہ دونوں اور سکینہ خاتون شرم سے لال پڑی تھیں۔ وہیں تائی بھی آب آب ہو گئی تھیں۔ جواد نے ایکدم رخ موڑ لیا تھا۔

"تو آپ سونے تیری باری کلن چھوڑ کھٹی ماری۔" سونیا نے افسوس سے سر ہلاتے محاورہ فٹ کیا تو کنزیٰ نے بری طرح اسے گھورا۔

"بھئی مطلب ہے کہ کسی کام میں ناکامی ہو رہی ہو تو آخری تدبیر کرنا۔" سونیا نے اپنے محاورے کی وضاحت کی تو کنزیٰ مسکرا دی۔ تائی محمودہ، نازنین کی اس حرکت سے خائف ہوتی فوراً ہی فواد کے ہمراہ چل دیں تو نازنین بھی سر جھٹکتی خالہ حمیدہ کی جانب چل دی۔

☆ ☆ ☆

گھر پہنچنے پر سکینہ خاتون نے ان دونوں کے وہ لتے لیے کہ الامان۔ وہ دونوں بھی منہ سر لپیٹے پورا دن بستر توڑتی رہیں۔ سفر کی تھکان ایک طرف اور سکینہ خاتون کی زبان سے نکلنے والے تیر ایک طرف۔ آتے جاتے کچھ نہ کچھ بڑبڑاتیں اور کھا جانے والی نظروں سے ان دونوں کو یوں دیکھتیں گویا آنکھوں سے ہی اندر ثابت نگل جائیں گی۔

"ہائے لوگوں کی بچیاں کتنی ہوشیار ہوتی ہیں۔ ایک یہ ہماری اولاد، ڈالو ڈربے سے نکلی مرغیاں ہیں جو پہلی بار ڈربے سے چھوٹی ہیں۔ پورے ہال میں لڑکیاں

ایسے لشکارے مار رہی تھیں کہ ان کی چمک دمک نظر کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ ایک یہ ہماری لڑکیاں صورت پر فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کے گھڑیال کی مانند بارہ بجا رکھے تھے۔" جب سے وہ لوٹی تھیں اسی طرح جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ پچھلے پورے دن سے وہ اسی قسم کی لعن طعن سن رہی تھیں۔ جب ہمت بالکل جواب دے گئی تو سونیا نے چھکوں پھکوں رونا شروع کردیا۔ دادی نے بے اختیار اسے گلے لگا کر خوب پچکارا۔

"بس کردے سکینہ اب۔ ایک تو" تو ان بچیوں کو اس کھلے ڈلے ماحول میں لے گئی' جہاں ان کا ہم مزاج کوئی نہ تھا۔ اوپر سے جب سے لوٹی ہے انہیں پر ابھلا کہے جارہی ہے۔ بھلا ضرورت ہی کیا تھی اس قسم کی شادی میں جانے کی۔" دادی کے ٹوکنے پر سکینہ خاتون کو گویا پتنگے ہی لگ گئے۔

آج کل کی لڑکیوں کی طرح بجنا سنورنا انہیں پسند نہیں' محفلوں میں جانا انہیں پسند نہیں۔ کون بیاہے گا اس بابا آدم کے زمانے کی بڑھی روح کو؟ ان کے لہجے میں اندیشہ در آیا۔ مستقبل کی فکر کا سایہ چہرے پر لہرا رہا تھا۔

دادی نے پاس بیٹھی سونیا کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔ "اللہ مالک ہے ہماری بچیوں کا۔"

"میں کہہ کہہ کر تھک گئی کہ اٹھو لڑکیو' آگے آگے ہو' مگر مجال ہے جو ٹس سے مس ہوئی ہوں۔ محمودہ بھابھی ساتھ ہی بیٹھی تھیں' مگر مجال ہے جو منہ سے لفظ بھی پھوٹا ہو۔ بس دوپٹا سر پر اوڑھے آنکھیں موندے گھنگھنیاں منہ میں ڈالے بیٹھی رہیں۔"

لال بھبھوکا ہوتی سکینہ خاتون نے الماری کے پٹ بند کرتے ہوئے سامنے سے آتی عطیہ کے بلاوجہ دو دھموکے جڑ دیے تو وہ بلبلا اٹھی۔

"اماں! میں نے کیا کیا ہے؟"

"خدا کا خوف کر سکینہ۔" دادی نے عطیہ کو خود سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں کہ اب ان بوڑھی ہڈیوں میں سوائے کسی کو حوصلہ و تشفی دینے کے اور دم خم نہ تھا۔

"بس رہنے دیں اماں! سچ کہا ہے کسی نے جو پہلے مارے وہ میر۔ آہ... اب تو وہ پانی ملتان بہہ گیا۔" سینے پر دوہتڑ رسید کرتے خشمگیں نگاہوں سے سونیا کی جانب دیکھا جو دادی سے لگی بیٹھی تھی۔

"یہ کس ربی کی بات ہو رہی ہے۔ ملتان میں سیلاب آنے والا ہے کیا؟" ماریہ جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی موقع کی نزاکت کو نہ سمجھتے ہوئے معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔ سکینہ نے گھور کر ماریہ کو دیکھا تو وہ دانتوں تلے زبان دبا کر بے چارگی سے بولی۔

"وہ تائی! میرے امتحان ہیں نا تو اتنے عرصے میں ٹی وی نہیں دیکھا۔ اس لیے اندازہ نہیں ہے کہ ملتان میں سیلاب آیا ہوا ہے۔" ماریہ کی اس حد درجہ سادگی پر وہ دونوں سر تھام کر بیٹھ گئیں کہ اب اماں کے قہر سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

"چل دفع ہو ناس پٹی کہیں کی۔" اسے پرے دھکیلتی سکینہ خاتون نے باہر کی راہ لی اور ماریہ حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی۔

"تائی اماں کو کیا ہوا ہے دادی؟" ان دونوں کے لٹکے چہرے دیکھ کر اس نے براہ راست انہیں مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا تو دادی سے پوچھ بیٹھی۔ "کچھ نہیں دماغ چل گیا ہے۔ تم لوگ دل پر مت لیا کرو اس کی باتوں کو۔ زبان کی تھوڑی تیز ہے۔ مگر دل کی بہت اچھی ہے۔"

دادی نے بڑے سبھاؤ سے برابر بیٹھی بچیوں کی دل جوئی کی۔ وہ دونوں خود بھی ماں کی فطرت سے خوب واقف تھیں۔ اس لیے سب بھول بھال باتوں میں لگ گئیں۔

"سونی! تیری پھپھو شادی پر نہیں آئیں؟" دادی کو اچانک یاد آیا۔

"نہیں راحیلہ پھپھو کی فیملی میں سے کسی نے شرکت نہیں کی۔"

"ہفتے سے اوپر ہو گیا ہے اسے پاکستان آئے مگر توفیق نہ ہوئی کہ بوڑھی ماں سے ملنے ہی آجائے دیکھ

میں ہو کر دو گھڑی ماں سے ملنے نہیں آسکتی کیا؟" دادی آبدیدہ سی ہو گئیں۔

راحیلہ پھپھو کی یہ عادت ان سب کو بھی کھلتی تھی کہ مہینوں بعد بھی فون کرتیں۔ اب تو وہ نہ جانے کتنے سالوں بعد پاکستان لوٹی تھیں۔ مگر ہفتہ ہونے کو آیا تب بھی ملنے نہ آئیں۔ لاہور اتنی بھی دور نہ تھا۔

سونیا کو جھریوں بھرے کپکپاتے وجود پر بے طرح ترس اور پیار آیا تو اس نے بے اختیار دادی کے جھریوں بھرے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

شام کا وقت تھا اور دادی عصر کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ دروازے سے سونیا نے اندر جھانکا۔

"دادی! بھلا بوجھیں تو کون آیا ہے؟" وہ چونکیں اور جوں ہی بے ساختہ لبوں سے بیٹی کا نام پھسلا تو دروازے کی چوکھٹ پر سونیا سے پیچھے ہی راحیلہ انہیں کھڑی نظر آئیں۔

"میری بچی۔" اپنی چادر پرے کھسکاتے انہوں نے بے ساختہ باہیں پھیلا دیں۔ راحیلہ بھی بے اختیار سی ماں کے گلے لگ گئیں۔

پورے سات برس بعد راحیلہ پاکستان لوٹی تھیں اور ان سات برسوں میں اماں کی جان کیسے سولی پر ٹنگی رہی تھی۔ یہ وہ بہت اچھے سے جانتی تھیں۔

نہ جانے کتنی دیر دونوں ماں' بیٹی شکوے' شکایات کرتی رہیں۔ آنسو دل کے غبار دھوتے چلے گئے۔ سکینہ خاتون نے کچن سونیا اور صفیہ کے حوالے کر دیا۔ بختیار بیگم' فرحت بہار اور وہ اماں کے کمرے میں ہی محفل جمائے بیٹھی تھیں۔ راحیلہ پھپھو ڈرائیور کے ہمراہ اکیلی ہی لاہور سے ملنے چلی آئی تھیں۔ ان کے سسرال میں شادیوں اور دعوتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس سبب شوہر اور بچے ہمراہ نہ آسکے۔

"تائی اماں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ رات کے کھانے کا اہتمام بھی کرنا ہے کہ نہیں؟" صفیہ نے چائے پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے سونیا کو مخاطب کیا۔

"فی الحال تو چائے کا انتظام ہی کرتے ہیں۔ رات کے کھانے کا اہتمام کرنا ہوا تو اماں بتا جائیں گی۔" سونیا نے سموسے تل کر پلیٹ میں نکالے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ فریزر میں سموسے اور شامی کباب پڑے تھے۔ پرانی برتنوں کی الماری میں سے کسی پرانے ٹین کی کنستر میں سے بسکٹ اور نمکو کے پیکٹ بھی برآمد ہو گئے تھے۔ جو فرحت بہار ایسے کسی ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ہی چھپا کر رکھتی تھیں۔ تمام اشیا قرینے سے پلیٹوں میں سجائے ٹرے میں رکھ کر سونیا' دادی کے کمرے میں اندر داخل ہوئی تو دادی کے چہرے سے مانو روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ کر اس نے راحیلہ پھپھو کو سلام کیا۔

"ماشاء اللہ سے سونیا نے بہت روپ نکالا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے' بہت پیاری ہو گئی ہے یہ بھابھی بیگم۔" راحیلہ پھپھو کی تعریف پر جھینپتے ہوئے وہ وہیں دادی کے پاس بیٹھ گئی جو اب اس کی تعریفیں کر رہی تھیں اور آج اس پر اپنی وہ خصوصیات بھی عیاں ہو رہی تھیں جو سرے سے اس میں موجود ہی نہیں تھیں۔ بے حد اصرار کے باوجود بھی راحیلہ پھپھو رات کے کھانے پر نہ رکیں اور جلد دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس چلی گئی تھیں۔

کام نپٹا کر وہ سب کی سب کچے صحن میں چلی آئی تھیں۔ جہاں بہار کی آمد آمد تھی۔ ابھی پچھلے سال ہی سکینہ خاتون نے ان سب کی فرمائش پر بار بار شمعون سے کہہ کر کچے صحن کے ایک حصے میں گھاس لگوائی تھی۔

"کل سے صحن میں چاول آئے پڑے ہیں اور اماں نے کہا تھا کہ آج سارے چاول صاف کرنا ہے۔ خالص باسمتی چاول ہیں جو انکل زبیر نے بھجوائے ہیں۔" انکل زبیر دادی کے رشتے کے بھتیجے تھے جو سرگودھا شہر میں رہتے تھے اور کبھی انہیں اپنے چاول کے کھیتوں کی پیداوار انہیں بھجوایا کرتے تو کبھی اپنے مالٹوں کے باغ کے تازہ پھل۔ ان سب میں سے آج

تک کوئی بھی انکل زبیر کے گھر نہ گئی تھی۔ جبکہ انکل زبیر بمعہ فیملی سال میں ایک آدھ چکر لگا جاتے تھے۔ جن کے دو بیٹے عاطف' آصف اور ایک بیٹی عاصمہ تھی۔ جس سے ان کی کافی حد تک دوستی تھی۔ ابھی بھی وہ چاول کے ساتھ آئے مالٹوں میں سے تازہ مالٹے کھا کر چھلکے وہیں کیاریوں میں پھینک رہی تھیں۔

"ہاں بس یہ انٹرویو پڑھ لیں' پھر دوپہر کے کھانے کے بعد کام نپٹالیں گے۔" صفیہ نے جوابا" آواز بلند انٹرویو پڑھ رہی تھی۔ مالٹے کی دو قاشیں بیک وقت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ کام رات سے پہلے ختم کرنا ہے۔ آج میں نے شمعون کو دھمکا کر بھیجا ہے کہ واپسی پر وہ رسالے لے کر آئے گا۔ ورنہ رات میں مونگ پھلی اور قہوہ کی امید نہ رکھے۔" عطیہ نے نرم گھاس پر پیر رگڑتے جماہی روکی۔

"دھمکانے کی کیا ضرورت تھی بے چارے کو' تم اسے بس کہہ دیتیں تو بھی وہ لے آتا۔ تمہارے کام تو ویسے بھی بھاگ بھاگ کر کرتا ہے۔" کنزیٰ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ثوبیہ کو کہنی ماری۔ گویا اب ان کی چھیڑ خوانی شروع تھی۔

"کتنی پروا ہے نا اپنے بھائی کی۔" عطیہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"کیوں نہ ہو ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔" کنزیٰ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ویسے پوری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ آپ میں ایک چنڈال نند بننے کی۔" سونیا ہنس دی تو عطیہ نے بہن کو گھورا۔

وہ سب شمعون کی عطیہ کے لیے پسندیدگی سے واقف تھیں۔ اس لیے سب ہی مل کر اسے ستانے کو تیار ہو جاتیں۔ کہیں نہ کہیں انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ یہ پسندیدگی یک طرفہ نہ تھی۔ مگر عطیہ اتنی پکی تھی کہ ان سب کے بہت بار کریدنے کے باوجود بھی اس نے کبھی شمعون کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار تو در کنار کبھی اشارتا" بھی کچھ ایسا نہ کیا کہ ان سب کو کوئی سرا ہاتھ آتا۔ مگر وہ سب بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ مجال ہے جو چھیڑنے سے باز آتیں۔ بقول کنول کے رائی ہو تو ہی پہاڑ بنتا ہے۔ جب بھی عطیہ شمعون کا کوئی کام کرتی تو وہ سب کورس میں اپنے اپنے گلے ضرور صاف کرتیں یا کبھی عطیہ بختیار بیگم کے کسی کام میں ہاتھ بٹاتی تو وہ سب مل کر اسے ساس کی خدمت کے طعنے دیتیں بسا اوقات کنزیٰ ہی اپنے نند ہونے کا فخر جتاتی۔ ایسے تمام مواقع پر کبھی عطیہ محض انہیں گھور کر رہ جاتی اور کبھی نظر انداز کر کے ڈھیٹ بنی سنتی رہتی۔ مگر کبھی اپنے کسی عمل سے حتیٰ کہ اپنے تاثرات سے بھی پسندیدگی کا اظہار نہ کیا تھا۔

"تم میری بہن ہو یا اس کی؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں آستین میں سانپ پال رہی ہوں۔" ابھی وہ سونیا کو کھری کھری سنانے کا ارادہ رکھتی ہی تھی کہ ان سب کے فلک شگاف قہقہوں نے اسے چپ سادھ لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہ اس قسم کی باتیں براہ راست شمعون کے سامنے' اس کی موجودگی میں نہ کرتی تھیں۔

"ویسے سنا ہے کہ پھپھو راحیلہ' کاشف بھائی کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں اور اشارتا" دادی سے اس سلسلے میں بات بھی کر کے گئی ہیں۔ کاشف بھائی کا قرعہ سونیا عبدالغنی کے نام نکلا ہے۔" عطیہ نے ابرو اچکاتے ہوئے نئی معلومات بہم پہنچائیں۔ سب کو ہی اس خبر پر گویا کرنٹ لگا تھا۔ سونیا کی باہر نکلتی بتیسی یکدم اندر ہو گئی تھی۔

"ہائیں! یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟" کنول اور صفیہ کے تو مارے تجسس کے منہ کھلے رہ گئے۔

"بس جی کبھی غرور نہیں کیا۔ ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔" اس نے فرضی کالر جھاڑے۔

"ویسے سنا ہے کاشف بھائی بڑے ڈیشنگ ہیں اور اب تو وہاں اپنا اسٹور چلاتے ہیں۔" عطیہ کی اس قدر معلومات پر وہ سب کی سب حیران تھیں کہ انہیں تو اس معاملے کی بھنک بھی نہ پڑ سکی اور وہ تھی جو پوری

بات کی تہ تک بھی جا چکی تھی۔ یوں ہی تو وہ سب اسے بی بی سی کا نام نہ دیتی تھیں۔

"کس قدر کمینی ہے یہ لڑکی۔ رات سے اسے سارے معاملے کا پتا ہے' مجال ہے جو ہمیں کانوں کان خبر بھی ہونے دی ہو۔ گھنی میسنی کہیں کی۔" سونیا نے دانت پیستے دو چٹکیاں بہن کے بازو میں کاٹیں تو سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

پھر راحیلہ پھپھو تو اپنے بیٹے کا رشتہ نہ لائیں۔ البتہ محمودہ مامی کا فون عبدالغنی کے پاس ضرور آیا تھا' یہ مطلع کرنے کو کہ وہ اگلے ہفتے کسی بھی روز اپنی بیٹی اور شوہر کے ہمراہ کنزیٰ کو دیکھنے آ رہی ہیں۔ سادہ اور خاموش طبع سی کنزیٰ مامی محمودہ کو بہت بھائی تھی اور وہ فون پر ہی اس کی بہت تعریفیں کرتی رہیں۔ آپس میں بے شک وہ ساتوں کتنی ہی شوخ اور شرارتی تھیں۔ مگر درحقیقت ان کی پرورش ان خطوط پر کی گئی تھی کہ ان ساتوں میں ہی مطلب پرستی اور چھچھورا پن نہ تھی۔

دو دن بعد محمودہ مامی نے آنا تھا۔ بختیار بیگم نے ایک روز پہلے ہی کنزیٰ کو کالج جانے سے منع کیا تھا۔ مگر ان دنوں اس کے انتہائی اہم ٹیسٹ چل رہے تھے۔ لہٰذا جانا بھی ضروری تھا۔ یوں بھی محمودہ مامی نے شام تک آنا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ میں لا رہی تھیں۔ تاکہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور گھر والے بھی لڑکے سے مل لیں۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے ایک روز قبل ہی عبدالغنی صاحب سے فون کر کے اجازت طلب کی تھی۔ عبدالغنی صاحب پس و پیش کا شکار تھے کہ کیا جواب دیں۔ مگر دادی نے از خود اجازت دے دی کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اب عبدالغنی کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہ بچی تھی۔

صفیہ اور سونیا بھی اس روز اسکول گئی تھیں۔ البتہ ثوبیہ اور کنول نے اس روز سلائی سینٹر سے چھٹی کی تاکہ گھر میں بہت سے کام تھے۔ قوی امید تھی کہ وہ لوگ رات میں وہیں ٹھہریں گے اس لیے سکینہ خاتون نے بڑا کمرہ اور لڑکوں کا کمرہ مہمانوں کے لیے صاف کروا دیا تھا۔ شام کی چائے کے ساتھ رات کے کھانے کا انتظام بھی ضروری تھا۔ ٹیسٹ دینے کے بعد کنزیٰ نے بارہ بجے سے پہلے پہلے گھر ہونا تھا۔ لہٰذا اسے جانے کی اجازت مل گئی۔

سونیا کلاس لے کر واپس اسٹاف روم میں آئی تھی' دن کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ ابھی وہ اسٹاف روم میں آکر بیٹھی ہی تھی اور چائے پینے کے لیے تھرماس سے کپ میں گرم پانی انڈیلا کہ اس کے بیگ میں رکھا موبائل بج اٹھا۔ اس نے بیگ کھول کر موبائل نکالا۔ کال اٹینڈ کر کے اس نے خاموشی سے کان سے موبائل لگا لیا۔

"ہیلو۔۔۔ سونی۔۔۔ سونی میں۔۔۔ میں کنزیٰ ہوں۔" دوسری طرف گھبرائی اور بھیگی آواز جس کی تھی اسے پہچاننے میں اسے چند سیکنڈ بھی نہ لگے تھے۔

"کنزیٰ۔" اس نے سامنے دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دن کے بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اس وقت تو کنزیٰ کو گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ وہ تو کسی لوکل نمبر سے فون کر رہی تھی جو شاید کسی دکان یا پی سی او کا تھا اور وہ رو کیوں رہی تھی؟ خدا خیر کرے۔ دہلتے دل اور ہزار وسوسوں کے ساتھ اس نے خدا سے دعا کی تھی۔

"کنزیٰ کیا ہوا ہے تم رو کیوں رہی ہو؟ اور یہ نمبر۔ تم کہاں ہو؟ سب ٹھیک ہے نا؟" پریشانی اور گھبراہٹ میں وہ یکے بعد دیگرے سوالات کرتی چلی گئی۔ دوسری طرف کنزیٰ جو نہ جانے کب سے ضبط کیے کھڑی تھی۔ یک دم اس کا صبر جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کنزیٰ کیا ہوا ہے؟ بتاؤ نا۔" اب کی بار اسے سخت تشویش ہوئی تھی۔ کنزیٰ کا یوں رونا اسے بری طرح پریشان کیے دے رہا تھا۔

"خدا کے لیے کنزیٰ کچھ بولو میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" اس نے خود کو سنبھال کر قدرے نرم مگر ٹھوس

لہجے میں کہا۔
"سونی! میں یہاں اڈے پر ہوں۔ خان کی دکان پر۔"
"خان کی دکان پر کیا کر رہی ہو؟ گھر کیوں نہیں گئیں؟ تمہیں اس وقت گھر ہونا تھا۔"
"میں گھر گئی تھی مگر مجھے گھر نہیں ملا۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ پھر سے رو دی۔
"کیا مطلب ہے تمہیں راستہ نہیں معلوم؟" سونیا کی حیرت اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ کنزیٰ ہمیشہ عطیہ کے ساتھ ہی گھر واپس آتی تھی۔ شاید آج اکیلے لوٹنے پر وہ راستہ بھول گئی تھی۔
"مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں گھر تک گئی تھی' اپنی گلی میں پہنچی تھی مگر مجھے گھر نہیں ملا۔" وہ اب کی بار ہچکیاں لے رہی تھی اور اس کی بات سونیا کی سمجھ سے باہر تھی۔ "کنزیٰ کیا بول رہی ہو تم؟"
"میں سچ کہہ رہی ہوں سونی! وہاں گھر نہیں ہے۔ وہاں ہمارا گھر نہیں ہے۔ اردگرد سب کے گھر تھے مگر ہمارا گھر نہیں تھا۔" سونیا کی سمجھ میں واقعتاً" کنزیٰ کی بات نہیں آرہی تھی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اردگرد سب گھر موجود تھے مگر ان کا گھر نہیں تھا۔ وہ گھر جس سے صبح ہی وہ سب آئی تھیں۔
"اچھا تم وہیں خان کی دکان پر بیٹھو میں شمعون سے کہتی ہوں وہ تمہیں لے جائے گا۔ ٹھیک ہے؟ وہاں سے ہلنا مت۔ ابھی شمعون پہنچ جائے گا۔" اس کو تسلی اور ہدایت دے کر سونیا نے عجلت میں شمعون کو فون کرکے کسی حد تک صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے لیے بھی صورت حال اتنی ہی غیر یقینی تھی جتنی سونیا کے لیے مگر وہ فوراً" سے پیشتر اڈے کی جانب روانہ ہو گیا۔ سمجھی ناسمجھی کی کیفیت میں گھرا خان اسٹیشنرز والے کی دکان پر پہنچا تھا۔ جس سے اس کی پرانی واقفیت تھی۔ دکان پر اسے دور سے ہی ڈری سہمی کنزیٰ نظر آگئی جو دور سے اسے آتا دیکھ کر بھاگ کر اس کی جانب لپکی اور بے اختیاری کیفیت میں اس کے گلے لگ گئی۔
"مجھے پوری بات بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟" کتنی دیر وہ اپنے سینے سے لگی روتی بلکتی کنزیٰ کو تھپکتا اور چپ کراتا رہا۔ ہچکیوں کے دوران اس نے ساری روداد من و عن سنا ڈالی جو اس سے قبل وہ فون پر سونیا کو سنا چکی تھی۔
"یہ کیسے ممکن ہے نمی کہ ہمارا گھر وہاں نہ ہو؟"
"خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں' وہاں ہمارا گھر نہیں تھا۔ میرا یقین کرو' خدا کا واسطہ ہے۔ کوئی بھی میرا یقین کیوں نہیں کر رہا ہے۔"
وہ پھر سے آبدیدہ ہو گئی جبکہ شمعون کی سمجھ سے بالاتر تھا یہ تمام قصہ۔ اور ادھر گھر والے یقیناً" پریشان ہوں گے کہ اب تک کنزیٰ کیوں نہیں پہنچی۔
وہ کنزیٰ کا بیگ آگے موٹر سائیکل پر لٹکا کر اس کی طرف مڑا اور بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ سارے رستے وہ اپنے پیچھے بیٹھے وجود میں لرزش اور کپکپاہٹ محسوس کرتا رہا اور دل عجیب سے دکھ سے بھر آیا۔ اپنے محلے کے نکڑ سے مڑتے ہی اسے سامنے سرخ اینٹوں کا بنا کھلا کشادہ گھر نظر آیا جو اسی کا تھا اور دور سے کسی حویلی کی مانند دکھتا تھا۔ موٹر سائیکل سامنے والے خورشید صاحب کے گھر کے آگے روکتا وہ پرسکون سا موٹر سائیکل سے اترا اور پیچھے کھڑی کنزیٰ کی جانب مڑا تو اگلے لمحے ہی اس کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔ کنزیٰ کے چہرے پر چھائی سراسیمگی اسے پھر سے مضطرب کر گئی۔
"نمی دیکھو' ہمارا گھر وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔" اور شمعون کو لگا کہ کنزیٰ کے بدن سے سارا خون نچڑ گیا ہو۔
وہ اب کسی سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مزید کوئی بھی سوال کیے بغیر خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا' موٹر سائیکل وہیں گلی کے نکڑ پر کھڑا چھوڑ کر گھر کی طرف لے آیا۔ وہ میکانکی انداز میں اس کے ساتھ کھنچی چلی گئی۔ گویا پتھر کی مورتی ہو۔ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی شمعون نے اس کا ہاتھ یکدم چھوڑ کر اس کی

طرف رخ موڑ کر دیکھا جو بے یقینی سے پلکیں جھپک رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے تو یہاں گھر نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی سب کچھ پہلے کی طرح روشن اور عیاں تھا۔ وہی اس کا پیارا گھر جہاں وہ اپنے بہت سے پیارے رشتوں کے ہمراہ رہتی تھی۔ شمعون جانچتی نظروں سے نجانے کتنی دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا جو اب تک بے یقینی کے عالم میں کھڑی کھڑی تھی۔
"ارے کنزیٰ تم آگئیں؟ کہاں رہ گئی تھیں یار؟ کچھ معلوم بھی ہے کتنا وقت لگا دیا ہے تم تو کہہ کر گئی تھیں کہ۔۔۔" ثوبیہ جو باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ سامنے گیٹ کے سامنے کھڑی کنزیٰ کو دیکھ کر اس کی طرف لپکی اور اپنی ہی دھن میں بولتے ہوئے جوں ہی شمعون پر نظر پڑی تو اپنی جگہ ٹھٹکی جو اپنی شہادت کی انگلی لبوں پر رکھے اس سے خاموش ہو جانے کی درخواست کر رہا تھا۔ یکدم اس کی زبان کو بریک لگ گئی اسے کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ شمعون اس وقت کبھی گھر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کنزیٰ اس سے پہلے کبھی واپسی پر شمعون کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے غور سے کنزیٰ کو دیکھا جو بے خودی کی کیفیت میں کھڑی سامنے شہتوت کے درخت کے تنے سے تکی خود کلامی کر رہی تھی۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تب ہی وہ کچھ عجیب سی دکھ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر شمعون کی طرف دیکھا۔
"ثوبیہ! نمی کو کمرے میں لے جاؤ اور نمی! تم سو جاؤ تھک گئی ہو۔ رات میں بھی دیر تک جاگ کر پڑھتی رہی ہو۔ نیند پوری نہیں ہوئی تمہاری۔" بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام کر اس نے تھپکتے ہوئے اسی طرح ہولے سے چھوڑ دیا جیسے تھاما تھا۔ کنزیٰ نے بغیر کسی چوں و چرا کے میکانکی انداز میں اسی طرح ثوبیہ کے ہمراہ قدم بڑھا دیے۔ ثوبیہ نے برآمدے سے مڑ کر ایک مرتبہ صحن کے بیچوں بیچ کھڑے شمعون کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر تفکر اور اضطراب عود کر آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

باقی کا پورا دن ایک ایک پل اس نے اسکول میں بے حد بے چینی سے گزارا مگر وقت تھا کہ گزر کے نہ دے رہا تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی شمعون نے اسے کال کرکے بتایا تھا کہ وہ خود اڈے سے کنزیٰ کو گھر لے جا کر ثوبیہ کے حوالے کرکے آیا ہے مگر پھر بھی نجانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی نے اسے گھیر رکھا تھا۔ چھٹی ہونے پر وہ دونوں پیدل ہی گھر کی جانب نکلی تھیں۔ پورے رستے خلاف توقع سونیا نے خود سے کوئی بات نہ کی۔ یہ صفیہ ہی تھی جو رستہ کاٹنے کے لیے اسے گاہے گاہے مخاطب کرتی مگر جواباً" سونیا کی "ہوں ہاں" اسے مزید بولنے سے باز رکھ دیتی۔
دونوں خاموشی سے گھر کی دہلیز پار کرکے اندر داخل ہوئیں تو گھر کی غیر معمولی خاموشی نے ان کا استقبال کیا۔ روز اسکول سے لوٹنے پر دروازے سے داخل ہوتے ہی ماریہ' بتول اور ثوبیہ کی نوک جھونک سنائی دیتی تو دن بھر کی تھکان دور ہو جاتی مگر آج تو پورے گھر پر ہو کا عالم تھا۔ صفیہ نے سونیا کے تاثرات کی جانچ کے لیے اس کے چہرے کو کن انکھیوں سے دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے کا چھایا تکدر پھر سے عود آیا تھا۔ برآمدے میں دھری چارپائی پر اپنے پرس رکھ کر وہ وہیں بیٹھ گئیں۔
فرحت بہار جو باورچی خانے سے برآمد ہوئیں تو انہیں یوں خاموشی سے برآمدے میں بیٹھا دیکھ کر گویا ہوئیں۔ "آگئیں تم دونوں؟ چلو اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کرلو میں کھانا لگاتی ہوں۔" دونوں نے اکٹھے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔
"اماں کنزیٰ کیسی ہے؟" صفیہ نے لب پر مچلتے سوال کو ان کے سامنے کر ہی ڈالا تو انہوں نے گہری سانس بھری۔
"بہتر ہے۔ جب سے لوٹی ہے سو رہی ہے۔ تم لوگ مت جگانا اسے۔ سونے دو' رات کی جاگ رہی

ہے تب ہی دماغ تھک گیا ہے۔"

وہ باورچی خانے کی طرف واپس مڑ گئیں۔ ان دونوں کی اب بھی تسلی نہ ہوئی تھی مگر دونوں مرے مرے قدموں سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے چل دیں۔
کھانے کے دسترخوان پر بھی وہ سب خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں۔ کنزیٰ کو کسی نے کھانے کے لیے بھی نہیں جگایا تھا۔ کھانا کھا کر باقی ماندہ کام نبٹا کر وہ سب وہیں برآمدے میں ہی بیٹھ گئیں۔ شام ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا اور وہ لوگ بس آنے ہی والے تھے۔
عطیہ نے کنزیٰ کا جامنی رنگ کا فراک پاجامہ استری کر کے لٹکا دیا۔ جس پر سفید دھاگے کا ہلکا سا کام ہوا تھا۔ آج پہلی مرتبہ وہ خوشی کے موقع پر بھی اس قدر اداس اور خاموش تھیں۔ شام سے قبل ہی کنزیٰ جاگ گئی تو وہ سب اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ دوپہر کی نسبت اس کی حالت اب بہتر تھی۔ وہ حسب معمول ان سے باتیں کرنے لگی تو ان کے دل کا بوجھ بھی کسی حد تک چھٹنے لگا۔ عطیہ نے کھانا لانے کا پوچھا تو کنزیٰ نے منع کر دیا۔ سر میں درد کی وجہ سے اس نے چائے بسکٹ پر ہی اکتفا کیا۔ شام پانچ بجے کے قریب سکینہ خاتون نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دبی آواز میں انہیں کھرکا۔
"لڑکیو! وہ لوگ آ گئے ہیں۔ تم سب باورچی خانے میں مل کر کام سمیٹو اور کسی چیز کی کمی نہ ہو اور خبردار مجھے تم لوگوں کے فالتو کے ٹھٹھے لگانے کی آوازیں نہ آئیں اور سونی! تم کنزیٰ کے پاس ہی رہو اور اسے تیار کرا دو۔" انہیں مناسب ہدایات دیتی وہ واپس بڑے کمرے میں چلی گئیں۔ کنزیٰ نے لباس تبدیل کیا تو سونی نے اسے مناسب سا تیار کر دیا۔ ہلکی سی سرخی اور کانوں میں بڑے آویزوں نے ہی اس کے روپ کو دہکا دیا۔ رہی سہی کسر سونیا کے ایک دوبار چھیڑنے پر اس کے دہکتے گالوں نے پوری کر دی تھی۔
"سونی باجی! میں لڑکا دیکھ کر آئی ہوں۔ براڈشنگ ہے بلکہ ان کی بہن لبنیٰ بھی بڑی پیاری ہیں۔" ماریہ اندر آتے ہی لہک لہک کر بتانے لگی۔

"ہماری کنزیٰ کسی سے کم ہے کیا؟" سونیا نے پیار سے کنزیٰ کی ٹھوڑی کو چھوا تو وہ جھینپ گئی۔
"صحیح جوڑی لگے گی دونوں کی۔" ماریہ نے بسکٹ منہ میں ڈال کر بھرے منہ سے کہا تو کنزیٰ نے اسے گھورا۔ وہ ہنستے ہوئے باہر چلی گئی۔ سکینہ خاتون نے اندر جھانکتے ہوئے سونیا کو اشارہ دیا کہ کنزیٰ کو ساتھ لیے بڑے کمرے میں آ جائے۔ کنزیٰ شرمائی لجائی دھیرے دھیرے قدم رکھتی سونیا کے پیچھے چلتی بڑے کمرے میں داخل ہوئی اور کسی کی بھی جانب دیکھے بغیر سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔" سب کی نظروں میں ستائش ابھری اور بھائی کے برابر بیٹھی لبنیٰ بھی متوقع بھابھی کو دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ سکینہ خاتون نے اپنے برابر جگہ بناتے کنزیٰ کو ٹھیک اس جگہ پر بٹھایا' جہاں عین مقابل دانیال بیٹھا تھا۔ وہ سر جھکائے نظریں ہاتھوں پر ٹکائے بیٹھی رہی۔ بڑوں کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو چل رہی تھی جب سونیا اس کے برابر آ کر بیٹھی اور سب سے نظر بچا کر اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔
"اوپر نظر اٹھا کر ایک بار دیکھ تو لو' سامنے ہی ہمارے جیجا جی بیٹھے ہیں۔" بمشکل اپنی مسکراہٹ دباتے کنزیٰ نے چور نگاہوں سے سامنے بیٹھے دانیال کی جانب دیکھا تو اس کی نظریں جم سی گئیں۔ اس نے حیران نگاہوں سے لبنیٰ' تائی محمودہ اور تایا اسلم کی جانب دیکھا اسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے بیٹھا سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا شخص اس کی زندگی کے ہم سفر کے طور پر چنا گیا ہے۔ آنکھوں میں حیرت سموئے اس نے سونیا کی طرف دیکھا۔ کیا وہ واقعی نصیبا تھی؟ کیا سامنے بیٹھے شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس کا نصیب چنا تھا؟ سونیا نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں تحیر اور بے یقینی کو جانچا تو اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔
"کیا ہوا؟ کیا یقین نہیں آ رہا خود کی قسمت پر؟" اسے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا اپنی قسمت پر

قدرت نے اس کے ساتھ یہ کیسا عجیب مذاق کیا ہے۔ اسے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ سامنے بیٹھ چھوٹے قد کا کالی رنگت اور بھدے نقوش کا گنجا شخص اس کے حصے میں آیا ہے۔ اسے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ بدصورت شخص اس کے گھر والوں کی پسند ہے۔ وہ ایک آخری نظر اس مکروہ شخص پر ڈالتے اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں پر بند باندھتے تیزی سے اٹھ کر باہر کی جانب چلی گئی۔ سونیا اس کے اس ردعمل پر ہکابکا رہ گئی تھی۔ سکینہ خاتون کے ماتھے پر واضح لکیریں ابھری تھیں۔

"کنزیٰ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ آج کالج میں بڑا اہم ٹیسٹ تھا تو رات بھر پڑھنے کی وجہ سے طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" فرحت بہار نے سونیا کو اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ محمودہ تائی نے مسکرا کر بات بدل دی۔ وہ پہلے ہی کنزیٰ سے مل چکی تھیں اور کسی حد تک اس کی فطرت سے واقف تھیں۔ مگر برابر بیٹھی لبنیٰ کے چہرے کے تاثرات سے واضح تھا کہ اسے اپنی ہونے والی بھابھی کا یوں یکدم سب کے درمیان سے اٹھ کر جانا قطعاً" پسند نہیں آیا۔ سونیا خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جہاں کنزیٰ کنول اور ثوبیہ سے لگی سسک رہی تھی اور وہ دونوں حیران پریشان کھڑی اس کے رونے کا سبب دریافت کر رہی تھیں۔

"کیا ہوا ہے کنزیٰ! تم یکدم یوں سب کے درمیان سے بغیر بتائے بغیر کسی وجہ کے کیوں اٹھ کر چلی آئی ہو؟" سونیا نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرا تو وہ بھڑک گئی۔

"یہ۔ یہ ہے وہ گڈ لکنگ اور ہینڈسم؟" سونیا نے ناسمجھی کے عالم میں اس کی جانب دیکھا۔

"آہستہ بولو کنزیٰ وہ لوگ سن لیں گے۔" مصفیہ جو کچھ دیر پہلے ہی اندر داخل ہوئی تھی اس کے اونچی آواز میں بولنے پر دبی دبی آواز میں بولی۔

"تو سن لیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ سنیں۔ ان کو نہیں پتا کہ اپنے اس بدصورت بیٹے کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔" اس کے لفظ "بدصورت" پر وہ سب اپنی جگہ ٹھٹکی تھیں خصوصاً" سونیا جو قریباً" دس منٹ اندر مہمانوں کے درمیان بیٹھ کر آئی تھی اور اس نے خود اپنی آنکھوں سے اس پچیس، چھبیس سال کے خوش شکل لڑکے کو دیکھا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے کنزیٰ اس قدر ہینڈسم بندے کو تم بدصورت کہہ رہی ہو۔ اس قدر نادانی کی امید نہ تھی تم سے۔" مصفیہ بھی حیران تھی۔

"ہاں دماغ چل گیا ہے میرا۔ ایک بات بتا دوں میں جو تم لوگ تایا جی اور اماں کو بتا دینا کہ میں مر جاؤں گی مگر کسی طور اس بدصورت شخص سے شادی نہیں کروں گی۔"

اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ رونے لگی۔ اور وہ چاروں اس کے الفاظ پر گم صم اسے روتا دیکھنے لگیں۔ یکدم سونیا کو پھر سے وہ سرد والی بے چینی محسوس ہونے لگی تو اس نے ان تینوں کو واپس باورچی خانے کی طرف بھیج دیا تاکہ رات کے کھانے کا انتظام کر سکیں اور وہ خود کنزیٰ کے پاس ہی رک گئی۔ وہ کنزیٰ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اسے روتا ہوا دیکھنے لگی۔ خود اس کا دل بھی اس قدر مضطرب تھا کہ یکدم اسے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر میسج ٹائپ کیا۔

"جلدی گھر پہنچو پلیز" اور شمعون کو بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کا موبائل پھر سے بجا۔

"آرہا ہوں۔ راستے میں ہوں۔ کیوں سب خیریت ہے؟"

اب وہ اسے کیا بتاتی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے موبائل واپس رکھ دیا۔ کنزیٰ بدستور سسک رہی تھی۔ اب اسے صرف اور صرف شمعون کی واپسی کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات بہت گہری اور اس سے کہیں زیادہ خاموش تھی۔ رات کے اس گہرے سناٹے میں دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آواز ابھرتی تو یکدم اس خاموشی کا دم ٹوٹتا اور پھر سے اسی گہری دبیز اور پراسرار خاموشی کا راج

ہوتا۔ وہ دونوں بھی اس وقت برآمدے سے صحن میں جاتی سیڑھیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔

آج گھر میں حسب معمول محفل بھی نہ جمی تھی۔ جس کی وجہ کنزیٰ کا عجیب و غریب برتاؤ تھا۔ شمعون نے لوٹنے کے بعد کنزیٰ سے خود بات کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر کنزیٰ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ اس کی ایک ہی ضد ایک ہی رٹ تھی کہ وہ کسی صورت اس شخص سے شادی نہیں کرے گی اور اگر کسی نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو وہ عین نکاح کے وقت سب کے سامنے انکار کر دے گی۔ شمعون اس کے منہ سے یہ سب سن کر اتنا ہی حیران ہوا تھا جتنا کہ وہ سب مگر وہ مزید بات بڑھا کر گھر ٹھہرے مہمانوں کے سامنے تماشا کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا اور مزید صفیہ کی عقل تھی۔ جس نے بات بختیار بیگم کے کانوں میں ڈال دی تھی۔ گویا بات گھر کے بڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ اور اب ان سب کو یہ ڈر تھا کہ کہیں کنزیٰ گھر کے بڑوں کے سامنے بھی اسی ردعمل کا اظہار نہ کر دے۔

رات کے کھانے کے بعد برتن اور کچن سمیٹ کر وہ سب ہی بغیر کسی سے بات کیے اپنے بستروں پر لیٹ گئی تھیں۔ سب کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے تحریر تھی مگر لب نجانے کیوں خاموش تھے۔ لبنیٰ نے رات کے کھانے کے بعد کنزیٰ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جسے سکینہ خاتون نے بڑی خوبصورتی سے کنزیٰ کی ناسازی طبیعت پر محمول کر کے ٹال دیا تھا۔ کھانے پر بھی یقیناً" سب نے کنزیٰ کی غیر موجودگی کو واضح محسوس کیا تھا۔ کھانے کے بعد سب لوگ ہی اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے شمعون! آج کنزیٰ کو کیا ہوا ہے؟" بالآخر خاموشی کا قفل سونیا کے بولنے سے ٹوٹا تھا۔ برآمدے میں بلب جلنے کی وجہ سے صحن میں کسی حد تک روشنی تھی مگر وہ سیڑھیوں کے جس حصے پر بیٹھے تھے وہاں کافی اندھیرا تھا۔

"پتا نہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے اور اس کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔"

"بہت عجیب سا دن تھا آج۔ میں پورا دن عجیب سی بے چینی محسوس کرتی رہی ہوں۔ گھر کا ماحول بھی تناؤ کا شکار رہا ہے۔"

"ہاں پورا دن میں بھی پریشان ہی رہا ہوں اور اب شام میں بھی جو کچھ ہوا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا اور اس نے غور سے سونیا کے چہرے کو دیکھا۔ "سونی!" سونیا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ کچھ تھا اس کے لہجے میں جو سونیا کو چونکا گیا تھا۔

"کہیں نئی سب کچھ اس رشتے سے انکار کے لیے تو نہیں کر رہی ہے میرا مطلب ہے شاید وہ کسی اور کو پسند۔" سونیا کے چہرے کے ناگوار تاثرات دیکھ کر اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا ہو گیا ہے شمعون؟ تم اپنے الفاظ پر غور کرو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"یار! میں بدگمان نہیں ہو رہا۔ تم جانتی ہو کہ میں روایتی قسم کا بھائی نہیں ہوں جو یہ سوچوں کہ اگر میری بہن کسی دوسرے میں انٹرسٹڈ ہو تو میں غیرت کے نام پر اس کی زندگی اجیرن کر دوں گا بس اس کے اس ابنارمل روپ کی وجہ سے الجھ گیا ہوں۔"

"آج دن بھر اس نے کوئی سجدہ بھی نہیں کیا ماسوائے فجر کے حالانکہ وہ کہاں کوئی نماز چھوڑتی ہے۔"

"تم اپنے تئیں اس کو جانچنے کی کوشش کرو شاید وہ کسی بات پر ٹینس ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی شادی نہ کرنا چاہتی ہو یا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں شادی نہ کرنا چاہتی ہو۔"

سونیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شام سے ان تمام پہلوؤں پر غور کر رہی تھی جن سے شمعون اس کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں ایک دو دن بعد اس سے بات کرتی ہوں۔ بس تم اماں کو قابو میں رکھنا۔ تمہیں پتا ہی ہے وہ زبان کی کس قدر تیز ہیں ایک بار جو شروع ہو گئیں تو خاموش

کرانا مشکل ہو جائے گا۔"

"تائی کا پارہ چڑھا ہوا ہی ہوگا' ایک تو کنزیٰ جس طرح سے مہمانوں کے درمیان سے اٹھ کر چلی آئی اور اوپر سے جو اس نے واویلا کیا ہے اور صفیہ کی جو موٹی عقل ہے کہ ابھی تک بات پہنچا آئی ہے۔ سچ ہے کہ موٹے بندے کی عقل موٹی ہی ہوتی ہے۔"

سونیا اس کی بات پر مسکرا دی۔

"اب ہنس کیوں رہی ہو یہ ہنسنے کا مقام ہے کیا؟" اس نے اسے گھورا تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"کچھ نہیں' تم بہت اچھے ہو شمعون! میری بہن بہت خوش نصیب ہے۔" اس نے دل سے یوں پہلی بار عطیہ سے منسلک کر کے اس کی کھلے دل سے تعریف کی تھی۔ عجیب سی چمک شمعون کی آنکھوں میں در آئی تھی اور وہ زیر لب مسکرا دیا۔

"ہاں' اچھا تو میں ہوں۔ مگر لوگوں کو قدر ہی نہیں ہے کہ کس قدر عظیم گوہر نایاب بلکہ کوہ نور تم لوگوں کے اس گھر میں ہے۔" اس کے اس شوخ جملے پر سونیا ہنس دی تو وہ بھی مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے قطعاً" یہ لڑکی پسند نہیں آئی ہے' نہ جانے امی کو کیا نظر آیا ہے اس میں اور سب سے بڑھ کر اس گھرانے میں؟" لبنیٰ جو کب سے کھانے کے بعد اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ تنگ آ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ دونوں لڑکوں کے کمرے میں ٹھہرے تھے اور تائی محمودہ اور تایا اسلم بڑے کمرے میں۔

"کیوں اب کیا ہوا ہے؟" دانیال نے مسیج ٹائپ کرتے ہوئے ایک نظر بہن کی طرف دیکھا جو بیزار سی اپنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

"آپ نے اس کا روڈلی بیہویر نہیں دیکھا کہ کیسے وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر گئی ہے اور جب میں نے اس سے ملنے کے لیے کہا تو آنٹی سکینہ نے اس سے بھی منع کر دیا۔ مانا کہ اس کی طبیعت خراب ہے تو میں کون سا اس سے ہل جوتنے کا کہہ رہی تھی' محض ملنا ہی چاہتی تھی۔ میں گھر سے سوچ کر آئی تھی کہ آپ دونوں کی ملاقات کرواؤں گی اور یہاں میں خود بھی اس سے الگ سے نہیں مل سکتی۔"

"بھئی۔ امی نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا نا۔" اس نے بڑے لاپروا انداز میں بات اڑائی۔

"آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں تو دانیال نے موبائل سینے پر رکھ کر اس کی جانب دیکھا۔

"کس بات پر اعتراض ہو گا مجھے بھلا؟ اچھے شریف گھرانے کے لوگ ہیں۔ ٹھیک ٹھاک بلکہ بھلی چنگی لڑکی ہے بھئی' پڑھی لکھی بھی ہے اور گھر کی حالت سے سلیقہ بھی نظر آتا ہے ان لوگوں میں۔" اس نے کمرے کی حالت پر نظر دوڑائی' جہاں قرینے سے رکھی ہر شے اس کی بات کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

"بس کیا یہی سب کافی ہے؟"

"تو اور کیا چاہیے مزید؟" ہاتھوں کا تکیہ بناتے ہوئے وہ چھت کو گھورنے لگا۔

"اسٹیٹس' ماڈرن ازم' بیوٹی۔ اس سے کئی گنا خوب صورت لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ کہیں زیادہ ویل مینرڈ اور ویل ایجوکیٹڈ۔ نہ جانے امی اتنی دور کیوں اس گھر سے رشتہ جوڑنے چلی آئی ہیں؟" کنزیٰ کو دیکھ کر وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی تھی جو خالصتاً" محمودہ تائی کے حلیے اور شخصیت کی عکاسی کرتی تھی۔

"مجھے ان سب باتوں میں سے کسی میں انٹرسٹ نہیں ہے۔" وہ اسی طرح چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔

"تو آپ کو پھر کس بات میں انٹرسٹ ہے؟" اس نے تپ کر پوچھا تو وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"سادگی ہائی لی سادگی۔"

"یار ویسے تم سے کیا چیز ہوتی ہو تم عورتیں بھی' ہر بات میں نقص نکالنے کے سوا کچھ آتا بھی ہے؟ اگر یہ رشتے دیکھنے اور ڈھونڈنے کا کام تم لوگوں سے لے کر مردوں کے سپرد کر دیا جائے تو دنیا کی تو می سے کہیں زیادہ لڑکیاں وقت سے اپنے گھر کی ہو جائیں۔ کیسے تم لوگ اتنے عیب تلاش کر لیتی ہو' کسی دوسری لڑکی یا عورت میں؟ کسی کی ناک موٹی ہے تو کسی کی ہائٹ چھوٹی۔ کوئی کالی ہے تو کوئی موٹی۔ تم لوگ گھر کی بہو نہیں ڈھونڈتیں' بلکہ ریمپ پر چلتی ماڈل ڈھونڈتی ہو۔ یہ ڈیمانڈز ہم مردوں کی نہیں ہوتیں کہ ہمارے لیے ایسی بیوی لاؤ جو بیوی کم ماڈل زیادہ لگے۔ ہمیں تو گھر کو سلیقے سے رکھنے کے لیے اچھے اخلاق اور نیک سیرت ایک لڑکی چاہیے ہوتی ہے بس۔ ہر وقت پیسٹری بن کر منہ پر لیپا پوتی کر کے نظروں کو دھوکہ دیتی لڑکیاں نہیں۔"

بھائی کے خیالات اور تجزیہ سن کر اس کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا۔

"بندہ اس سے شادی کرے جو ساتھ چلتے بھلی بھی لگے۔" سر تک کمبل تانے وہ بڑبڑاتی ہوئی کروٹ بدل چکی تھی۔ دانیال مسکرا کر کنزیٰ کو سوچنے لگا۔ جس کا شرمایا لجایا سراپا' سادگی سے گندھا وجود اس کے دل کو نئے انداز سے دھڑکا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

محمودہ بیگم جلد جواب ملنے کی امید لے کر گئی تھیں۔ مگر آنے والے دنوں میں کنزیٰ کے رویے سے یہی نتیجہ اخذ ہو رہا تھا کہ جواب کسی صورت مثبت نہیں ہو سکتا۔ وہ اس رشتے سے صاف انکاری تھی۔ پورے ہفتے وہ بخار میں پھنکتی رہی اور اس پورے ہفتے میں وہ چیختی چلاتی رہی کہ اسے کسی صورت یہاں شادی نہیں کرنا۔ بختیار بیگم کو تو چپ سی لگ گئی تھی۔ کنزیٰ ہمیشہ سے ایک سعادت مند بچی کے روپ میں دادی' سکینہ خاتون اور خود ان کے بھی دل کے بے حد قریب رہی تھی۔ مگر اس کا یہ رویہ ان کے ہونٹوں پر مہر لگا گیا تھا۔ سکینہ خاتون رشتوں کے معاملے میں زبردستی کی قائل نہ تھیں۔ لہٰذا انہوں نے مناسب الفاظ میں عبدالغنی صاحب کو سمجھا کر محمودہ تائی کو انکار کہلوا دیا۔ کنزیٰ پھر سے معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ وہ پھر سے پہلے والی کنزیٰ بن گئی تھی۔ مگر بختیار بیگم پھر سے پہلے جیسی نہ ہو سکیں۔ بیٹی کے اس رویے نے انہیں اندر سے بھربھری دیوار کی مانند ڈھا دیا تھا۔

ان سب میں سے پھر کسی نے اس رشتے کی بابت کنزیٰ سے کسی قسم کا ذکر نہ کیا۔ زندگی پھر سے معمول پر آ گئی تھی۔ وہی ان کی شرارتیں' رسالوں کی دنیا' ہوا کے دوش پر ابھرتی رات کے کسی پہر میں ڈی جے حسنین کی شوخ و شنگ آواز اور ان ساتوں کی آپس کی چھیڑ خانی' سب کچھ پھر سے لوٹ آیا تھا۔ اس دوران راحیلہ پھپھو نے فون کر کے باقاعدہ سونیا کے لیے اپنے بڑے بیٹے کاشف کا رشتہ بھیجا تھا۔ دادی اور سکینہ خاتون تو خوشی سے نہال ہی ہوئے جا رہی تھیں۔ مناسب وقت مانگنے کے بعد ہاں کر دی گئی تھی۔ کچھ مصروفیات کی بنا پر باقاعدہ منگنی دو ہفتے بعد طے پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں ارباب ایک بھولی بسری یاد کی مانند لوٹ آیا تھا۔ پورے دو سال بعد اس گھر کے آنگن کی مٹی پر اس گھر کے سب سے بڑے بیٹے کے قدموں کے نشان پڑے تھے۔ پورے دو برس بعد سکینہ خاتون نے لاہور شہر کے ہنگاموں میں گم ہو جانے والے اپنے بڑے سپوت کا چہرہ دیکھا تھا۔ پورے دو سال بعد عبدالغنی صاحب کو اپنے بڑھاپے کا سہارا پھر سے اپنے سامنے کھڑا نظر آیا۔

سونیا اور عطیہ بھائی کے گلے لگ کر جو روئیں تو ان سب کی آنکھوں کا پانی چھلک پڑا۔ نہ جانے کیسے اس گھر کے مکینوں کی' اس کے خونی رشتوں کی کشش نے اس شخص کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سکینہ خاتون تو گویا تہیہ کر بیٹھی تھیں کہ اب کی بار وہ اسے واپس نہیں جانے دیں گی۔ مگر ارباب نے اپنی مجبوریوں کی دہائی دی کہ شہر میں اسے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ لہٰذا وہ مزید نہیں رک سکتا۔ تاہم اب وہ آتا جاتا رہے گا۔ دو دن بعد وہ سکینہ خاتون سے وعدہ کر کے لوٹ گیا کہ اب وہ اکثر ہی چکر

لگا تار ہے گا اور فوقتاً فوقتاً فون بھی کرتا رہے گا۔ ایک ماں کے لیے تو یہ آس امید بھی بہت تھی۔

"اب کی بار جب ارباب چھٹی لے کر گھر آئے گا تو میں اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دوں گی۔" ابھی ارباب کو گئے چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ چاول چنتے ہوئے سکینہ خاتون نے بڑے رازدارانہ انداز میں بختیار بیگم کا ہاتھ دبایا۔ بختیار بیگم جو اپنی ہی کسی سوچ میں ڈوبی تھیں یکدم چونکیں۔

"کیا مطلب بھابھی بیگم؟ میں سمجھی نہیں۔"

"میں ارباب کا نکاح کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ ماں کی محبت میں نہ سہی 'بیوی اس گھر کی بچی ہوگی تو دوڑا آئے گا نا۔"

"گھر کی بچی کون بھابھی؟"

"کنزی... میں کنزی! تجھ سے ارباب کے لیے مانگتی ہوں بختیار۔ گھر کی بات ہے 'گھر میں ہی رہے گی۔"

"بھابھی بیگم! یوں اچانک آپ کو..." ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کہیں؟

"اچانک کہاں؟ ہزار بار کنزی کو دیکھ کر خیال آتا تھا' مگر پھر ارباب کی طرف سے تو امید ہی ختم ہو گئی تھی کہ وہ لوٹے گا بھی کبھی اور بار بار کے کیے تو اس کی خالہ نے بہت بار اشاروں 'کنایوں میں ذکر کیا ہے۔ اللہ کی شاید یہی مرضی تھی 'تب ہی تو کیسے اچھے رشتے سے کنزی نے انکار کر ڈالا۔"

بختیار بیگم تو حیرت سے منہ کھولے سکینہ خاتون کو تک رہی تھیں۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ مگر فی الحال انہیں کنزی کو کچھ وقت دینا چاہیے تھا اور اس سے بڑھ کر ارباب کو۔ معلوم نہیں اس کی مرضی کیا ہوگی؟ ممکن تھا کہ وہ کسی عہد و پیمان کے رشتے میں بندھا ہوا ہو۔

"اتنی جلدی یہ فیصلہ مت لیں۔ وقت اور حالات پر چھوڑ دیں۔" بختیار بیگم کی بات سن کر سکینہ خاتون گہری سانس بھرتے ہوئے سونیا کے رشتے کے متعلق سوچنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"ارباب بھائی نے کتنا پیارا کرتا گفٹ کیا ہے نا۔ صحیح کہتے ہیں لاہور میں کپڑے کلاس کے ہوتے ہیں۔ بھلا کیا قیمت ہوگی اس کی؟" ماریہ نے اپنا نیلے رنگ کا کرتا ساتھ لگا کر اس پر کالے دھاگے کی نفیس کڑھائی پر ہاتھ پھیرا۔

"اچھا ہے بہت 'مگر قیمتی نہیں ہے۔ یہی کوئی ہزار تک کا ہوگا۔" عطیہ نے موبائل پر میسج لکھتے ہوئے قدرے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اب اتنا بھی سستا نہیں ہوگا آپی۔ یہاں اس طرح کے کرتے دو ہزار سے کم میں نہ ملیں۔" ماریہ اپنے کرتے کی بے وقعتی پر برا مان گئی۔

"تبھی تو کہا ہوگا ڈیئر۔ لاہور میں کپڑے بہت سستے ملتے ہیں بلکہ شاید ہزار سے بھی کم کا ہوگا۔" صفیہ کا یوں عطیہ کی بات کی تائید کرنا ماریہ کو مزید سلگا گیا۔

"ہائیں آپ بھی صفیہ باجی۔ آپ نے تو اتنی توہین کر دی میرے کرتے کی۔"

"تو اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ ارباب جو سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آیا ہے وہ 'دو دو ہزار کے تحفے لایا ہوگا؟ شرط لگا لو مجھ سے ہزار سے بھی کم اس کی لاگت ہر چیز ہے۔" صفیہ نے بہت وثوق سے کہا۔

"مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ ابا نے انہیں معاف کر کے گلے کیسے لگا لیا۔ دو سال سے تو فون کر کے یہ تک نہ پوچھا گیا کہ زندہ ہیں کہ مر گئے اور اب بڑے مزے سے منہ اٹھائے چلے آئے ہیں۔" عطیہ کے موقف سے سب متفق تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی امید نہ تھی کہ عبدالغنی صاحب اس طرح اتنی آسانی سے ارباب کو کسی بھی باز پرس کے بغیر نہ صرف گھر میں داخل ہونے دیں گے۔ بلکہ یوں برتاؤ کریں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

دو سال قبل جب پڑھائی ختم کرنے کے بعد اسے وہیں لاہور میں نوکری ملی تھی تو وہ گھر بار اور خاندان کو ایسے بھول گیا کہ جیسے ان سب سے کبھی اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ بہت سے جاننے والوں کی زبانی سننے میں آیا تھا کہ اس نے لاہور میں کسی اچھے خاندان کی

لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔ پھر اچانک اس کا لوٹ آنا اور بڑوں کا اسے بلا عذر قبول کر لینا ان ساتوں کے لیے قابل قبول نہ تھا۔

"وہ بیٹا ہے اس گھر کا۔ لڑکیوں کے لیے گناہ کی' غلطی کی' بے اعتنائی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کہ والدین کی لاج بیٹیوں کے ہاتھ ہوتی ہے' بیٹوں کے نہیں۔ میں یا تم میں سے کوئی ایک دن بھی گھر سے باہر رہے تو وہ اس گھر میں واپس اگلا قدم نہ رکھ سکے گا۔ مگر گھر کا کوئی بھی بیٹا دو سال چھوڑ و بیس سال بھی گزار کر آئے تو یوں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا گویا صبح کا گیا شام میں لوٹا ہے۔ یہی ہمارے معاشرے کے ڈبل اسٹینڈرڈ ہیں۔" سونیا کی بات کے اختتام پر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"والدین کے لیے تو سب بچے برابر ہوتے ہیں نا آپی۔" ماریہ کے اس بھولپن پر وہ ہنس دی۔

"ہوتے ہیں میری جان 'مگر محض کتابوں کی حد تک عملی زندگی میں نہیں۔ سچ یہی ہے کہ والدین کے لیے سب اولاد برابر نہیں ہوتی۔ یہ تو دل کے سودے ہیں نا اور دل پر بھلا کیا زور؟ ہم بہن بھائیوں میں اماں' ابا نے سب سے زیادہ پیار ارباب سے کیا۔ کیونکہ وہ ان کی پہلی اولاد تھی۔ پھر عطیہ سے کیونکہ وہ ان کی آخری اور سب سے چھوٹی اولاد ہے۔ پھر بابر سے کہ وہ بچپن سے کچھ کمزور اور بیمار رہا ہے اور سب سے آخر میں بچی تم۔ میں نہ پہلی اولاد تھی' نہ آخری اور نہ ہی کمزور' لہٰذا میرے حصے میں بچی کھچی محبت آئی۔ دل کے معاملات میں انسان انصاف نہیں کر پاتا۔"

بس کہ بات شروع کرنے والی سونیا کے ہونٹوں پر بات کے اختتام پر ایک زخمی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی در آئی۔ سب ہی خاموش ہو گئیں۔

"سونی! تم ایموشنل ہو رہی ہو یار۔" صفیہ نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ عطیہ گم صم سی بہن کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔ میں پریکٹیکل ہو رہی ہوں۔ جانتے ہو تم لوگ کہ بہت سال پہلے برابر والے گاؤں میں جب ایک بھائی نے اپنی بہن کو قتل کر دیا تھا اور اس کے ماں' باپ نے بیٹے پر سے مقدمہ واپس لے لیا تو میں نے اماں سے پوچھا تھا کہ اگر ارباب مجھے مار ڈالے تو آپ بھی اسے معاف کر دیں گی۔" وہ کچھ لمحے کو رکی اور قدرے توقف سے گویا ہوئی۔

"اماں نے کہا کہ یہ کیسا سوال ہے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ مگر جب میں نے ضد کی تو جانتی ہو اماں نے کیا جواب دیا؟"

عطیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"اماں نے کہا کہ میں ارباب کو معاف کر دوں گی۔ کیونکہ وہ میری اولاد ہے' مگر اس سے بات نہیں کروں گی' کیونکہ تو بھی میری اولاد ہے۔"

عطیہ کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

"اماں کے جواب دینے سے قبل دل کو کوئی خوش فہمی تھی جیسے' جو اماں کے جواب دینے تک دعا کرتا رہا کہ اماں کہہ دیں کہ وہ ارباب کو معاف کریں گی۔ مگر کسی حد تک سزا ضرور دلوائیں گی' مگر اماں نے تو اسے سرے سے معاف کر ڈالا۔" اس کے لہجے میں بہت تھکان تھی۔

"مگر تائی نے یہ بھی تو کہا کہ وہ اسے معاف تو کریں گی۔ مگر بات نہ کریں گی۔" صفیہ کو دیکھ کر وہ زخمی انداز میں مسکرا دی۔

"کیا سونیا کی جان اتنی سستی ہے کہ اماں صرف ارباب سے تھوڑے وقت ناراض ہو جائیں؟" اس کے سوال پر صفیہ کچھ بول نہ سکی۔

"چھوڑو یہ سب۔ محبتوں میں انصاف نہیں ہوتا۔ اس ناانصافی پر تو شاید خدا بھی انسان کو معاف کر دے۔" اس نے مسکرا کر بال باندھے اور اپنے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

سب کے دلوں پر ہی اداسی چھا گئی۔ ان ساتوں کا بھی آپس میں عجیب رشتہ تھا۔ کسی ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہوتی اور کسی ایک کا قرار سب کا قرار بن جاتا۔ قدرت نے عجیب سی ڈور سے ان کے دلوں کو باندھ رکھا تھا۔

"اصل بات تو رہ ہی گئی ارباب بھائی واپس کیسے آگئے؟" ماریہ نے گویا یاددہانی کرائی۔

"زن اور زر۔ یہ دو چیزیں ہی انسان کا ایمان خراب کرتی اور بدلتی ہیں۔ اب پتا نہیں ارباب بھائی کا ایمان کس نے پلٹا ہے۔ زن نے یا زر نے۔" کنول جو بہت دیر سے خاموش تھی۔ بڑے پتے کی بات کر گئی۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا یارو۔" کنول بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح صفیہ کے جگانے پر شدید سردرد کے باعث سونیا نے اسکول جانے سے انکار کر دیا۔ اس کی متورم آنکھیں بھید کھول گئیں کہ رات بھر وہ روتی رہی ہے۔ صفیہ نے متاسف انداز میں سر ہلاتے ہوئے مزید کریدنے سے اجتناب کیا اور ناشتہ کر کے اکیلے ہی اسکول کے لیے نکل گئی۔ ابھی وہ پھر سے نیند میں گئی ہی تھی کہ باہر برآمدے میں خالہ برکت کی تیز آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ خالہ برکت برابر والے گھر سے دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں اور اکثر ہی دادی سے ملنے چلی آتیں۔ اکیلی عورت تھیں، جو بیٹیوں کو بیاہ کر اب اپنی بہن کے ہاں زندگی کے بچے کھچے دن پورے کر رہی تھیں۔ کتنی ہی دیر وہ کروٹیں بدلتی، سونے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہی۔ مگر نیند نے آج اس پر مہربان نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ سردرد تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ کنپٹی کو انگلیوں کی پوروں سے دباتے رہنے کے باوجود اس کے سردرد میں آرام نہ آیا تو اٹھ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ فرحت بہار ناشتے کے برتن دھو رہی تھیں، جبکہ دادی کے کمرے میں دیگر خواتین محفل جمائے بیٹھی تھیں۔

"ارے اٹھ گئیں؟ صفیہ بتا رہی تھی تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک ہے تو میں نے بھابھی بیگم سے کہا کہ آج اسے جی بھر کر سونے دیں۔ کیا ہوا ہے طبیعت کو؟"

وہ وہیں پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"سخت سردرد ہے۔ اب تو برداشت سے باہر ہوا جا رہا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلی سے کنپٹی کو دباتے بمشکل کہہ پائی۔

"ناشتہ بنا دیتی ہوں، کھا کر دوائی لے لو اور پھر سو جانا۔ آج چھٹی کی ہے تو آرام کرو اور خبردار جو ٹی وی دیکھا یا رسالہ پڑھا تو۔" وہ اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولیں جہاں برسوں کی تھکان رقم تھی۔

"مجھے بس ایک چائے کا کپ اور پاپے دے دیں۔"

فرحت بہار نے اس کے سامنے گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے رکھی تو بمشکل دو پاپے زہر مار کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

الماری سے رفع درد کی دوا نکال کر دو گولیاں پانی سے لے کر وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ سر میں جیسے دھماکے سے ہو رہے تھے۔ مگر گھنٹے بعد نیند آگئی تھی۔

دوبارہ اس کی آنکھ تب کھلی جب کوئی زور زور سے اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ بمشکل پلکوں کی درز سے اس نے سامنے کا منظر دیکھا جو کسی گہرے خواب کی مانند لگتا تھا۔ سامنے کھڑے شخص کی شناخت میں اسے وقت لگا۔ وہ شمعون تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کسلمندی سے برابر کھڑی عطیہ اور اس کے پیچھے کھڑی پوری فوج کو دیکھا۔

سر کو جھٹکتے ہوئے اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ "کیا ہوا، سب خیریت ہے نا؟"

"لیٹی رہو، اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو ہم پوچھنے آئے ہیں کہ آج خیریت ہے نا۔ اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ یا مردوں سے شرط لگا کر سوئی ہو کہ پہلے جاگتے ہیں یا محترمہ سونیا عبدالغنی۔"

شمعون کے شرارت سے کہے الفاظ اس کے چہرے پر چھائے تفکر سے ہم آہنگ نہ تھے۔ وہ اسی کا تھا جذبات کو دبا کر بشاش رہنے کا دکھاوا کرنے والا۔

"ہاں بس دوا لے کر تھوڑی دیر ہی سوئی کہ تم لوگ آگئے۔" اس کا ذہن جیسے پھر سے غنودگی کا شکار ہوا تھا۔ البتہ اب پہلے والا سردرد نہ تھا۔

"سر درد کیسا ہے اب؟"

بہت بہتر ہے۔ تھوڑا سو لیا ہے تو آرام ہے۔ دوائی لے کر سوئی تھی کہ تم لوگوں نے جگا دیا۔" بے حد نقاہت سے کہتے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"اب بھی نہ جگاتے کیا؟ شام کے سات بج رہے ہیں۔" شمعون کے الفاظ پر اسے کرنٹ سا لگا اور وہ گھرے سناٹے میں آ گئی۔ وہ صبح نو بجے سوئی تھی اور اب شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ دس گھنٹے سوتی رہی اور اسے احساس بھی نہ ہوا اور کسی نے اسے جگایا کیوں نہیں؟

"مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟" اس نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔ "کب سے جگا رہے ہیں مگر تم تو جیسے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ہمیں تو تشویش ہو گئی کہ کہیں ساڈی کڑی ٹرتے ای نہ گئی؟" اس کی ہونق صورت کو دیکھتے شمعون نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"اچھا چلو کوئی بات نہیں' نیند تو پوری ہو گئی نا اور سر درد بھی نہیں رہا۔ اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ' پھر دوائی لے کر سب کے ساتھ گپ شپ لگاؤ۔ میں چاچی سے کہتا ہوں کہ سبز چائے میں لیموں ڈال کر بھجوائیں۔" ان سب کو آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے وہ نرم لہجے میں بولا تو سب اس کی بات میں چھپے مفہوم کو پا کر سرہلاتی مسکرا دیں۔

رات کے کھانے کے بعد سب ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ سونیا کے آرام کے خیال سے حسب معمول ان کے کمرے میں محفل نہ جمی تھی۔ عطیہ اور صفیہ کھانے کے بعد قہوہ پینے کی عادی تھیں اور اپنی اس عادت کو وہ ہر طرح کے موسم میں جاری رکھتی تھیں۔ خواہ جولائی کے مہینے میں چھ' سات گھنٹے کی لوڈشیڈنگ ہی کیوں نہ ہو مگر پانی کی طرح ٹپکتے پسینے کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے بھی دونوں قہوہ نوش فرمائیں۔ دبے پاؤں دونوں ہی باورچی خانے میں چلی آئیں۔ صفیہ نے قہوے کا پانی چڑھایا اور پتی ڈال کر وہیں کھڑی اس کے ابلنے کا انتظار کرنے لگی جبکہ عطیہ خاموشی سے دروازے کے قریب پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"میں سونی کے لیے بہت پریشان ہوں۔" ان دونوں کے درمیان کی خاموشی کو صفیہ نے توڑا۔

"اور میں پریشان سے کہیں زیادہ حیران ہوں اس کی سوچ پر۔"

"کیوں حیران کیوں؟" صفیہ نے رخ موڑتے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔

"اتنی تلخی بھری ہے وہ بھی میری بہن میں اور مجھے کبھی پتا نہ چل سکا۔" اس نے سر گھٹنوں پر دھر دیا اور پاؤں کے انگوٹھے سے کچے فرش کو کھرچنے لگی۔ "وہ سوچ بھی کیسے سکتی ہے کہ اماں' ابا اس سے پیار نہیں کرتے۔"

صفیہ نے قہوے کا گرما گرم پیالہ اس کی جانب بڑھایا۔

"ہاں بھئی لڑکیوں! تم دونوں نے کیوں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے؟ اور یہ کھسر پھسر کس کے خلاف ہو رہی ہے؟" وہ دروازے میں ہی کھڑا تھا' سینے پر ہاتھ باندھے۔ دونوں کو گھور رہا تھا۔

"ہم اپنی باتیں کر رہے ہیں۔" عطیہ نے قہوہ کی چسکی بھری۔

"آؤ تم بھی آجاؤ۔" صفیہ نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔

"ویسے خلیل جبران کہتا ہے کہ جب دو عورتیں بات کرتی ہیں تو ان کی باتوں کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا ہے۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے بولا۔

"مجھے تو یہ خلیل جبران کے بجائے تمہاری کہاوت لگتی ہے۔ خلیل جبران اتنی فضول باتیں نہیں کرتا تھا۔" عطیہ نے پیالہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے طنز کیا۔ تو وہ شوخ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"چلیں اگر آپ اتنی دانائی کا سہرا ہمارے سر باندھتی ہیں اور ہمیں خلیل جبران ٹھہراتی ہیں' ہمیں کیا اعتراض ہے۔" وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے بحث میں نہیں جیت سکتی۔ لہٰذا خاموشی سے قہوہ پینے لگی۔

وہ دونوں قہوہ ختم کر چکی تھیں۔ عطیہ نے تمام برتن جمع کر کے سنک میں رکھے۔

"سونی کسی بات پر ڈسٹرب ہے کیا؟" اس کے سنجیدگی سے کیے سوال پر صفیہ نے گزشتہ رات کی بحث کے چیدہ چیدہ حصے اسے سنا ڈالے۔

"خیر' یہ معاملہ جانے دو۔ تم لوگ اب اس کے اندر کے اس احساس کمتری کو نہیں پاٹ سکتے جو بچپن سے پل کر اب اس کے ساتھ ہی جوان ہو چکا ہے۔" اس نے ہاتھ جھاڑے اور مڑا۔ "اور سنو اب سو جاؤ جا کر' کہیں کوئی بھوت پریت نہ چمٹ جائے۔"

"عطیہ کے ہوتے میں کیوں ڈروں۔ یہ بہت بہادر ہے' بھگا دے گی بھوتوں کو۔" صفیہ نے عطیہ کے بازو میں چٹکی کاٹی۔

"ہاں یہ تو خود لوگوں کو قبضے میں کرنے کی خصوصیات رکھتی ہیں۔"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا وہاں سے چلا گیا تو صفیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

☼ ☼ ☼

رات کے اندھیرے کی وجہ سے اس سے چلنا محال ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی گلی کے کنر تک پہنچی۔ دور کہیں اسے مدقوق روشنی بلند ہوتی نظر آئی تو وہ آن کی آن میں اس روشنی کی طرف لپکی جو کسی لالٹین سے اٹھ رہی تھی۔ لالٹین والا ہاتھ دائیں بلند ادھر سے ادھر ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس نے اس ہاتھ کے پیچھے کالی چادر میں چھپے وجود کی طرف دیکھا۔ جس کا آدھا چہرہ کالی چادر میں چھپا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ گہرے گہرے سانس لیتی پوچھ بیٹھی۔

لالٹین والا ہاتھ فضا میں مزید بلند ہوا اور اس کے چہرے کے برابر آ کر ٹھہر گیا۔ اس کی روشنی سے آنکھیں چندھیا گئیں تو اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے رکھ لیا۔ تب ہی اسے مقابل کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ ہاتھ کو آنکھوں سے ہٹاتے اس نے آنکھیں پھاڑے اس آدھے عیاں چہرے کو جانچنے کی سعی کی تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ کنزیٰ تھی۔

"کنزیٰ!" اس کے لب وا ہوئے۔ آنکھوں سے رواں آنسوؤں نے اس کے وجود کو خوف ناک حد تک پراسرار بنا دیا تھا۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی اور دو قدم پیچھے ہٹی۔ یکدم پیچھے سے کسی نے اس کی گردن کے گرد لپٹے نائیلون کے دوپٹے کو رسی کی مانند جکڑ لیا۔ گلے میں پڑا دوپٹا اس کے لیے کسی پھانسی کے موٹے رسے سے کم نہ تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ کھانسنے کی کوشش میں کنزیٰ کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں سے دوپٹے کی گرفت کو اپنی گردن کے گرد کمزور کرنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ مگر سب جیسے بے سود تھا۔ بے فائدہ۔

کنزیٰ روتے ہوئے سر کو نفی میں ہلاتی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی کہ اسے خود کو بچانا تھا۔ دوسری طرف دوپٹے کا پھندا مزید مضبوط ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور آنکھیں تکلیف کے سبب باہر کو ابلنے لگیں۔

کنزیٰ روشنی سمیت بہت دور ہو گئی تھی۔ گھٹن اور اندھیرے کا احساس سوا ہو چکا تھا۔ اس کی شریانوں میں دوڑتا خون رکنے لگا تھا اور اس کی سانس بھی۔ گلے کی ہڈی چٹخنے کے قریب تھی تو گویا موت آن پہنچی تھی۔ اتنی جلدی؟ اتنی سی عمر میں؟ ابھی تو اس نے جی بھر کر دنیا کے رنگ بھی نہ دیکھے تھے۔ اس نے آخری وقت سامنے پا کر کلمہ توحید پڑھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اس کی گردن دوپٹے کے پھندے سے آزاد ہو گئی اور کسی نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی زمین پر گیند کی طرح گول ہو گئی۔

ایک زوردار قہقہہ حلق سے ابلا تھا۔ اس نے اپنے نیم جان وجود کو سمیٹتے ہوئے' سیدھے ہوتے پلکوں کی درز سے اس قہقہے لگاتے وجود کی جانب دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔ بھیانک اور کریہہ چہرے والا شخص اس کے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ اس کے

قہقہے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند انڈیل رہے تھے۔ کانوں پر ہاتھ رکھتے اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ جوں ہی آنکھیں کھولیں وہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ ادھر ادھر نظریں گھمانے پر وہ سب اسے آپس میں سر جوڑے ریڈیو میں سرد قلفتی نظر آئیں۔ اس کا پورا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور سانس دھونکنی کی مانند تیز چل رہی تھی۔ تو وہ سب خواب تھا۔ وہ ایک بھیانک خواب سے جاگی تھی۔ اسے یاد آیا کہ گزشتہ دو روز سے ناسازیٔ طبیعت کے باعث وہ دوا کے زیر اثر جلدی سو جاتی تھی۔ وہ سب جاگ رہی تھیں تو گویا رات کے دس ' ساڑھے دس کا وقت تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کمبل پرے دھکیلا۔ اس کو اٹھتا دیکھ کر وہ سب اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"کیا ہوا؟ سوتے میں ڈر گئی ہو؟" عطیہ نے آگے بڑھ کر اس کے عرق آلود وجود کو دیکھا۔ صفیہ نے تپائی پر دھرے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کی جانب بڑھایا۔ وہ کنزیٰ کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھتے گلاس لبوں سے لگا گئی۔ دو گھونٹ پیتے ہی اس کے حلق میں اگے کانٹے غائب ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" اس کی نظروں کا ارتکاز خود پر محسوس کرکے کنزیٰ پوچھ بیٹھی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ اسے کیا ہوا ہے۔

کیا مطلب تھا اس خواب کا؟ کنزیٰ کے آنسو... اس کی مدد نہ کرنا... وہ گلے کے گرد پھندا... اور وہ بھیانک وجود... سب کس سلسلے کی کڑیاں تھے؟

باقی ماندہ پانی بھی حلق میں انڈیلتے اس نے گلاس واپس صفیہ کو تھمایا۔

"کوئی میرے ساتھ باتھ روم چلے گا؟" اس نے کنزیٰ کی طرف دیکھنے سے اجتناب کرتے باقی سب سے سوال کیا' جسے کنزیٰ نے واضح محسوس کیا تھا۔ وہ خاموشی سے نظر انداز کرتے رخ پھیر گئی۔ جب کسی شخص کا رویہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہو جائے تو خوامخواہ اس پر الجھ کر خود کو ہلکان کیا کرنا۔

"چلو میں چلتی ہوں۔" صفیہ نے دوپٹا سر پر ڈالے ہامی بھری۔

"مجھے بھی جانا ہے۔" ماریہ بھی ان دونوں کے ساتھ ہولی۔

سونیا کی طبیعت کے باعث وہ تینوں ست روی سے چلتی صحن تک آئیں۔ صفیہ نے برآمدے اور صحن میں لگے تمام بلب جلا دیے تو سارا گھر روشنی میں نہا گیا۔ ماریہ سب سے پہلے لپک کر باتھ روم میں گھس گئی۔ وہ دونوں وہیں باتھ روم کے پاس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

"کیسا محسوس کر رہی ہو؟" صفیہ کے سوال پر اس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ذہن اب تک خواب میں ہی الجھا ہوا تھا۔

"خواب میں ڈر گئی تھیں؟ کچھ پڑھ کر نہیں سوئیں؟" صفیہ نے اس کے الجھے پریشان چہرے کو دیکھا تو وہ چونکی۔ وہ آج واقعی کچھ بھی پڑھے بغیر سو گئی تھی۔ روز کا اس کا معمول تھا سونے سے پہلے آیت الکرسی اور درود شریف پڑھ کر دائیں کروٹ سونا۔ جب بھی وہ اپنے اس معمول سے ہٹتی' وہ ایسے ہی خواب میں ڈر جایا کرتی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیتے اپنے بکھرے بالوں کو کھول کر سمیٹتے پھر سے جوڑے میں جکڑا تھا۔ ماریہ نکل کر باتھ سامنے تار پر لٹکے تولیے سے پونچھنے لگی تو وہ اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ ماریہ ہاتھ پونچھتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھی تو صفیہ نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"ارے چلو کدھر؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چل دیں؟" ماریہ نے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر پیچھے مڑ کر آنکھ دبائی اور دانت نکالتے دروازہ کھول کر اندر غائب ہو گئی۔ صفیہ بکتی' جھکتی وہیں سیڑھیوں سے اوپر بنے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سونیا کے نکلنے پر وہ اسے وہیں رکنے کا بول کر چلی گئی۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر سر گھٹنوں پر دھرے سامنے صحن میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے لگی۔ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو ایک جھٹکے سے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے ماریہ کھڑی تھی۔ اس نے گہری سانس خارج کرتے اس کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی۔

"تم یہاں رکو گی؟ میں اندر جانا چاہتی ہوں' ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" اس کے پوچھنے پر ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ دوپٹا کھول کر اپنے گرد لپیٹتی اٹھ کر کمرے کی طرف چل دی۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر ماریہ کو دیکھا۔ مبادا وہ گھبرا نہ جائے۔ وہ اس کی جانب ہی گردن موڑے دیکھ رہی تھی۔ سونیا کو اپنی طرف تکتا پا کر وہ مسکرا دی تو وہ مطمئن سی کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے کنزیٰ سے نظریں ٹکراتے ہی اس نے دانستہ نظر چرالی اور جوں ہی اپنی چارپائی کی جانب مڑی تو اس کے قدم وہیں تھم گئے۔ حیرت کا جھٹکا لگا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی جگہ پر کمبل میں لپٹی ماریہ کو دیکھنے لگی۔

"ماریہ... تم... تم تو... وہاں... باہر تھیں۔" وہ ہکلائی۔

"باہر سے تو میں کب کی آ گئی تھی نا۔" ماریہ جمائی روکتے ہوئے منمنائی۔

"ہاں... مگر میں تو تمہیں باہر صفیہ کے لیے بٹھا کر آئی تھی۔" اس نے تھوک نگلتے بے یقینی سے پوچھا اور وہیں سے الٹے پاؤں واپس بھاگی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتے باہر برآمدے میں جھانکا۔ دور برآمدے کی سیڑھیاں خالی پڑی تھیں۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ جلدی سے اپنے بستر میں آ کر لیٹ گئی۔ سب یقینی کی بے یقینی تھی۔ وہ خود ماریہ کو وہیں بٹھا کر آئی تھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر اسے دیکھا بھی تھا۔ جواباً" وہ مسکرا دی تھی۔ وہ خواب ہرگز نہ تھا۔ کوئی اور دروازہ یا راستہ بھی نہ تھا۔ جس کے ذریعے ماریہ اس سے قبل پہنچ جائے تو پھر؟ باہر برآمدے میں وہ کون تھی۔ اگر ماریہ اس کے برابر بیٹھی تھی۔

"سونی کی بچی! مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی آئی۔" صفیہ دھڑ سے دروازہ کھولتے ہی دہاڑی۔ ماریہ اس کے ساتھ بیٹھی تھی تو اسے کس بات کا ثبوت درکار تھا؟ رہی سہی کسر صفیہ کے جملے نے پوری کر دی۔ وہ خوف کے مارے ماریہ سے لپٹ گئی اور آنکھیں زور سے بند کرتے آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے کا منظر پھر سے آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

راحیلہ پھپھو نے منگنی کے لیے خریدا تمام سامان لاہور سے ڈرائیور کے ہاتھوں منگنی سے پانچ روز قبل ہی بھجوا دیا تھا۔ کیونکہ سونیا کی طبیعت ابھی تک ٹھیک سے سنبھلی نہ تھی۔ مگر وہ منگنی میں تاخیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تمام جوڑے اور زیورات جدید طرز کے بنے ہوئے اور انتہائی خوب صورت تھے۔ وہ سب کی سب تمام سامان اپنے کمرے میں بکھرائے ہاتھ پھیرتے ہوئے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ منگنی کی تقریب کا لباس بے حد خوب صورت اور قیمتی تھا۔ آتشی گلابی اور نارنجی رنگ کا انگرکھا فراک اور چوڑی دار پاجامے پر سفید چمکتے موتیوں اور نگینوں کا کام بڑی مہارت سے کیا گیا تھا۔ دوپٹا بھی بھاری کام سے مزین تھا۔ منگنی کے جوڑے کے علاوہ بھی پھپھو نے چار بیش قیمت خوب صورت کام والے جوڑے بھجوائے تھے۔ ہر جوڑا ہی چیخ چیخ کر اپنی قیمت ظاہر کر رہا تھا۔ وہ سب اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ کنول اور عطیہ اس کی منگنی کا جوڑا سمیٹتے ہوئے بڑے کمرے میں استری کرنے لے گئیں۔ جبکہ صفیہ اور ثوبیہ اس کا سارا زیور اٹھائے سکینہ خاتون کے ہمراہ ان کے کمرے کی لوہے والی الماری میں حفاظت سے رکھنے چل دیں۔

کنزیٰ اس دن کے بعد سے سونیا سے کترائی کترائی سی پھر رہی تھی۔ البتہ سونیا کے پاس بیٹھی ماریہ سامنے بکھرے جوڑوں کو تہ کرتے ان کی تعریف میں اس قدر منہمک تھی کہ سونیا کی بکھری بکھری اور پراگندہ سی حالت زار کی جانب اس کی توجہ مبذول ہی نہ ہو سکی۔

باہر سے فرحت بہار نے اسے پکارا تو وہ تمام جوڑے وہیں چھوڑ کر باہر گئی اور جب لوٹی تو دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی ایک دل خراش چیخ نکل گئی۔ سونیا اپنے

سسرال سے آئے جوڑوں میں سے سفید اور سرخ رنگ کی بھاری کام والی قمیص کو عین درمیان سے قینچی تھامے کاٹ رہی تھی۔

ماریہ کی چیخ پر اس نے لحظہ بھر کو رک کر ماریہ کی طرف دیکھا اور پھر سے دانت پیستے ہوئے پہلے سے بھی تیزی سے قمیص کو کاٹنے لگی۔ ماریہ کی پے در پے چیخوں پر فرحت بہار' کنول اور عطیہ بھاگتی ہوئی جوں اندر داخل ہوئیں تو دماغ جوں بھک سے اڑ گئے۔ کنول کے حلق سے بھی دلخراش چیخ بلند ہوئی اور عطیہ وہیں دروازہ میں ہی دل تھامے کھڑی رہ گئی۔ فرحت بہار نے لپک کر اس کے ہاتھ سے قینچی جھپٹنا چاہی تو اس نے پوری قوت سے انہیں پرے دھکیل دیا۔ انہیں اس کے وجود پر کسی فولادی قوت کا گمان ہوا تو وہیں کی وہیں تھم گئیں۔

"ماریہ! جلدی سے بھابھی بیگم کو بلالاؤ' جلدی۔"

ماریہ سرعت سے بھاگتی جوں برآمدے کے درمیان میں پہنچی' سکینہ خاتون کے پیچھے وہ تینوں بھی بھاگتی ہوئی آرہی تھیں۔ یقیناً" وہ گھر میں گونجتی چیخوں کو سن کر ہی دوڑی آئی تھیں۔ ماریہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے اندر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ سکینہ خاتون جوں ہی اندر داخل ہوئیں تو ان کے قدم وہیں جم گئے عطیہ اس کے ہاتھوں سے قینچی لینے کی کوشش میں لگی تھی۔ اندر کا منظر آنے والے تمام افراد کے لیے حیرت انگیز اور ناقابل فہم تھا۔ سکینہ خاتون تو ششدر سی وہیں دروازے میں کھڑی رہ گئیں۔

کنزیٰ نے آگے بڑھ کر فرحت بہار کو سہارا دیا جو سیمنٹ کے پکے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔

عطیہ اس کے ہاتھ سے قینچی جھپٹنے میں کامیاب ہوچکی تھی اور تب ہی سونیا بے جان سی ہو کر نیچے گری۔ تینوں نے اسے اٹھا کر اس کی چارپائی پر ڈالا۔ خاتون نے سامنے بکھرے ان تمام بھاری اور خوب صورت کامدانی جوڑوں کو حسرت سے دیکھا۔ جو اب تار تار ہوچکے تھے۔ پچھلے سات منٹ میں ہونے والے

اس دل دہلا دینے والے واقعہ نے کمرے میں موجود تمام نفوس کے دماغ کو ماؤف کر ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مس ثنا آپ مس سونیا کو اپنے ساتھ لے جائیں اور ان سے کوئز سولو کروائیں۔ لیٹ از سی' سونیا کتنی اسمارٹ اور انٹیلی جنٹ ہے۔" ڈاکٹر اظہر فارس نے اسپتال کے مخصوص لباس میں ملبوس ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی کو مخاطب کیا' جو ان کے انٹرکام سے بلائے جانے پر چند ہی لمحے قبل اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ مردہ قدموں سے اس کے پیچھے چل دی۔ دروازے سے باہر جاتے اس نے مڑ کر شمعون' بابر اور صفیہ کی جانب دیکھا جو اس کو ہی دیکھ رہے تھے۔

پچھلے دو دن سے سونیا بے خوابی کا شکار تھی' نہ خود وہ سوتی اور نہ ہی کسی دوسرے کو سونے دیتی تھی۔ سارا گھر اس کی بگڑتی حالت سے پریشان تھا۔ مناسب سی گفتگو اور کونسلنگ کے بعد ڈاکٹر اظہر نے اسے اپنی پی اے کے ہمراہ بھجوا کر دیگر تفصیلات ان تینوں سے طلب کی تھیں۔

"ہوں۔ اس سے پہلے بھی انہیں اس طرح فٹس (دورے) پڑتے رہے ہیں؟" ہسٹری لینے کے دوران ہی انہوں نے استفہامیہ نظروں سے ان تینوں کی جانب دیکھا۔

"نہیں سر! ہماری فیملی میں سے تو کسی کو بھی۔"

"سر! میری سسٹر کو بھی پچھلے دنوں اس قسم کے فٹس پڑے تھے۔ شاید کچھ مینٹل اسٹریس تھا کہ وہ بہت ضدی اور چڑچڑی سی ہوگئی تھی۔ حالانکہ وہ بہت دھیمے مزاج کی لڑکی ہے۔" بابر کی بات کاٹ کر شمعون فوراً" بول پڑا تھا۔ ڈاکٹر کے پوچھنے پر اس نے کنزیٰ کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔

"ہوں۔ اور اب آپ کی سسٹر کیسی ہیں؟"

قلم دو انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے وہ اپنی گھومنے والی کرسی کو پیچھے دھکیل کر اس کی پشت سے کمر ٹکا کر بیٹھے تھے۔ "شی از فائن ناؤ۔"

انہوں نے گہری سانس لی اور پرسوچ لہجے میں بولے۔

"کیا یہ پاسبل ہے کہ آپ لوگ اس رشتے سے فی الوقت منع کردیں؟" وہ تینوں اپنی اپنی جگہ چونکے تھے۔ "گھبرائیں مت۔ اٹس آ پارٹ آف ٹریٹمنٹ۔ دیکھیں ابھی میں قدرے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ کچھ ٹیسٹ ہیں' وہ کروالیں' رپورٹ آجائے تو ہی حتمی فیصلہ پر پہنچا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو میں کچھ میڈیسنز دے دوں گا' تاکہ ان کی جو بے خوابی کی کیفیت ہے وہ ختم ہوجائے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتے تیز تیز قلم اپنے اسپتال کے مخصوص نشان والے رائٹنگ پیڈ پر چلا رہے تھے۔

"پھر بھی سر وہ ٹھیک تو ہوجائے گی نا؟" بابر نے بہت تفکر سے استفسار کیا۔

"دیکھیں ہمارے پاس جتنے پیشنٹس آتے ہیں' ان میں سے ضروری نہیں کہ سب بیمار ہی ہوں۔ کچھ مریض حالات سے فرار کے لیے اپنی شخصیت پر ایک خول ساچڑھا لیتے ہیں۔ شاید سونیا اور آپ کی سسٹر۔ ہوں کیا نام بتایا آپ نے۔ ہاں کنزیٰ۔ کنزیٰ اور سونیا ان دونوں کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ کنزیٰ اس رشتے کے لیے ایگری نہیں ہوگی اور شاید تب ہی دماغ نے یہ منصوبہ ترتیب دیا جس میں وہ کامیاب بھی ہوگئی۔ رو' دھو کر' چیخ چلا کر اس نے کسی بھی طرح اپنی بات منوالی اور جب انکار ہوا تو وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ سونیا کے دماغ نے بھی اسی منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا سوچا' کیونکہ یہ طریقہ بے حد موثر ثابت ہوا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ پلان ان دونوں کا مشترکہ ہو شاید وہ کسی اور طرف رجحان رکھتی ہوں۔ خیر یہ سب کی باتیں ہیں' جو رپورٹس آنے کے بعد ہی ثابت کی جاسکتی ہیں۔"

صفیہ کو اس کی بات اور انداز بے بالکل پسند نہ آئے تھے۔ مگر وہ مجبوراً" چپ سادھے بیٹھی رہی۔ ان دونوں کی خاموشی اس کو مزید تاؤ دلانے کے لیے کافی

تھی۔ ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

"وہ ڈاکٹر بکواس کررہا تھا۔ فضول الزام لگا رہا تھا اور تم چپ بیٹھے سنتے رہے۔"

"خدا کے لیے خاموش رہو تم' میری بات غور سے سنو صفیہ! جب کنزیٰ کی وہ حالت ہوئی تھی تو اس کے اس رویے سے میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا اور میں نے بہت تفصیل سے سونی سے یہ سب ڈسکس بھی کیا تھا اور ہوسکتا ہے کہ یہ سب درست بھی ہو۔ بہرحال اس بات سے انکار نہیں ہے کہ انسانی دماغ بہت ہی عجیب اور ناقابل بیان شے ہے۔" شمعون بہت ٹھہر ٹھہر کر دونوں کو دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ صفیہ کی تیوری بگڑ گئی۔

"صد افسوس کہ اپنی بہنوں کے بارے میں اتنی چھوٹی سوچ ہے تم لوگوں کی۔ میں تم دونوں سے زیادہ سمجھتی ہوں دونوں کو' ان کی سوچ کو' ان کے دماغ کو۔"

وہ غصے سے کہتی سامنے لگی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئی۔

نیند آور ادویات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اتنی گولیاں پھانک کر بھی اسے نیند نہ آئی تھی۔ وہ ساری رات بستر پر لیٹی، بغیر ہم کلام ہوئے چھت کو گھورتی کچھ تلاشتی رہتی۔ وہ باری باری جاگ کر اس کی دیکھ بھال کرتیں۔

اس کی منگنی کا دن آکر گزر بھی گیا تھا۔ کسی کے نام کی انگوٹھی پہننے کے بجائے کالی قسمت کی چادر اس کے مقدر نے اوڑھ لی تھی۔ منگنی سے پچھلے روز ہی اس کی رپورٹس آگئی تھیں۔ اریب نے فون پر ہی بتایا تھا کہ ڈاکٹرز کے مطابق اس کی تمام رپورٹس ٹھیک آئی ہیں۔ جہاں ان کے بہت سے مفروضے بے بنیاد ثابت ہوئے تھے۔ وہاں ڈاکٹر کا خیال اور تجزیہ بھی اب انہیں کسی حد تک درست لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

جس روز اس کی رپورٹس آئی تھیں۔ اسی روز شام میں راحیلہ پھپھو کا فون بھی آگیا تھا۔ سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے سونیا کی طبیعت کا پوچھا تو سکینہ خاتون نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ ٹھیک ہے۔ نہ جانے انہیں کہاں سے کن گن مل گئی تھی۔ ابھی سکینہ خاتون اسی بات پر حیران ہو رہی تھیں کہ راحیلہ کے اگلے الفاظ پر وہ گنگ ہی رہ گئیں۔

"سنا ہے بھابھی بیگم کہ سونیا پر کوئی سایہ ہو گیا ہے۔ کب سے ہے یہ سب؟ ہم سے کیوں چھپایا گیا؟" انداز تفتیشی تھا۔ سکینہ خاتون تو حق دق ہی رہ گئیں کہ خاندان میں یہ بات کیسے پھیل گئی۔

"نہیں راحیلہ! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، بس موسمی بخار تھا ذرا۔ اب تو وہ بہتر ہے کافی۔ اور بھلا ایسی کوئی بات ہوتی تو ہم تم سے کیوں چھپاتے۔ تم پھوپھی ہو اس کی۔" سکینہ خاتون کی آواز میں لرزش تھی، جسے راحیلہ صاف محسوس کر گئی تھیں۔

"رہنے دیں بھابھی! پورے خاندان میں بات پھیل گئی ہے۔ اتنے بھی بے خبر نہیں ہیں لوگ، نہ ہی اتنے بے وقوف جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔ جب چاند چڑھتا ہے نا تو سب دیکھ ہی لیتے ہیں۔ کیا موسمی بخار کے لیے آپ لوگ سونیا کو لے کر ماہر نفسیات کے پاس لاہور آئے تھے۔ معاف کیجیے گا بھابھی بیگم جہاں رشتے جوڑنے ہوتے ہیں وہاں ایسی باتیں چھپائی نہیں جاتیں۔" سکینہ خاتون ان کے کٹیلے لہجے پر خاموش سی ہو گئیں۔ اب انہیں کیا بتاتیں کہ رشتہ طے کرتے وقت ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ اور ابھی تک تو وہ لوگ خود بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہے کہ سونی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ تو وہ کسی اور کو کیا بتاتے۔

"معاف کر دیجیے گا بھابھی بیگم! بھائی اور ان کی اولاد لاکھ عزیز سہی مگر آنکھوں دیکھی مکھی بھلا کون نگلتا ہے؟ سوچا تھا کہ بھائی کے گھر رشتہ جوڑوں گی تو اپنے رشتوں سے جڑی رہوں گی مگر ایسے رشتے کا فائدہ جس میں پہلے کے تعلقات بھی خراب ہو جائیں۔ کل میں ڈرائیور کو بھجوا دوں گی۔ منگنی کا جوڑا اور زیورات بھجوا دیجیے گا بس۔ باقی جوڑے بچیوں کو دے دیجیے گا ان کی ضرورت نہیں ہے مگر زیورات اور منگنی کا جوڑا میں نے بڑے ارمانوں سے خریدا ہے۔ اس پر میری بہو کا ہی حق ہے۔" سکینہ خاتون کے دل میں پھانس چبھی تھی۔ راحیلہ فون رکھ چکی تھیں جبکہ وہ ریسیور اٹھائے دکھ اور بے یقینی کی کیفیت میں گھری کچھ بھی سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھیں۔ جس روز اس گھر میں خوشی کی رسم ہونا تھی۔ اس روز ماتم بچھ گیا۔ گھر کے سب مکین یوں ایک دوسرے سے نظر بچاتے جیسے اس سب میں اسی کا قصور ہو اور سکینہ خاتون چپ چاپ گھر کے کام نبٹاتی، چھپ چھپ کر آنسوؤں کو چادر سے پونچھتی رہتی تھیں اور ایک وہ تھی خاموش تماشائی کی مانند سب دیکھتی اور کچھ نہ کہتی۔

اس دن کے بعد سے سکینہ خاتون کے دل پر یہ جملہ ثبت ہو گیا کہ سونیا پر سایہ ہے۔ برابر والی مقبول خالہ سے کہہ کر انہوں نے ایک کراماتی بزرگ سے بڑے مہنگے تعویذ منگوائے تھے جو وہ روز صبح و شام پانی میں گھول گھول کر اسے پلاتیں مگر اتنی مہنگی دواؤں اور تعویذوں کا بھی اس لڑکی پر چنداں اثر نہ ہوتا۔ یونہی گم صم سی پورا دن بیٹھی رہتی۔ کسی سے کوئی بات نہ کرتی۔ اسکول جانا تو اس نے دو ہفتے قبل ہی چھوڑ دیا تھا۔ محلے کی کسی بزرگ خاتون نے سکینہ خاتون کو کسی دور افتادہ مقام پر کسی "بابا" کا بتایا تھا جو دم کرتے اور آسیب کو قابو میں کرنے کا گر جانتے تھے۔ سکینہ خاتون نے بابر سے بات کی کہ اس جمعہ وہ ان کے ساتھ سونیا کو لے کر اس "بابا" کی حاضری دے تو بابر ان پر الٹ پڑا۔

"خدا کا واسطہ ہے اماں! آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں۔ اسے ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ علاج چاہیے اسے۔"

"تو کھلا نہیں چکے دوائیوں کے پھکے آرام آنا ہوتا تو آجاتا۔ پوری پوری رات بدروحوں کی طرح بولائی بولائی کمرے کے پھیرے لیتی اور چمگادڑ کی طرح ساری ساری رات جاگتی ہے۔" بابر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تعویذ گنڈے تو آپ بھی آزما چکی ہیں کیا فرق پڑا۔"

"وہ ڈھونگی تھا نامراد پیسے بٹور کر تعویذ دینے والے کے ہاتھ میں بھلا کہاں شفا ہو گی۔ یہ بابا تو فی سبیل اللہ دم کرتے ہیں۔" بات تو ان کے دل کو لگی لیکن فوراً بھل پڑیں۔

"اماں! آسیب یوں نہیں ہوا کرتا کوئی آثار بھی تو دکھیں نا آسیب کے۔" بابر نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آئے ہائے تو ہو سکتا ہے کسی نے کوئی تعویذ کروا دیے ہوں بلکہ ہو نہ ہو اس "بلو" نے ہی کچھ کروایا ہو گا میری بچی پر۔ یاد نہیں جان کو آگیا تھا کہ رشتہ کر کے ہی ٹلے گا۔ کتنی بار انکار کیا مگر ہر دوسرے روز محلے کے کسی بڑے کو سرپرست بنا کر بھجواتا تھا۔ آخر میں کیا کہا تھا اس لوفر نے کہ اگر مجھ سے شادی نہیں کی گئی تو کسی اور سے بھی نہ ہونے دوں گا۔ ارے تھا تو چوڑے جیسے دل کا مالک اتنا دم خم کہاں تھا کہ کچھ کرتا اس لیے یہ اوچھے ہتھکنڈے اپنا لیے ہوں گے اس ناس پیٹے نے۔ مری ہوئی چھپکلی جیسی شکل تھی ناہنجار کی۔"

بابر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ محلے کے جس لڑکے کا وہ ذکر کر رہی تھیں اسے لندن گئے ہوئے بھی سات ماہ ہو چکے تھے۔ یہ سچ تھا کہ اس نے سونیا کے لیے بارہا رشتہ بھجوایا تھا مگر کسی کام دھندے کے نہ ہونے کے باعث عبدالغنی اس رشتے کو بری طرح مسترد کر چکے تھے۔ ویسے بھی سات سمندر پار سے اسے کوئی اور کام نہ تھا سوائے تعویذ کروانے کے۔ اب تک تو شاید وہ بھول بھال گیا ہو گا۔

بابر نے سوچتے ہوئے وہاں سے جانے میں ہی عافیت جانی کہ اب سکینہ خاتون جو شروع ہو چکی تھیں تو "بلو" کی اگلی پچھلی سات پشتوں کے وہ لتے لیں گی کہ انہیں بخشوا کر ہی دم لیں گی۔

☼ ☼ ☼

وہ صحن کے وسط میں لگے پیپل کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کوئی جانتا بھی نہ تھا جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں اُمڈ آنے والی نمی کو اس نے تیزی سے پونچھ ڈالا۔

اسے بڑی شدت سے بدبو آنے لگی تو یک دم احساس ہوا کہ پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے وہ نہائی تک نہ تھی۔ پانی سے خوف آنے لگتا تھا۔ تب ہی اسے کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ رخ موڑ کر دیکھا تو صفیہ برابر میں ہی بیٹھی تھی۔ اس نے پھر سے نگاہیں جھکا لیں۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو اکیلے؟"

وہ خاموش رہی۔

"اب آگے کا کیا سوچا ہے؟" اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے صفیہ کو دیکھا۔ کیا اب بھی "آگے" کچھ تھا جس کے بارے میں مزید سوچنا باقی تھا؟ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"راحیلہ پھپھو نے رشتے سے انکار کیا تو تمہیں افسوس نہیں ہوا؟" اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کی انا پر

کیسے ضرب پڑی ہے۔ کیسے اس کی عزت نفس کو مجروح کیا گیا ہے۔ وہ خاموشی سے ہاتھوں کو مسلتی رہی۔

"اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ تم خود انکار کر دیتیں۔"

"انکار کی کوئی وجہ تو ہوتی بلاوجہ انکار کر دیتی؟" پہلی بار وہ اس طرح سے بولی تھی۔

"انہوں نے بھی بلاوجہ انکار نہیں کیا؟"

"بلاوجہ کہاں؟ انہوں نے بالکل ٹھیک انکار کیا ہے۔" اس نے فوراً" تردید کی۔

"ویسے کیا رکھا ہے اس شادی میں۔ نری دردسری ہے۔ کنزیٰ نے ٹھیک کیا تھا۔ تمہیں بھی یہی کرنا چاہیے تھا۔ میں تو کہتی ہوں اب جو بھی رشتہ آئے تم انکار کر دینا۔ لوگ تمہیں مسترد کریں اس سے پہلے تم انہیں مسترد کر دو۔" اس نے اچنبھے سے صفیہ کی جانب دیکھا جو عجیب طریقے سے مسکرا رہی تھی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" اسے یقین نہ آیا تھا۔

"غلط کیا کہا ہے؟" اسے صفیہ کی مسکراہٹ سے بہت الجھن سی ہو رہی تھی۔ ابھی وہ اس ادھیڑبن میں تھی کہ کسی نے اسے برآمدے سے پکارا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو اسے بری طرح کرنٹ لگا۔ دور برآمدے سے اسے پکارنے والی کوئی اور نہیں "صفیہ" تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ مڑی تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ اس کے برابر میں اب صفیہ نہیں تھی۔ وہ جگہ خالی تھی۔

اس کا دل اچھل کر حلق تک آگیا۔ تیر کی طرح وہ الٹے قدموں سے وہاں سے بھاگی اور برآمدے تک پہنچ کر پھر سے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اور پھر اگلے ہی روز سونیا پچھلے صحن میں گھاس پر بے ہوش پائی گئی تھی۔ مغرب کا وقت تھا۔ کنول اور ثوبیہ نے اسے کچے صحن کے اس حصے میں بے خبر پایا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے تو کہیں جا کر ہوش آیا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔

"اس گھر میں تو جیسے دیکھو نکما ہے' نرا نکھٹو۔ کوئی کام دو تو بھاگتا ہے۔ میں بھی رانی' تو بھی رانی کون بھرے پنگھٹ سے پانی۔ بڑا دیکھو تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے۔ چھوٹا اپنی منطق گھڑے بیٹھا ہے۔"

ٹھنڈے پانی کی پٹیاں سونیا کے ماتھے پر رکھتے وہ اونچا اونچا بولتے سب کو سنا رہی تھیں۔ دو روز سے سونیا بخار میں تپ رہی تھی۔ سکینہ خاتون کو بڑا قلق تھا کہ بابر انہیں لے کر نہیں گیا سونیا کو دم کرانے تب ہی بچی کی یہ حالت ہو گئی۔ بابر باہر برآمدے میں کان لپیٹے چائے پی رہا تھا۔

"ارے بچی کی جان لبوں کو آگئی مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ کیا جاتا جو دم کرانے لے جاتا۔ اللہ کا کلام ہی ہے ناشفا ہی ہوگی۔ پوچھتے پوچھتے تو خدا کا گھر بھی مل جاتا ہے مگر نہیں جی مل بچی جھلستی رہے۔ سچ کہیں بلی تو ہاں میاں بلی ہی سہی۔ اپنی کر لو سب ایکا دکھا دو اس بڑھیا کے خلاف۔" وہ سخت بھری بیٹھی تھیں۔

"بھابھی بیگم! چھوڑیں شمعون لے جائے گا۔" فرحت بہار از راہ ہمدردی بولیں تو سکینہ خاتون اس پر چڑھ دوڑیں۔

"آئے ہائے تو گدھی کمہار کی' تجھے رام سے کیا کام؟ شمعون سے کیوں کہہ دوں کان پکڑی باندی ہے وہ کیا؟ اپنا بھائی کیوں نہ لے کر جائے اس کا۔" بابر برآمدے میں بابر کے قریب بیٹھی پریشان صورت لڑکیوں نے سرخ پڑتا چہرہ لیے بابر کی جانب سر اٹھا کر دیکھا جو پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ سکینہ خاتون غصے میں جب بھی آتیں سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتیں اسی لیے فرحت بہار نے برا مانے بغیر خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

"سونی ہماری بھی بچی ہے بھابھی بیگم! ایسا فرق پڑتا ہے شمعون لے کر جائے یا بابر' دونوں ہی بھائی ہیں

اس کے۔ وہ آج آتا ہے تو میں اس سے کہتی ہوں بلکہ میں خود جاؤں گی اس کے ساتھ آپ فکرمند مت ہوں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔"

بختیار بیگم نے اندر آتے ہوئے بڑے رسان سے کہا تو سکینہ خاتون تاسف سے سر ہلا کر رہ گئیں۔

"دو انڈے' دونوں ہی گندے۔" بابر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ عطیہ نے اسے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"اس وقت کچھ مت کہنا بابر۔ وہ غصے میں ہیں جب وہ کہہ رہی ہیں تو لے جاؤ نا سونی کو دم کرانے۔" وہ میز پر کپ دھرتے ہوئے بے بسی سے محض لب بھینچ کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ بت بنی اس کے سامنے لبوں پر قفل لگائے بیٹھی تھی۔ وہ پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا' مگر پتھر کا بت' بت ہی رہا اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

"خدا کا واسطہ ہے سونیا! کچھ تو بولو یار کہ کیا مسئلہ ہے؟ مجھ سے تو شیئر کرو۔ بھائی سمجھ کر نہ سہی۔ کزن سمجھ کر ہی سہی' دوست سمجھ کر ہی سہی۔" وہ زچ ہو گیا تھا۔

وہ تین روز بعد بخار کے اثر سے باہر آئی تھی اور اس دوران سب ہی اس کے لیے متفکر تھے۔ آج وہ دکان سے سیدھا اندر اس کے کمرے میں گیا تھا جہاں سب باتوں میں مگن تھیں اور وہ خالی الذہنی سے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ تب ہی وہ سب کے درمیان سے اسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا باہر کی جانب بڑھا۔ ان سب نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا اور جوں ہی صفیہ نے کچھ کہنے کو لب وا کیے اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"کوئی ہمارے پیچھے نہ آئے اور نہ ہی کوئی سوال کرے۔" سب وہیں دبک گئی تھیں۔ آج تک کسی نے بھی اسے اس روپ میں نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی' مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

وہ اسے گھسیٹتا ہوا صحن کے پچھلے حصے میں لے آیا تھا۔ اسے آج سونیا سے دو ٹوک بات کرنا تھی۔ اسے اعتماد میں لے کر تمام راز جاننے تھے۔

"میں پاگل نہیں ہوں شمعون۔" ٹوٹ ٹوٹ کر یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے تو وہ واقعتاً" چونکا تھا۔

"ہاں تم پاگل نہیں ہو پھر؟" اس نے تائید کر کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرا کوئی الوژن بھی نہیں ہے۔"

"ہاں نہیں ہے پھر؟" وہ اسی انداز میں گویا ہوا تو وہ زچ ہو گئی۔

"مجھے کوئی ڈپریشن بھی نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں شفاف پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔

"تو پھر کیا پرابلم ہے؟"

"تم یقین کرو گے میری بات کا؟" اس نے مضمحل لہجے میں سوال کیا تو وہ محض سر اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔

"مگر کیا ثبوت ہے کہ تم شمعون ہی ہو' تمہیں سب بتا دوں اور تم بعد میں قہقہے لگا کر مجھے تضحیک کا نشانہ بناؤ' ہاں۔" وہ زہرخند ہوئی تو وہ حیران پریشان سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"کیا مطلب ہے کہ میں شمعون نہیں ہوں؟"

"میرا یقین کرو شمعون! یہ میرا الوژن نہیں ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے کوئی ڈپریشن نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے نہیں پتا وہ کون ہے۔ لیکن اس نے میری زندگی دوبھر کر رکھی ہے۔ کبھی وہ ماریہ کے روپ میں آتا ہے تو کبھی صفیہ کے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے اب اپنی ہی بہنوں سے' اپنے ہی پیاروں سے کہ کہیں وہ بہروپیا ہی نہ ہو۔ مجھے تم سے اس وقت خوف محسوس ہو رہا ہے کہ تم بھی کہیں۔" ٹپ ٹپ آنسو اس کی گود میں دھری ہتھیلی پر گر رہے تھے۔

"وہ کہتا ہے مجھے کہ وہ کبھی بھی میری شادی نہیں ہونے دے گا۔ کبھی میری شادی نہیں ہوگی۔ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

وہ کہتے ہوئے اپنی آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔شمعون سناٹے میں آگیا تھا۔

"کوئی بھی اتنا بااختیار نہیں ہو سکتا۔" وہ جیسے بڑی دقت سے گویا ہوا۔

"وہ ہے شمعون! میں نے دیکھا ہے اسے کہ وہ اتنا ہی طاقتور ہے۔" وہ کسی ضدی بچے کی طرح اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولی تو شمعون نے نرمی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تم نے کیا اسے خدا سے بھی زیادہ بااختیار پایا ہے سونی؟ کیا مخلوق خالق سے زیادہ بھی بااختیار ہو سکتی ہے بھی؟" وہ محض ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ کر رہ گئی بولی کچھ بھی نہیں۔

"اللہ کی کوئی بھی مخلوق محض اتنا ہی اختیار رکھتی ہے جتنا کہ اللہ چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اگر یہ تکلیف اسی طرح سے اتنی ہی تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو وہ تمہیں مل کر رہے گی۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔" وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی۔

"تمہیں یقین تو ہے نا میری بات پر؟" وہ اس کا ہاتھ تھامے آنکھوں میں واضح سوال لیے ہوئے بولی۔ وہ کیا جتا تا کہ وہ ششدر رہی تو رہ گیا تھا۔ اس حقیقت کے سامنے آنے پر۔ الفاظ کچھ لمحے کے لیے آپس میں گڈمڈ ہو چکے تھے اور ذہن تھا کہ سوچنے سے قاصر۔

"ہاں سونی! مجھے یقین ہے۔" اس نے بمشکل خود کو کہتے پایا تھا۔ "اب اندر چلتے ہیں اور تم کسی سے بھی اب اس بات کا ذکر مت کرنا۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے طور پر کیا کر سکتا ہوں۔" وہ پرسوچ نگاہوں سے زمین کو تکتے ہوئے بولا۔

"تم کیا کرو گے؟ تم کچھ کر سکتے ہو؟" وہ بڑی بے قراری سے اس کی طرف بڑھی۔

"کرنے والی ذات اللہ کی ہی ہے سونی۔ اس کے سوا کسی سے امید لگانا بھی نہیں چاہیے۔ اس کی ذات کا سہارا ہی اصل سہارا ہے۔ انسان کی ذات کا سہارا بھی انسان کی طرح ہی عارضی ہوتا ہے۔ بہرحال کوشش شرط ہے اور میں کوشش ضرور کروں گا۔ خدا نے دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور رہنمائی کے لیے انبیا اور صحیفے اتارے تو ہم اس کی کسی مخلوق کے آگے بے بس کیوں ہو جائیں۔"

اس نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے اس کی چوڑی پشت پر دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی کسی ایک انسان سے ساری باتیں کر لینا دل کو کتنی تقویت دیتا ہے۔ وہ یکدم ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک چھوٹا بچہ جس کی عمر لگ بھگ نو سال ہو گی اسے برآمدے سے ملحقہ صاف ستھرے کشادہ کمرے میں لے آیا جو گھر کے باقی حصے سے قدرے ہٹ کر تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک مسحور کن خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ کمرے کی داہنی دیوار دیوار گیر الماری سے مکمل ڈھکی ہوئی تھی۔ الماری میں دنیا جہاں کی بیش بہا کتب بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی تھیں۔ جو یقیناً "پڑھنے والے کے ذوق کی غماز تھیں۔ بائیں جانب کی دیوار پر سنہری رنگ کی روشنائی سے جلی حروف میں بڑے خوب صورت انداز سے آیت الکرسی لکھی گئی تھی۔

اس پر چھایا طلسم ٹوٹا تھا۔ جب سامنے دروازے پر آہٹ ہوئی اور ایک باریش بزرگ نمودار ہوئے۔ وہ تعظیم کے طور پر آگے بڑھا تو انہوں نے فوراً" ہاتھ آگے مصافحے کی غرض سے بڑھایا۔

"السلام علیکم برخوردار! میں عبدالرحیم ہوں۔" ان کا ہاتھ تھامتے وہ خفیف سا سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام میاں جی! میں سرگودھا کے ایک قصبے سے آیا ہوں۔ میرا نام شمعون ہے۔" ان کا ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں مقید تھا۔

"میاں جی۔ مطلب کسی جاننے والے نے بھیجا ہے تمہیں اور کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے آئے ہو۔" اس کے میاں جی کہنے پر ہی یقیناً" انہوں نے اندازہ لگایا تھا۔

"جی میاں جی! ایک دوست نے آپ کا بتایا تھا۔" محسن اس کے ساتھ والی دکان کے مالک کا بیٹا اور اس کا قریبی دوست تھا۔ جس نے اسے یہاں بھیجا تھا۔

"ہوں۔ بیٹھو۔" وہ دونوں وہیں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھا دیوار پر لکھی آیت الکرسی کو تک رہا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں انہوں نے نظریں دوڑائیں تو وہ خود ہی پوچھ بیٹھا۔

"یہ اتنے اچھوتے انداز میں آیت الکرسی کس نے لکھی ہے؟"

"جو چیز بذات خود خوب صورت ہو اسے کسی بھی رنگ میں ڈھال دو تو وہ خوب صورت ہی دکھتی ہے۔ اللہ کے کلام کا تو بڑا حق ہے ہم پر کہ اسے خوب صورت انداز میں پیش کیا جائے۔" وہ مسکرائے۔

"خیر بتاؤ کیسے آنا ہوا؟" بہت دھیمے انداز میں کہتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"میاں جی! میری بہن۔ وہ بہت بیمار ہے۔ مجھے سرگودھا ہی سے محسن خالد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سنا ہے کہ آپ روحانی علاج بتاتے ہیں اور آپ کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر میں اس وقت بڑی پریشانی ہے۔ ہمارے لیے بھی دعا کر دیجیے" وہ دوزانو بیٹھا بڑے ادب سے مخاطب تھا۔

"دعا تو تمہاری بھی قبول ہوتی ہے۔ انسان جتنی لگن سے اپنے لیے دعا کرتا ہے کوئی اور اس کے لیے نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے۔ بس ہمیں دعا مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔"

"میاں جی! کوئی توڑ بتائیں۔ کوئی علاج، کوئی وظیفہ؟"

"علاج تو تمہارے گھر کے کسی طاقچے میں سجا ہو گا۔ جاؤ جا کر کھنگالو اسے۔"

"کیسا علاج؟" وہ ناسمجھی سے گویا ہوا۔

"اللہ کے ہاں حاضری لگاتے ہو؟" بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تھی ان کے چہرے پر۔ وہ نظر نہ ہٹا سکا۔ کچھ دیر وہ ان کے سوال پر غور و خوض کر کے بڑے رسان سے بولا۔

"کبھی کبھی حاضری دے دیتا ہوں، مگر باقاعدگی سے نہیں۔" اس کی صاف گوئی پر ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "چلو اتنے بھی کچے نہیں ہو۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے، اس کے حضور حاضری دیتے رہا کرو۔ حاضری دو گے تو ہی اس کی نظروں میں اٹھ سکو گے۔"

"کیا اب میں اس کی نظروں سے دور ہوں؟"

"نظر تو اسے ذرے کا ذرہ بھی آتا ہے۔ جب انسان الیکٹرون، پروٹون کے بھی سب پارٹیکلز تک جا پہنچا ہے اور اس نے لیپٹانز، بیروئز اور کوارکس نکال لیے ہیں تو بنانے والا کیا نہ جانے گا؟ اس کے علم میں بھلا کیا نہیں ہے؟ مگر علم ہونا الگ بات ہے اور اس کی نظر میں آجانا الگ بات۔ اس کے علم میں نہیں اس کی نظر میں آنے کی سعی کرو۔" وہ ہونق بنا انہیں تکنے لگا۔

"میاں جی! اس کی نظر میں تو مقرب ہی آتے ہیں ہم جیسے کہاں؟"

"مقرب تو انسان کے اعمال اسے ٹھہراتے ہیں۔ جتنی روح پاکیزہ ہو گی اتنی مقرب ہو گی۔ اور روح کی پاکیزگی اعمال و افعال پر منحصر ہے۔ مقرب وہ نہیں جو خود کو خدا کے قریب محسوس کرے، مقرب تو وہ ہے میاں جسے خود اللہ اپنے سے قریب کر لے۔ خدا کے قریب ہونا کیا ہوتا ہے جانتے ہو؟" اس کی اپنے وجود پر گڑی نظروں میں جھانک کر انہوں نے پوچھا تو اس کے بے ساختگی سے نفی میں سر ہلا ڈالا۔

"جو شخص مخلوق کے دلوں میں بس جائے خالق اسے خود ہی نظروں میں بسا لیتا ہے۔ لیکن مخلوق کی نظروں میں سمانا ہی تو آسان نہیں ہے۔ بڑی جان مارنا پڑتی ہے۔ اپنا آپ مارنا پڑتا ہے اس کے بندوں کے لیے۔ رحمٰن کو منانا تو آسان ہے، مگر عبدالرحمٰن کو منانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اصل راستہ ہی رحمٰن تک عبدالرحمٰن سے ہو کر جاتا ہے۔ عبادت جنت تک لے جائے گی اور خدمت اللہ سے ملا دے

گی۔ "تھوڑے بے مسکرا کر انہوں نے خود ہی موضوع بدل ڈالا۔

"خیر چھوڑو گھر جاؤ اور روزانہ اونچی آواز سے گھر کے کسی گوشے میں سورہ بقرہ پڑھ یا لگا دو۔ اتنی اونچی کہ گھر کے ہر ہر کونے تک آواز جائے۔ یوں تو سورہ بقرہ کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں، مگر ایک اہم حدیث سنائے دیتا ہوں، جس پر یقین واثق کبھی ناکام نہ ہونے دے گا کہ جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جائے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے، روزانہ یہ عمل کرو جب تک اثرات زائل نہ ہو جائیں اور یقین رکھو کہ اللہ کے کلام میں بڑی شفا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میاں جی! آپ کی دعا بھی چاہیے۔"

"برخوردار جتنا تم خود اپنے گھر والوں کے لیے دعا کر سکتے ہو یا وہ بچی خود اپنے لیے، اتنی خلوص نیت سے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔"

"مگر ہماری دعاؤں میں اثر کہاں ہے؟" اس نے یاسیت سے کہتے ہاتھ مسلے۔

"یقین کے ساتھ کرو گے تو قبول ہوگی، بد دل کی دعا قبول نہیں ہوتی۔"

"میاں جی! یقین کے ساتھ ہی کرتے ہیں، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اثر نہیں آتا۔"

"سارا کھیل ہی زبان، دماغ اور دل کے تال میل کا ہے۔ زبان اور دماغ کے بجائے دل اور زبان کا امتزاج استعمال کرو۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ دل میں یقین پیدا کرو۔"

"میں پوری کوشش کروں گا کہ یقین اور دل سے دعا مانگوں۔" وہ بڑی سعادت مندی سے کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میاں! ہم راہ دکھا سکتے ہیں، اس سے زیادہ کسی بندے سے امید لگانا بھی غلط ہے۔ کوشش کرو جو مدد کرنے والی ذات ہے۔ اس کی طرف پلٹو۔ اس بچی سے کہنا معوذتین پڑھے اور پڑھتی رہا کرے۔ مگر یقین کے ساتھ، دل کے ساتھ، زبان سے نہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے اجازت طلب کی تو وہ بڑی بشاشت سے بولے۔

"بیٹھو میاں، کہاں چل دیے؟ گھر آئے مہمان یوں نہیں چل دیتے۔ کچھ ہمیں بھی میزبانی کر کے نیکیاں کمانے کا موقع دو۔" انہوں نے اسے کھانے تک روک لیا تھا۔ کھانا کھا کر وہ ان سے رخصت لیتا شام تک گھر لوٹ آیا تھا۔

اس نے گھر آکر سکینہ خاتون سے کہا تھا کہ وہ روزانہ سورہ بقرہ کی تلاوت کریں۔ سونیا سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی سے برآمدے کے ایک کونے میں میز رکھ کر ڈیک لگا دیے تھے۔ وہ شام میں دکان سے لوٹ کر اونچی آواز سے سورہ بقرہ کی قرات لگا دیتا۔ سونیا خاموشی سے ڈھائی گھنٹے بڑے انہماک سے قرات سنتی رہتی۔ آہستہ آہستہ اسے لگنے لگا تھا کہ وہ پھر سے معمول کی جانب لوٹ رہی ہے۔ اس کا خوف اور بے یقینی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگ گئے تھے۔ وہ چھلاوہ جو اسے کسی نہ کسی روپ میں دکھتا تھا۔ یکدم اس کی زندگی سے غائب ہو گیا تھا۔

یقین جیتا تو شر بھاگ گیا۔ وہ آسودہ تھا۔ گھر آسودہ تھا۔ کتنا آسان تھا شر کو بھگا دینا۔ بس یقین اور ایمان کو ہی تو پختہ کرنا تھا۔

چندرہ دن میں ہی اس نے سونیا کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت میں بھی واضح فرق محسوس کیا تھا۔ پھر بھی بہت سارا سفر ابھی باقی تھا جسے تمام ہونا تھا۔

"شمعون! کیا تم اسے ہمارے امتحان کے بعد نہیں چلا سکتے۔ کچھ دن کے لیے موقوف کر دو، جب تک ہمارے ایگزامز ختم نہیں ہو جاتے۔" اس روز کنزی نے شدید کوفت میں مبتلا اسے تب ٹوکا جب وہ شام میں دکان سے لوٹتے ہی کیسٹ لگانے لگا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کو حیرت سے بہن کو دیکھا جو لب بھینچے کھڑی تھی۔

"شمعون! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کچھ دن اسے مت چلاؤ۔ بعد میں لگا لیا کرنا۔" سونیا کو اس کی حمایتی کے روپ میں دیکھ کر اسے اور بھی حیرت ہوئی اور پھر غصے سے کیسٹ وہیں رکھ کر وہ بولا۔

"جو لوگ اس وقت کے انتظار میں ایک ایک پل گزاریں کہ کب قرآن کی تلاوت ختم ہوگی اور وہ دنیا کے کام نپٹائیں گے۔ وہ لوگ کبھی کلام اللہ سے مستفید نہیں ہو سکتے۔"

پھر وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ جب سے وہ میاں جی سے مل کر آیا تھا بہت سی تبدیلیاں سب نے محسوس کی تھیں۔ وہ پہلے کی نسبت سنجیدہ ہو گیا تھا اور اس نے باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کر دی تھی جو اچھی بات وہ خود میں محسوس کرتا تھا وہ یہ کہ اس کا یقین پختہ ہو گیا تھا۔ خدا کی ذات سے یقین اور خدا کی ذات پر یقین۔ دل کو وہ بہت اوپر لے آیا تھا۔ دماغ سے بھی کہیں اوپر۔ دعاؤں کی ذمہ داری زبان سے ہٹا کر دل کے سپرد کر دی تھی۔ شر سونیا کی زندگی سے بھاگا تھا کہ نہیں، مگر اس کی اپنی زندگی سے چھٹتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور اب کتنے مہینوں بعد اسے پھر سے دورہ پڑا تھا۔ وہ بھی تب جب بہت عرصے بعد پھر سے ایک مناسب رشتہ آیا تھا۔ ورنہ تو اس عرصے میں وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی اور کوئی غیر معمولی واقعہ بھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

"پھر کہتے ہیں کہ ماں بری ہے، دل میں وسوسے ڈالتی ہے۔ ارے میرے لیے تو دم مارنے کی جگہ نہیں نہ گھر میں۔ کوئی کان دھرتا ہے میری کسی ایک بھی کہی پر، بچی جان سے جا رہی ہے، مگر نہ جی۔ جو بھی رشتہ لے آؤ یہی سب ہوگا۔ ہائے ربا! تر جاؤ کہ دکن وہی کرم ہے کے لچھن ہے۔"

سکینہ خاتون صحن میں لگے کپڑوں کے ڈھیر میں سے کپڑے نکال نکال کر تہ کر کے ایک جانب رکھتی بولتی چلی جا رہی تھیں۔ سب ہی گھر پر موجود تھے اور ان کی موشگافیاں خاموشی سے سر لپیٹے سن رہے تھے۔

"مانا کہ آئی ٹلتی نہیں، مگر تدبیر بھی کوئی چیز ہے۔ ایک ہی بھلا مانس بچہ تھا۔ اسے بھی انہوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ سالو ہاتھ سے گیا وہ بھی۔"

شمعون کے تو گویا کان ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ فوراً "کام کاج چھوڑ چھاڑ صحن میں سکینہ خاتون کی طرف لپکا۔

"نانی اماں! آپ کا خادم حاضر خدمت ہے۔ جو حکم دیں گی سر آنکھوں پر ہوگا، کہہ کر تو دیکھیے۔"

"تو بھی کہاں سنتا ہے میری۔" نروٹھے پن سے انہوں نے اس کی جانب سے رخ پھیرا۔

"کیوں نہیں سنتا، کہہ کر تو دیکھیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو کل تو ہمیں لے چلے گا دم کے لیے۔" اس نے فوراً "ہامی بھری تو وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"بس ٹھیک ہے، پھر کل صبح سویرے گجرات کے لیے نکلیں گے ہم اور دم کرا کر لوٹ آئیں گے۔"

"ہائیں! گجرات؟ اتنی دور جانا ہے میں تو سمجھا تھا کہ یہیں کہیں قریب میں جانا ہوگا۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"بس بس۔ اتنا بھی دور نہیں ہے۔ یہ دو قدم کا فاصلہ ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے اب اور تو نے زبان دے دی ہے۔ کل صبح سویرے نکل پڑیں گے۔ اس سے قبل کہ سورج سوا نیزے پر آپہنچے۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکیں نہیں اور خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب چل دیں۔ وہ وہیں کھڑا لاشعوری طور پر پھر سے میاں جی کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک چھوٹا سا مزار تھا۔ جس کے صحن میں جا بجا برگد کے درخت کے پتے بکھرے تھے۔ ہرے گنبد اور سفید دیواروں پر مشتمل مزار، جس کے احاطے میں لگے برگد کے درخت تلے ایک چوکی پر وہ میلا کچیلا بابا بیٹھا تھا۔ جسے سب سائیں بابا کے نام سے جانتے تھے۔ سکینہ خاتون، بڑی سی چادر میں لپٹی سونیا کو اس کے سامنے بٹھا کر ایک جانب بیٹھ گئیں۔ وہ خود وہیں مزار

کے احاطے میں بنی چار سیڑھیوں میں سے درمیانی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ سائیں بابا ساری بات سن کر کچھ پڑھ کر ایک بوتل میں بھرے پانی پر دم کر رہے تھے اور پھر بوتل سکینہ خاتون کی جانب بڑھا کر انہیں تاکید کی کہ روز تین گھونٹ بچی کو پلا کر ایک گلاس پانی گھر کے مختلف کونوں میں چھڑکاؤ کریں گی تو بچی اور گھر پر کرائے' تعویذ اور ممکنہ آسیب رفع ہو جائیں گے۔

سکینہ خاتون تو وہاں سے یوں لوٹیں گویا ان کی مراد بر آئی کہ آئی جبکہ سونیا واپسی پر قدرے خاموش تھی۔ اس نے ہلکے سے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے' کیا دل بھر گیا ہے یہاں آکر؟"

وہ عجیب سے تپے تپے سے انداز میں مسکرائی۔

"بھر نہیں گیا' بلکہ خالی ہی ہو گیا ہے' بچے کھچے ایمان سے بھی۔"

وہ مزید کچھ بول ہی نہ سکا تھا' پھر۔

کتنے ہی روز وہ اسے پانی پلاتی رہیں' گھر بھر میں چھڑکاؤ کرتی رہیں۔ پھر اسے کچھ ہوا بھی نہ تھا۔ لہٰذا وہ مطمئن تھیں۔

"تائی اماں کیا دم کیا ہے بابا نے اس پانی پر؟" ایک دن وہ یوں ہی پوچھ بیٹھا تھا۔

"میں کیا جانوں' کیا دم کیا ہے' کچھ اچھا ہی کیا ہو گا' تب ہی تو افاقہ ہے نا۔" اسے اس حد درجے معصومیت اور اعتقاد پر پیار بھی آیا اور رونا بھی۔

"واہ تائی اماں! کیا بات ہے آپ کی اتنی سادگی۔" وہ کہے بنا نہ رہ سکا تھا۔ "اچھا اب بس کر دے۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔" پانی چھڑک کر وہ اسے سرزنش کرتی چلتی بنیں اور وہ وہیں تاسف سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے ہاں اماں! شگفتہ نے اپنے بیٹے کی منگنی ختم کروا دی ہے' کہہ رہی تھی کہ قرۃ العین کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ مزاج تو گویا عرش پر تھا۔ وقت پر عقل آ گئی' ورنہ تو اس لڑکی نے تکنی کا ناچ نچا ڈالنا تھا' سب کو۔ ویسے اماں وہ پھر سے بیٹے کے لیے بر ڈھونڈ رہی ہے اور سونیا کے بارے میں بھی بڑا کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔" اپنا نام یہاں کے منہ سے سنتے ہی برابر والے کمرے میں جھاڑ پونچھ کرتی سونیا کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

سکینہ خاتون جب سے حمیدہ خالہ کے بیٹے کے ولیمہ سے لوٹی تھیں وہیں کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہاں کے شاندار انتظام و انصرام اور نظر کو چکا چوند کرتی لڑکیوں پر سیر حاصل گفتگو بھی انہیں مطمئن نہ کر پائی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں صفائی کرتی سونیا کا سارا دھیان ان ہی کی جانب لگا تھا۔

"رہنے دے سکینہ! شگفتہ کے گھر کا ماحول بڑا ہی کھلا ہے۔ ہمارے گھر کی بچیاں وہاں نبھا نہیں کر سکتیں اور سنا ہے کہ اس کے بیٹے کے بچھن کچھ اچھے نہیں۔" دادی نے مناسب الفاظ میں منع کر دیا۔

"اماں! سب سنی سنائی باتیں ہیں اور ایسا بھی آزاد ماحول نہیں ہے ان کے گھرانے کا۔ ویسے بھی لڑکی ذات ہے۔ کسی بھی ماحول میں ڈھل جائے گی۔" سکینہ خاتون کو دادی کی بات کھلی تھی۔

"سمانی! کنول کا پھول اگر گملے میں سجا دے گی تو وہ دن میں مرجھا جائے گا۔ رشتے' ناتے برابری کے لوگوں میں ہی بھلے لگتے ہیں۔ نہ اپنے سے بہت نیچے' نہ ہی بہت اوپر۔" دادی نے تکیے سے ٹیک لگاتے نرمی سے انہیں سمجھایا تو سکینہ خاتون کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اماں! کھوں تو ماں ماری جائے اور نہ کھوں تو باوا کتا کھائے۔ مگر رامت مانیے گا۔ جس انداز سے اس گھر کی بچیوں کی تربیت کی گئی ہے۔ ایسے میں تاحیات یہ اماں باوا کے گھر بیٹھی رہیں گی۔ ایسے کیا لعل جڑے ہیں آپ کی پوتیوں میں کہ اس سے بہتر رشتے آئیں گے۔" آج تو گویا وہ سارے لحاظ ہی بالائے طاق رکھ چکی تھیں۔

"اس گھر کی بچیوں کی تربیت اللہ' رسول کے بتائے قرآن کے مطابق کی گئی ہے۔ ہمیں ہماری پوتیوں کے لیے آسمان سے اترے شہزادے درکار نہیں' مگر ایسے خاندان تو ہوں جہاں وہ با آسانی نبھا کر سکیں۔"

سکینہ خاتون کے سخت لہجے کے مقابلے دادی کا رویہ بڑا ہی نرم و حلیم تھا۔ سونیا کو ان پر بڑا پیار آیا کہ بلاشبہ وہ ان سب کی بڑی ڈھال تھیں۔ وہ وہیں گم صم سی کھڑی تھی۔ اس کا پھر کسی کام میں دل نہ لگا تو خاموشی سے اوپر چھت پر چلی آئی۔ اکیلے بیٹھے کتنا وقت گزر گیا تھا جب وہ وارد ہوا۔ اس کے اعصاب کو معطل کرتا ہوا بھیانک وجود پر خوب صورتی کی ملمع کاری کیے ہوئے۔

"گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بس یہی کہنے آیا ہوں کہ اپنے گھر والوں کو منع کر دو کہ ان کی کوئی کوشش کارگر۔۔۔ نہیں ہونے والی جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں کبھی تمہیں نہیں چھوڑنے والا۔" اور پھر وہ لڑکھڑا کر گری تھی۔

تو مے گھنٹے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ برآمدے کی چارپائی پر سب کے درمیان گھری تھی۔ صفیہ اس پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال رہی تھی اور ارد گرد سب ہی گھر والوں کا مجمع تھا۔ کنول کپڑے پھیلانے چھت پر آئی تھی تو اس کو بے ہوش پا کر گھر والوں کو پکارا تھا۔ سب سے کیے جانے والے سوالات کا اس کے پاس صرف واحد جواب تھا' خاموشی۔ خاموشی بڑی نعمت بن جاتی ہے کبھی کبھی۔

رحیم بابا کا دم کیا پانی بھی اپنا اثر نہ دکھا سکا تھا۔ وہ ہنوز موجود تھا اس کی زندگی میں۔۔۔ سب کاوشیں اور تعویذ دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ اس کی امید دم توڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بڑے کمرے میں جمع گھر کے بڑوں اور ارباب بھائی کے درمیان زیر بحث مسئلے کی سن گن انہیں بھی مل گئی تھی۔ صبح ہی ارباب بھائی کوئی دو مہینے بعد گھر آئے تھے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت ہی آمد ہوئی ہے اور پھر دوپہر کے کھانے پر عبدالغنی صاحب بھی لوٹ آئے تھے۔ انہیں فون کر کے بلایا گیا تھا۔ تو مسئلہ واقعی گمبھیر تھا۔ اندر سے آنے والی اونچی اونچی آوازوں میں جس کی آواز سب سے نمایاں تھی' وہ سکینہ خاتون ہی تھیں اور ان کے مدمقابل ارباب بھائی بھی اتنی ہی اونچی آواز سے قدرے بدتمیزی سے مخاطب تھے۔

"اماں! میرا مطالبہ اتنا بھی ناجائز نہیں ہے۔ آپ نے تو اتنی بے نقط سنا ڈالی ہیں کہ میں تو اپنی نظروں میں خود ہی مجرم بن گیا ہوں۔"

"ارے مرنا نہجار۔۔۔ تیرے تو دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ اس قدر طوطا چشم نکلے گی میری اولاد میں نے سوچا بھی نہ تھا' نہ خون کا اثر ہوا' نہ تربیت کا' نہ جانے کس پر پڑا ہے تو۔ ماں' باپ' دادی' چاچیاں سب موجود ہیں' مجال ہے جو ذرا سی حیا ہو تجھ میں۔ گھر میں حصہ مانگتا ہے تو۔ ارے میں پوچھتی ہوں کون سا حصہ؟ تیرا اس گھر سے تعلق ہی کیا ہے؟" سکینہ خاتون بڑے کٹیلے انداز میں اونچا اونچا بول رہی تھیں۔

"اماں! بات کو بڑھائیں مت۔ مجھے محض اس گھر میں حصہ چاہیے جو میرا شرعی حق ہے۔" جواباً وہ بھی ڈھٹائی کی انتہا کیے ہوئے تھا۔

"شاباش ہے تجھ پر۔ آفرین۔ ہے بچے۔ کبھی شرعی فرض یاد نہ آیا جو ماں' باپ' بہن بھائیوں کی طرف بنتا ہے۔ بھول گیا کیسے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا ہے اس گھر نے تجھے شاید اسی لیے یہ دن دیکھنے کو مل رہا ہے۔" سکینہ خاتون کی آواز یکدم بھرا گئی تھی۔ فرحت بہار نے اٹھ کر انہیں خود سے لگا لیا۔

"ارباب! کچھ تو خیال کر بیٹا۔" بختیار بیگم نے نرمی سے اسے سمجھایا تو وہ نخوت سے سر جھٹکتا خاموش بیٹھے عبدالغنی سے مخاطب ہوا۔

"ابا جی! مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ میں لاہور میں گھر بنوانا چاہتا ہوں اور پھر میرا مطالبہ کہاں سے غلط ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ پورا گھر بیچ ڈالیں اور وہاں چل کر میرے ساتھ رہیں۔ آخر کیا رکھا ہے یہاں؟ ذرا ذرا سے کام کے لیے اتنی دور جانا پڑتا ہے۔ کب تک اس بوسیدہ در و دیوار سے چمٹے بیٹھے رہیں

گے آپ لوگ۔ میں جانتا ہوں کہ اس گھر میں میرے حصے میں چند لاکھ آئیں گے۔ جن سے نہ مجھے فائدہ ہوگا نہ آپ کو۔ بیچ دیں یہ گھر اور اینٹوں کی بھٹیاں اور چل کر سکون سے میرے ساتھ رہیں۔" وہ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ عبدالغنی خاموش تھے۔

"بیٹا! میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔ میرے مرنے کا انتظار کرلے۔ پھر بیچ دینا ان بوسیدہ درودیوار کو۔" پہلی بار آبدیدہ ہوتی دادی نے بھی لب کشائی کی تو عبدالغنی صاحب کی برداشت جواب دے گئی۔

"میری بات غور سے سن لے ارباب۔ میرے رہتے یہ گھر تقسیم نہ ہوگا۔ اگر تو اسی لالچ میں لوٹا ہے تو واپس چلا جا۔ میں سمجھوں گا کہ بابر ہی میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں ایک بازو کٹوا کر ایک بازو سے بھی زندگی گزار سکتا ہوں۔ مگر اپنی جڑیں اس زمین سے اکھاڑ کر کسی اور کے در پر خود کو اپاہج بنا کر نہیں بٹھا سکتا۔ اگر بیٹے تیرے جیسے ہی ہوتے ہیں تو میری دعا ہے کہ کسی کے بھی نہ ہوں ایسے بیٹے۔ اس گھر میں میری ماں، میرے دو بھائیوں اور ان کی اولادوں کا بھی حصہ ہے اور ابھی میں اتنا بے ضمیر نہیں ہوا کہ اپنوں کو ان کے جائز حق سے محروم کردوں۔ تجھے تیرا حصہ چاہیے؟ دوں گا میں تجھے تیرا حصہ۔ مگر پھر میری بات یاد رکھنا کہ اس گھر اور اس کے کسی بھی مکین سے تیرا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ فیصلہ تیرا ہے۔ سوچ کر بتا دینا۔"

دو ٹوک فیصلہ سنا کر وہ تیزی سے گھر کی دہلیز پار کر گئے تھے اور وہ لب بھینچے سب کی نگاہوں میں دکھ اور بے یقینی دیکھتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر چل دیا تھا۔ برابر والے کمرے میں دم سادھے خاموشی سے پوری بات سنتی وہ سب غم و غصے کے عالم میں کھول کر رہ گئیں اور کنول نے بڑی جتاتی نظروں سے سب کو دیکھا۔

"میں نہ کہتی تھی کہ لوٹنے کا کوئی تو مقصد ہوگا۔ زن یا زر۔ دیکھ لو اب۔"

☼ ☼ ☼

میاں جی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پچھلی بار کی طرح مسکرا کر مصافحہ کرنے میں پہل کی۔ وہ پھر سے شرمندہ ہو کر خود کو دل ہی دل میں لتاڑنے لگا۔

"کیسے ہو میاں؟ کیسے آنا ہوا ہے؟" وہ وہیں نیچے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"میاں جی! کچھ رہنمائی چاہیے آپ سے اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ میاں جی آپ نے اللہ کی کتاب سے رہنمائی اور مدد کی تلقین کی تھی۔ مگر مسئلہ تو یہ ہے ہم اس کتاب سے ہی ناواقف ہیں تو رہنمائی کیسے حاصل کریں۔"

"یاد رکھو کہ نیت صاف ہوتی ہے تو راستے اللہ خود کھول دیتا ہے۔ بس نیت صاف کرکے ذرا سی کوشش کرو۔ رستے کھولنے والی ذات وہ اوپر بیٹھی ہے۔" میاں جی نے بہت محبت پاش نظروں سے اوپر دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔

"میاں! کیوں ادھر ادھر در گاہوں، مزاروں پر بھٹک رہے ہو۔ جب شفا گھر میں رکھی ہے اور شفا دینے والا اتنے قریب ہے کہ تم دل میں بھی پکارو تو بھی وہ سنے گا۔" میاں جی آنکھیں بند کیے کیے ہی بولے تھے۔

"تمہاری بہن کے ساتھ جو مسئلہ ہے میں ابھی پتا کرکے بتا دیتا ہوں۔" میاں جی نے باآواز بلند کسی کو پکارا تھا۔ آنے والا سفید شلوار قمیص میں ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ وہ ان ہی کی طرح عام سا انسان دکھتا تھا۔

"عبدالواسع۔ ان کی بہن کو کوئی شیطان تنگ کررہا ہے۔ کیا تم اس کے متعلق کچھ معلومات دے پاؤ گے۔"

میاں جی کے پوچھنے پر وہ نظریں جھکائے جھکائے ہی بولنا شروع ہوا۔ "میاں جی۔ وہ ایک شیطانی طاقت رکھنے والا جن ہے میاں جی اور اس کا مقصد ان کی بہن کی شادی کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا ہے۔ مگر وہ یہ کام خود نہیں کررہا ہے، اس سے یہ کام کروایا جارہا ہے۔ دراصل ان کی بہن پر کسی نے اسی مقصد سے جادو کروایا ہے۔ وہ کون ہے جو اس جن کو استعمال کررہا ہے؟ اس کا پتا تو اللہ کی ذات کو ہی ہے۔" میاں جی کے اشارے پر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں بہت سارے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی ہے ان میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جنات بھی شامل ہیں۔ یہ ان میں سے ایک تھا۔"

شمعون پر اس انکشاف سے حیرت کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی ایسا کچھ نہیں تھا۔ کچھ پل میاں جی خاموش رہے تھے شاید وہ اسے سنبھلنے کا موقع دے رہے تھے۔ چند ثانیے بعد وہ بولا تو اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"میاں جی اب کیا کہتے ہیں آپ؟"

"اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس مصیبت سے نکالنے والی ذات محض اللہ کی ہی ہے۔" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولتے اس کے دل کو سکون پہنچا رہے تھے۔

اپنی بہن کے ایمان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرو، وہ خود ہی اپنے آپ کو اس مصیبت سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے۔ تم اسے اس پتے پر لے جاؤ۔ یہاں اللہ کی ایک مقرب بندی رہتی ہے جو اس کی رہنمائی کرے گی۔ بیٹھو، کھانا کھا کر جانا۔ تاکہ اس بندے کی نیکیوں میں بھی اضافہ ہوسکے۔"

ان کے ہاتھ سے کاغذ تھام کر اس نے زیرلب اس پر لکھے پتے کو دہرایا اور ٹیک لگا کر وہیں بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

دادی سروتے سے چھالیہ کترتے ہوئے سامنے بڑی خاموشی سے ٹی وی پر نظریں دوڑاتی سونیا کو گاہے گاہے دیکھ رہی تھیں۔ جس کا ہاتھ کسی بھی ایک چینل پر نہ ٹک رہا تھا۔ آج اس نے خود سے بہت دنوں بعد ٹی وی آن کیا تھا۔ لہٰذا ان میں سے کسی نے بھی ریموٹ چھپانے کی کسی قسم کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب خاموشی سے اندر باہر ہوتی اپنا کام کرتی ایک آدھ نظر ٹی وی پر مار لیتیں۔ شمعون وہیں قریب ہی بیٹھا دادی کا پرانا ریڈیو کھولے اس کے پرزے الگ کیے بیٹھا تھا۔ دادی اسے ہر تھوڑی دیر بعد لعنت ملامت کرتیں تو جواباً "وہ کوئی چٹکلہ چھوڑتا انہیں مزید تپا دیتا۔

"ارے بس کردے ساس بے چارے کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ تیرے دادا کا بہت پرانا اور قیمتی ریڈیو ہے جو ان کے بعد میں نے بڑا سنبھال کر رکھا۔ تو کدھر سے اسے کوٹھڑی سے نکال لایا ہے۔"

"دادی! اب اس کی قیمت وصولنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ منہ مانگے دام ملیں گے اس قیمتی ریڈیو کے۔" پیچ کس سے اس کے پرزوں پر مزید کاری گری دکھاتے اس نے دانت نکوسے تو دادی نے دور سے ہی پاس رکھا کشن اسے دے مارا۔

"لو ایک تو راتوں رات امیر ہونے کے طریقے بتا رہا ہوں۔ کیا آپ نہیں چاہتیں کہ آپ کوئین الزبتھ کی طرح ایک عظیم الشان محل میں رہتے کوئین آف سرگودھا کہلائی جائیں۔" اس کے مزید چھیڑنے پر دادی کو جلال آیا تو وہ نیچے ہاتھ جھکا کر چپل ڈھونڈنے لگیں۔ اتنے میں لوڈشیڈنگ نے کام دکھایا تو وہ منہ بھر بھر کر واپڈا کو کوسنے لگیں۔ سونیا ٹی وی کا بٹن بند کرتی، ریموٹ رکھ کر باہر جانے کو ہی تھی کہ دادی نے اسے پاس بیٹھنے کا کہا۔ وہ خاموشی سے ان کے برابر آکر بیٹھی تو دادی بڑے لاڈ سے اسے اپنے ساتھ لگا کر بولیں۔

"ہائے بچی! کچھ کھایا کر، دیکھ تو کیسے سوکھ کر کانٹا ہوتی جارہی ہے۔"

"اور سن نماز پڑھا کر، قرآن کی تلاوت کیا کر۔" پیار سے سونیا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے نرمی سے کہا۔

"دادی! دل نہیں کرتا۔" وہ بڑی بے دلی سے بولی تھی۔ شمعون نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو اب نظریں جھکائے اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔

"آئے ہائے بچی ایسے نہیں کہتے، فرض عبادت ہے، کرنا تو پڑتی ہی ہے۔" وہ خاموش رہی تھی۔ شمعون گہری نظروں سے اس کے تاثرات جانچنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہ مان جائے گی؟" اس نے

شربت کا گلاس تھام کر اس کی جانب دیکھتے پوچھا تو صفیہ نے کندھے اچکا دیے۔

"کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"تم اسے سب سے زیادہ جانتی ہو' اتنی اس کی کسی سے نہیں بنتی جتنی تم سے بنتی ہے۔" صفیہ نے جگ سے شربت دوسرے گلاس میں انڈیلتے عطیہ کو تھمایا۔

وہ تینوں صحن میں لگے درخت تلے بیٹھے تھے۔

"تم جس زمانے کی بات کر رہے ہو' اسے گزرے بہت وقت ہو گیا ہے۔ نہ اب وہ پہلے جیسی رہی ہے' نہ ہی ہمارا تعلق۔" اپنا گلاس بھر کر اس نے لبوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں بھی یہی جواب دوں گی۔" عطیہ نے صفیہ کی بات کی تائید کرتے اختصار سے کام لیا تھا۔

"یار! تم لوگ اتنا دور کیوں ہو گئی ہو اس سے' وہ بیمار ہے۔ مشکل میں ہے تو مطلب تم لوگ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ حیرت سے کہیں زیادہ مجھے افسوس ہے۔" وہ قدرے اکھڑے لہجے میں بولا۔

"ہم نے اسے نہیں چھوڑا' وہ خود اتنا عجیب طریقے سے بی ہیو کرتی ہے کہ ہم چاہتے ہوئے بھی اس سے بات نہیں کر پاتے۔" عطیہ نے گلاس وہیں ایک طرف رکھ دیا۔ شام کے وقت ٹھنڈی ہوا چلتی تھی اور درخت کے نیچے گرمی کا زور کم پڑتا معلوم ہوتا تھا۔ شمعون کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ شاید غصے کے سبب۔

"شمعون! وہ اتنا روڈ ہو جاتی ہے۔ بالکل اجنبی کہ۔" صفیہ کی بات اس نے درشتی سے کاٹ دی۔

"وہ اس وقت نارمل نہیں ہے اور میرے ساتھ بھی وہ ایسا ہی بی ہیو کرتی ہے۔ مگر میں نے تو اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑا۔ زبردستی کرنا پڑتی ہے۔ بندہ کسی اپنے کو کنویں میں گرتے تو نہیں دیکھ سکتا۔ اب بھی وہ جائے نہ جائے' میں اسے گھسیٹ کر بھی لے کر جاؤں گا۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئیں تو وہ ان پر کٹیلی نگاہ ڈالتے اٹھ کر اندر چلا آیا۔ نماز کا وقت ہونے لگا تھا۔ اسے وضو کر کے مغرب کی نماز کی غرض سے مسجد جانا تھا۔ آج وہ دو رکعت نماز حاجت پڑھ کر اللہ سے مدد کی دعا مانگے گا۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جب کوئی پریشانی آتی تو فوراً" وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ آج اپنے گھر کے ان حالات سے نمٹنے کے لیے اسے اسی سنت پر عمل کرتے اللہ سے مدد مانگنا تھی۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیوں لے کر جانا چاہتے ہو؟" وہ کپڑے دھو کر بالٹی اٹھائے برآمدے میں لے آئی تھی۔

"کیونکہ تمہیں ضرورت ہے۔" اس کے مختصر سے جواب پر وہ طنزیہ مسکرائی۔

"کس بات کی ضرورت ہے مجھے۔ شادی کی؟" اس نے کپڑے نچوڑ کر جھٹک کے تار پر پھیلانے شروع کیے۔

"ہرگز نہیں۔" اسے اس کا لہجہ اور بات دونوں ہی برے لگے تھے۔ "بلکہ اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا۔ تم غلط اور منفی خیالات کو ذہن سے جھٹک دو۔"

"شمعون! اس گھر کا واحد مسئلہ میری شادی کیوں بن کر رہ گیا ہے؟" وہ آزردگی سے پوچھ بیٹھی۔

"جس گھر میں بھی جوان لڑکیاں ہوں۔ گھر والوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان کا گھر بسانے کے بارے میں سوچیں۔"

"جانتے ہو تم' بڑھتی اور گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ گھر والوں کے بدلتے رویے لڑکیوں کو اپنی نظروں میں ہی مجرم اور بوجھ بنا دیتے ہیں۔" وہ اس قدر حساس پہلے ہی تھی یا وقت کے ساتھ ہو گئی تھی' وہ ٹھیک سے ادراک نہ کر پایا۔ مگر اسے پھر سے بے حد افسوس ہوا تھا۔

"میں تمہیں کسی بھی اس قسم کے جذبے کے تحت نہیں لے کر جا رہا' نہ ہی کوئی دم درود کروانے لے جا رہا ہوں۔ میں صرف تمہیں تمہارا یقین مضبوط کرنے کے لیے لے کر جانا چاہتا ہوں' ایمان کا وہ رشتہ جو تمہیں دکھ نہیں رہا۔ تم سے کھو گیا ہے' اسے پھر سے

پانے کے لیے۔"

"ایمان اور یقین کے لیے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"ہاں ایمان کی تازگی کے لیے۔ وہی ایمان جو ہم سب کے اندر بہت اندر کہیں دب جاتا ہے' گناہوں کی دھول تلے کہیں بہت نیچے۔ بولو چلو گی نا تم؟"

نجانے کیسا جادو تھا اس کے لہجے میں' الفاظ میں' اس کے لفظوں کی سچائی میں کہ وہ جذب کے عالم میں اسے دیکھے گئی پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اندرون لاہور کے علاقے میں سرخ اینٹوں کی بنی وہ حویلی شاید قیام پاکستان کے وقت کی تھی' جس میں مختلف تنگ و تاریک پُراسرار سی راہداریاں تھیں' جن کے اطراف چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے۔ پیلے سرخ اور گہرے سبز رنگ کے شیشے لگے تھے' جن کے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ جس کمرے میں وہ خاتون انہیں لائی تھیں وہ بھی ان ہی میں سے ایک راہداری کے اختتام پر تھا۔ دونوں کو وہیں بٹھا کر وہ دوبارہ اسی دروازے کے پیچھے کہیں غائب ہو گئی تھیں۔

پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی خاتون لال شربت کے دو گلاس ٹرے میں سجائے اندر داخل ہوئیں۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" شمعون نے کھڑے ہوتے ہوئے فوراً" ان کے ہاتھ سے ٹرے تھام کر میز پر رکھ دی۔

"تکلف کیسا؟ اتنی گرمی میں اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے ہو۔" خاتون کا لہجہ بے ریا تھا۔ وہ وہیں سامنے دھری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"نمو سے ملنے آئے ہو۔ میری بھانجی ہے وہ۔ میں رشتے کی خالہ ہوں اس کی۔ اس گھر میں بس ہم دو اور میرا چھوٹا بیٹا ہی رہتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی دکان پر ہوتا ہے۔ انار کلی میں کپڑے کی دکان ہے اس کی۔ کام اچھا چل رہا ہے تو سوچا ہے اس کی شادی کر دوں۔ گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو جائے گا تو کچھ رونق ہو جائے گی۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں۔

"نمو کا پتا کس نے دیا ہے؟"

"ایک صاحب نے بتا دیا ہے' میاں جی کہتے ہیں انہیں لوگ۔" شمعون کی وضاحت پر وہ قدرے سوچ میں پڑ گئیں۔

"انہوں نے نمو کو قرآن پڑھایا تھا۔" جیسے انہیں یاد آ گیا تھا۔ شمعون نے فوراً" تائید کی۔

"جی جی۔ وہ قرآن پڑھاتے ہیں۔"

"کس کام سے آنا ہوا؟" وہ قدرے توقف سے گویا ہوئیں۔

"بس کچھ مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔ میاں جی نے ہی بھیجا ہے۔ اسے یہاں۔" شمعون نے گلاس خالی کر کے سامنے ٹرے میں واپس رکھ دیا۔

"ہوں۔ نجانے تم کیا آس امیدیں لے کر آئے ہو گے۔ مگر میں پہلے سے بتا دوں کہ نمو کوئی آسیب' جادو ٹونے کا علاج نہیں کرتی۔ نہ ہی وہ کوئی پہنی فقیرنی ہے۔ علاج وہ تمہیں ضرور بتائے گی طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکال کر۔ مگر عمل خود کرنا ہو گا۔" انہوں نے قدرے توقف کر کے غور سے دونوں کی جانب دیکھا۔

"بیٹا! وہ ایک عام لڑکی ہے جسے شاید اگر کوئی کمال حاصل بھی ہے تو اس کا سبب اس کا خدا کی ذات پر توکل اور اس کا "صبر" ہے۔ اس کے صبر نے ہی اسے اللہ کی نظر میں خاص بنایا ہے۔ وہ تین برس کی تھی جب اس کا باپ فوت ہوا' اور نو برس کی تھی جب ماں فوت ہوئی۔ دو بڑے بھائی اپنے روزگار کے چکر میں جو میرے پاس چھوڑ کر گئے تو کبھی مڑ کے بہن کو پوچھا بھی نہیں کہ کہاں گئی؟ اس کی ساری پرورش میں نے کی ہے مگر سچ پوچھو تو اصل میں اس نے میری تربیت کی ہے۔ اس کی ذات میں جو بھی خوبیاں ہیں' وہ اس کی اپنی وجہ سے ہیں یا اللہ کی دین ہیں اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔ میں تو عام سی جاہل عورت تھی جسے وقت کے ساتھ ساتھ اسی نے عقل دی ہے۔ اس کے "صبر" نے اسے بہت سی خوبیاں ودیعت کی ہیں۔ اگر اللہ فرماتا ہے

کہ بے شک وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ سب۔" وہ اب سامنے دیوار پر دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں۔

"بیس برس کی عمر میں' میں نے اس کی شادی کی تھی۔ ان ظالموں نے کس کس طرح سے اسے نہ ستایا ہوگا کیونکہ اس بچی نے تو کبھی ایک لفظ منہ سے نہ نکالا مجھے تو تین برس بعد تب اطلاع ملی جب ظالموں نے اس بچی کی ریڑھ کی ہڈی اور ہاتھ توڑ کر طلاق دے کر رات کے کسی پہر میری چوکھٹ پر لا پٹخا۔ وہ تو تب بھی نہ بولتی تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب کیسے ہوا اور میں یہ بھی نہ جان سکی کہ ان تین سالوں میں وہ وہاں کیسے رہی' کسی جاننے والی نے بتایا تھا کہ اس کا بچہ بھی اسی دوران اس کی کوکھ میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ مگر آفرین ہے اس کے "صبر" پر۔"

ان کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو رخساروں پر بہہ نکلے تو چادر کے پلو سے انہیں پونچھتے ہوئے وہ پھر سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگیں جو دم سادھے' چپ چاپ سب سنتے جا رہے تھے۔

"زندگی میں بس ایک بار اسے بلک بلک کر روتے دیکھا ہے میں نے' شاید وہ صبر کی حد تھی' جو اس کی اپنی ذات سے متعلق نہیں تھی۔ جب اپاہج ہونے کے بعد اس نے پہلی بار نماز پڑھنے کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے اسے وضو کروایا تھا' وہ اپنی وہیل چیئر بھی نہ گھسیٹ سکتی تھی۔ میں اس کی وہیل چیئر گھسیٹتی اسے اس کے کمرے تک لائی۔ نیت کر کے جوں ہی اس نے تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھانا چاہے' اس کے ہاتھوں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ وہ نماز کے لیے کھڑی نہیں ہو سکتی تھی اپنے پیروں پر' وہ سینے پر ہاتھ نہیں باندھ سکتی تھی کہ خدا کی کبریائی کے لیے اس کے آگے سر جھکا سکے۔ اس موقع پر وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو دی تھی۔ کہ ان ظالموں نے اسے اپنے اللہ کی عبادت کے لیے اس کے سامنے کھڑا ہونے کے لائق بھی نہ چھوڑا تھا۔ اس کا شکر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیتا ہے اور اس کا صبر اس کے گرد لوگوں کی آنکھوں میں۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"وہ کہتی ہے' واقعہ جیسا بھی ہو' اس سے گزرنے والے کو رو کر یا خاموشی سے اس سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ کہتی ہے صبر پہلی چوٹ پر ہوتا ہے رو دھو کر واویلا کرنے کے بعد تو وقت کے ساتھ سب کو ہی صبر آجاتا ہے۔" آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کے ساتھ وہ مسکرا دیں۔ ان کی مسکراہٹ بھی بڑی آسودہ سی تھی۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں' وہ دونوں بے حد حیران تھے۔

شمعون کو واصف علی واصف کا ایک اقتباس یاد آگیا۔

"تکلیف ہمارے اعمال سے آئے یا اللہ کے حکم سے' مقام صرف صبر ہے۔" اور جس لڑکی کے پاس میاں جی نے اسے بھیجا تھا' وہ لڑکی اس مقام کے اعلا درجے پر فائز تھی۔

☼ ☼ ☼

عطیہ اور کنزیٰ دونوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتی' ہاتھ میں ڈائجسٹ تھامے بیٹھی تھیں۔ دونوں ہی امتحانات کے بعد فارغ تھیں اور گھر کے کام کاج صبح ہی صبح نبٹا کر یا تو ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتیں یا ڈائجسٹ تھام کر۔ آج کل ان کا محبوب مشغلہ پرانے ڈائجسٹ نکال کر بھولی بسری کہانیوں کو پھر سے دہرانا تھا۔

"اے لڑکیو! تم دونوں کو کوئی کام نہیں ہے سوائے ان ڈائجسٹوں کے؟" فرحت بہار بازار سے لوٹی تھیں۔ چادر اتار کر پلنگ پر پھینکتے انہوں نے پنکھا تیز کیا اور سامنے پڑا ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر جھلنے لگیں۔

"چاچی! بس کام ختم کر کے ہی ہم بیٹھے ہیں۔"

کنزیٰ نے جلدی سے اٹھ کر سوا سلف سمیٹنا شروع کیا اور تھیلے لیے باورچی خانے میں چلی آئی جہاں بختیار بیگم کھیر کے لیے چاول نتھار رہی تھیں۔ کنزیٰ نے ہر شے ٹھکانے پر رکھی۔

"سنو کنزیٰ!" وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ انہوں نے پکارا۔

"جی اماں۔"

"مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔" وہ متذبذب لہجے میں بولیں تو کنزیٰ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"شمعون سونیا کو لے کر لاہور گیا ہے کسی سے ملنے' شاید علاج کروانے یا دم کروانے۔ مگر میں ایک بات سوچ رہی تھی بیٹا۔ سوچا بھابھی بیگم تک بات پہنچانے سے پہلے تم سے مشورہ کر لوں۔"

چاول کی پرات پانی کے نیچے سے ہٹا کر انہوں نے چوکی پر رکھی اور ہاتھ چادر سے پونچھنے لگیں۔

"شمعون بڑا خیال رکھتا ہے سونیا کا' دونوں میں بڑی دوستی بھی ہے۔ سوچتی ہوں کہ بھابھی بیگم سے شمعون کے لیے سونیا کی بات کروں۔"

کنزیٰ ساکت و صامت ہی رہ گئی تھی۔

"بیٹا! وہ بیمار ہے' گھر کی بچی ہے۔ گھر میں ہی رہ جائے' باہر والے تو ہزار باتیں کرتے ہیں اور اس تکلیف کے ساتھ اسے کوئی باہر والا اپنائے گا بھی نہیں۔"

کنزیٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کیا یہ مناسب وقت تھا ماں سے بھائی کی پسند کا تذکرہ کرنے کا؟ ابھی وہ اسی شش و پنج میں کھڑی تھی کہ اسے دروازے پر کسی کھٹکے کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے دروازے میں ایک آنچل سرسراتا ہوا دکھائی دیا' وہ اس آنچل کو خوب پہچانتی تھی۔ وہ عطیہ ہی تھی جو سب سن کر وہاں سے جا چکی تھی۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ بختیار بیگم البتہ اسے دیکھ نہ پائی تھیں۔

"اماں! سونیا اس سے بڑی ہے۔" اس نے بودا سا بہانہ گھڑا۔

"ایک دو سال سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ گھر کا رشتہ ہے۔ اس وقت بھابھی بیگم مشکل میں ہیں۔ ہمیں ہی ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ شمعون سمجھ دار ہے' سونیا کو سنبھال لے گا۔" اس نے گہرا سانس بھرا اور تھوڑی دیر یوں ہی ماں کی شکل تکتی رہی' جو پھر سے کام میں لگ گئی تھیں۔

"اماں شمعون۔ شمعون عطیہ کو پسند کرتا ہے۔" اس نے بالآخر فیصلہ کر ہی لیا تھا بھائی کی پسند ماں کو بتانے کا۔ یہ تو وہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں کیونکہ عطیہ کی جانب سے بہرحال کبھی اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا مگر وہ پھر بھی سب جانتی تھی اور اسے ہر حال میں اس کی عزت نفس اور انا پیاری تھی۔

"ہائیں۔ عطیہ؟ مگر اس کے انداز و اطوار سے کبھی دکھا تو نہیں ہے۔ وہ تو سونیا کا بہت خیال کرتا ہے۔" بختیار بیگم چونکیں۔

"اماں! سونیا سے اس کی بہت دوستی ہے مگر سونیا اور وہ اس طرح نہیں سوچتے ایک دوسرے کے لیے۔" اسے اب عطیہ کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد ماں کو صورت حال سمجھا کر اس کے پاس جانا چاہتی تھی۔

"اچھا چلو میں دیکھتی ہوں۔ شمعون سے خود بات کروں گی میں۔" بختیار بیگم نے دودھ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

وہاں سے چھوٹتے ہی وہ کمرے میں آئی جہاں عطیہ رسالے کی اوٹ میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ کنزیٰ نے اس کے ہاتھ سے رسالہ اچک لیا۔ تپتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ وہ آنکھوں کو بار بار جھپکاتے شاید آنسوؤں کو بہنے سے روک رہی تھی۔ کنزیٰ کو یکدم بڑا پیار آیا تھا اس پر۔

"سنو۔ خبردار جو تم نے اتنے قیمتی آنسو میرے اس نکمے بھائی کے لیے خرچ کیے تو۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے۔" عطیہ نے پلکیں اٹھا کر بے اختیاری سے کنزیٰ کی جانب دیکھا اور کب کے رکے آنسو یکدم بہہ نکلے۔

اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"پاگل لڑکی! میری اکلوتی بھابھی تم ہی بنو گی۔ یہ وعدہ میرا بھی ہے اور میرے بھائی کا بھی۔" اس کے آنسو صاف کرتے وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ "ویسے مجھے

نہیں معلوم تھا کہ میرا بھائی اتنا شہزادہ ہے کہ آج اس گھنی مہمنی پر چڑھا خول اس کے آنسوؤں سے چیخ ہی گیا ہے۔"

اس کے بازو میں ہولے سے چٹکی کاٹتے شرارت سے کہتے وہ ہنس دی۔ ایک شرمگیں مسکراہٹ نے اس لمحے عطیہ کے ہونٹوں کا بھی احاطہ کیا اور اس نے جلدی سے چہرہ پونچھ ڈالا۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں کے درمیان پھر مزید کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔ خاتون نزے اٹھا کر باہر گئیں تو وہ اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور باہر کی تنگ و تاریک گلی میں تنگ دھڑنگ بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا۔ تب ہی وہ خاتون پھر سے اندر داخل ہوئیں۔

"چلو بیٹا! نمو نماز سے فارغ ہو چکی ہے۔ وہ تمہیں اندر بلا رہی ہے۔"

وہ چادر درست کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مڑ کر شمعون کی جانب دیکھا۔ کیا وہ اس کے ساتھ اندر نہیں چلے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے ساتھ اندر چلے۔

"آنٹی! کیا میں اندر چل سکتا ہوں؟" وہ بڑے مودب انداز میں گویا ہوا۔ اس کے کہے بنا ہی وہ جان گیا تھا۔ لمحے بھر کو اسے خوشگوار سا احساس ہوا۔

"بیٹا! وہ مردوں سے نہیں ملتی۔" وہ سہولت سے انکار کر گئی تھیں۔

"میں ان سے ملنے کی بات نہیں کر رہا۔ آپ پردے کا انتظام کر لیں۔ میں پردے میں رہ کر ان دونوں کی گفتگو سننا چاہتا ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑی تو ہی میں بولوں گا۔ ورنہ میں خاموش رہوں گا۔"

ایک نظر اس نے سونیا کے متذبذب چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ خاتون نے دونوں کی جانب ذرا کی ذرا دیکھا اور سر ہلاتی ہوئی واپس پلٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی اور انہوں نے دونوں کو ساتھ چلنے کا کہا تو وہ دونوں خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑے۔ تنگ سی راہ داریوں سے ہوتے ہوئے وہ ایک کمرے سے اندر داخل ہوئے جس کے بیچوں بیچ گہرے ہرے رنگ کا پردہ اوپر سے نیچے تک آتا فرش کو چھو رہا تھا۔ خاتون کے اشارے سے وہ وہیں پردے کے قریب رکھے کین کے فرنیچر میں سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سونیا پردے کے دوسرے جانب چلی گئی جہاں وہیل چیئر پر پرکشش نقوش والی خاتون بڑی سی سفید چادر اوڑھے بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم۔" سونیا نے سلام کیا تو انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر اسے بیٹھ جانے کا کہا۔ انہوں نے عام سے انداز میں اپنا تعارف کرواتے اس سے بھی عام سے سوالات کیے جن کا وہ مختصر جواب دیتی رہی۔

"سونیا! پہلے تو یہ بات اپنے ذہن سے نکال دیں کہ آپ جس مسئلہ کے لیے آئی ہیں۔ وہ میں حل کر پاؤں گی۔ میں اپاہج عورت کچھ نہیں کر سکتی۔ کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ ہم تو بس کسی کی مدد کر کے اپنی نیکیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر میں آپ کی کوئی مدد کر سکی تو میری نیکیوں میں اضافہ ہی ہو گا۔"

سونیا غور سے ان کی بات سنتی رہی۔ جو بات اسے ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ ان کے چہرے کا نور اور اطمینان تھا۔

وہ اس سے تمام حالات تفصیل سے پوچھنے لگیں۔ جو بھی اس نے اتنے عرصے میں دیکھا جو بھی اس پر بیتی کافی دیر وہ خاموش بیٹھی اس سے تمام حالات و واقعات سنتی رہیں۔ اس نے جادو سے متعلق بھی انہیں مختصر سا بتایا۔

"کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ سب جادو ہے؟" تمام گفتگو کے بعد اس نے خود ہی سوال کر ڈالا۔

"ہو سکتا ہے کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"جادو کیا ہے؟ کیا اس کا وجود ہے؟ کیا وجوہات ہیں؟"

"عربی ڈکشنری کے مطابق جادو کو سحر کہتے ہیں۔ ہر ایسے اثر کو سحر کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ معلوم نہ ہو۔ جادو میں بھی کچھ اثرات ایسے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ انسان اپنے اندر' اپنے ماحول میں چند اثرات محسوس کرتا ہے۔"

اسے یکدم بے اندر کی وہ بے چینی یاد آنے لگی جس کا سلسلہ کنزیٰ سے شروع ہوا تھا۔ یہ تمام اثرات وہیں سے پنپنا شروع ہوئے تھے۔ کنزیٰ کا گھر بھول جانا اس کا وہ چڑچڑاپن' رشتے سے انکار کرنا اور اس کے بعد سے اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔

"وہ اثرات کچھ کلمات کے ہوتے ہیں۔" دیکھو۔ جب کوئی ہماری تعریف کرے تو ہم پر اثر ہوتا ہے نا۔ ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے' فخر محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی گالی دے تو ہم پر' ہمارے مزاج پر اثر ہوتا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ محض الفاظ ہی تو ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کے اثرات ہوتے ہیں۔ ایک بات بار کہی جائے تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور بار بار کہی جائے تو اثر اور طرح سے ہوتا ہے۔ جس طرح مادی چیزیں مادی چیزوں پر اثر انداز ہوتی ہیں تو درد ہوتا ہے۔ مثلاً" ہاتھ سے کچھ ٹکرائے تو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے جسم میں روح ہے جو مادی نہیں ہے۔ اس پر معنوی یا غیر مادی چیز اثر کرتی ہے۔ مثلاً" اچھی یا بری خبر کا دل اور روح پر اثر ہوتا ہے۔ روحانی چیزوں کا اثر روح پر ہوتا ہے۔ نظر پر ہوتا ہے' خیال پر ہوتا ہے' روح جسم کے اندر گندھی ہوئی ہے' جب روح پر اثر ہو گا تو جسم پر بھی اثر آئے گا۔ بعض دفعہ ان اثرات سے روح اتنی بیمار ہو جاتی ہے کہ جسم کا ٹھیک رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جسم اور روح دونوں کا باہم رشتہ ہے۔ لہٰذا دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اثر ہو تو دوسرا لازمی متاثر ہوتا ہے۔ بعض بیان جادو کا اثر رکھتے ہیں۔"

اس نے پلکیں جھپکیں۔ اسے بھی اس وقت خود پر جادو کا اثر لگ رہا تھا۔

"جادو میں عموماً" شیاطین یا ستاروں سے مدد مانگی جاتی ہے۔ مطلب غیر اللہ سے مدد طلب کرنا تب ہی جادو کو شرک میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اہم بات جو ذہن نشین کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ اثرات جیسے بھی ہوں اللہ کے اذن سے ہوتے ہیں۔ جس کا ذکر سورہ بقرہ میں بھی ہے کہ "جو لوگ بھی جادو سیکھتے ہیں جس سے وہ میاں' بیوی میں جدائی ڈال دیں تو ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے۔" دیکھو جب عام بیماری بھی پھیلے تو اس کا وائرس ارد گرد موجود ہوتا ہے۔ مگر اس کا اثر ہر ایک پر نہیں ہوتا بالکل اس طرح جادو کا اثر کچھ لوگوں پر بہت ہوتا ہے اور کچھ پر نہیں ہوتا۔ بندہ اللہ سے مدد مانگے تو محفوظ رہ سکتا ہے۔"

اس کے سامنے بیٹھی وہ عورت کیا تھی؟ صبر و شکر کی عملی تفسیر یا معلومات کا ذخیرہ۔ کبھی کبھی ایک چھوٹے سے علاقے میں' چھوٹے سے گھر میں اللہ تعالیٰ کیسے کیسے لوگوں کو اور ان لوگوں کے دل میں کیسے کیسے خزانے چھپا رکھتا ہے۔

"کیا جادو برحق ہے؟" اس کے سوال پر انہوں نے آنکھیں کچھ دیر کو بند کر کے کھولیں۔

"جادو بالکل برحق ہے اور اس کا اثر ہوتا ہے۔ مگر صرف تب' جب اللہ چاہے۔ کیونکہ بہرحال اصل اختیار اللہ کے ہاتھ ہے۔ قرآن پاک میں ہی آتا ہے "کہ اور جادوگر کامیاب نہ ہو گا جہاں سے چاہے آئے۔"

نبی کریم اللہ کے رسول' سب سے زیادہ ذکر کرنے والے' ان پر بھی کچھ اثرات ہو گئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے امت کو سکھانا مقصود تھا۔ ایسے مواقع پر انسان کو صبر سے کام لیتے ہوئے اللہ سے ہی مدد طلب کرنی چاہیے۔"

ان کے جملے کے اختتام پر پردے کے دوسری طرف موجود شمعون خود کو نہ روک پایا۔ اس نے گفتگو کی اجازت طلب کی۔ بہت سے سوالات و ابہام اس کے ذہن میں ابھرے تھے جنہیں وہ دور کرنا چاہتا تھا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو کروایا گیا تو

اس کے اثرات کیا تھے اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی پر بھی جادو کی کوئی مثال ملتی ہے؟" حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو کیا گیا تو اس کا اثر یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ خیال فرماتے کہ میں نے یہ کام کرلیا ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ نے نہیں کیا ہوتا تھا۔"

سونیا نے پھر سے استفسار کیا کہ عام جادو اور کالا جادو میں فرق کیا ہے تو وہ کافی سوچ بچار کے بعد بولیں۔

"عام جادو تعویذ کے ذریعے کروایا جاتا ہے یا لکھ کر کہیں دبایا جاتا ہے اور کالا جادو میں عموماً" نجاست سے قرآنی آیات لکھی جاتی ہیں۔ شیاطین کو خوش کرنے کے لیے قرآن کو دبایا جاتا ہے۔ قرآن کی آیات کو الٹا لکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات قتل کرکے بھی جادو کروایا جاتا ہے۔ جادو کی صورت میں انسان اپنی عام عادات کے خلاف جاتا ہے۔" سونیا کو کنزیٰ اور پھر سے اپنا آپ یاد آیا۔

"بعض اوقات ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ قمیص کے کپڑے کاٹے جاتے ہیں۔ ڈراؤنے چہرے نظر آتے ہیں۔" اسے پھر سے اپنا خواب اور اپنے وقتاً" فوقتاً" پڑنے والے دورے یاد آنے لگے۔ خوف سے اسے جھرجھری آگئی۔

"کیا آپ ہماری رہنمائی کرسکتی ہیں کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اور یہ سب کس نے کروایا ہے؟"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تو شمعون نے ساتھ ہی سوال داغا۔ وہ جانتا تھا کہ مدد تو اللہ کی طرف سے ہے۔ مگر طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں علاج تو ہوگا ہی انسان کی تقدیر میں بلاشبہ وہی تکلیف آتی ہے جتنی خدا نے لکھی ہوتی ہے اور اس کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ جو لوگ اللہ سے دور ہوجائیں۔ شیطانی افعال ان ہی پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کنزیٰ پر بھی اثرات نظر آئے تھے۔ مگر شاید اس کی پابندی نماز نے اسے بچالیا تھا اور سونیا کی زندگی میں اسی چیز کی کمی تھی۔

"حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر بیماری کی دوا موجود ہے۔ مایوس کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ جب اللہ "کن" کہے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اس وقت آپ کا امتحان ہے کہ آپ اللہ سے کتنی مدد طلب کرتے ہیں اور کتنی غیر اللہ سے۔ یہی وقت ہے اللہ کی طرف لوٹنے کا۔ کیونکہ اللہ ہی شفا دینے والا ہے۔

کچھ باتیں ذہن نشین کرلیں۔ شیاطین ہمیشہ گندگی پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ گندگی تو خود دعوت دیتی ہے جادو کو۔"

اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔ وہ نہانے کی چور تھی۔ نہ جانے کیوں اس معاملے میں وہ بے حد سست تھی۔

"علاج کے طور پر شرعی دم کرواسکتی ہیں یا طب نبوی سے مدد لیں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کریں یا سنیں۔ خاص کر سورہ فاتحہ پڑھیں۔ کیونکہ سورہ فاتحہ سورہ شفا بھی ہے۔ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "جو کسی منزل پر پڑاؤ ڈالے اور اس منزل پر یہ دعا پڑھ لے تو کوچ کرنے تک کوئی چیز اثر نہ کرے گی۔" اس طرح صبح و شام کے اذکار پڑھیں۔ عبادات میں دوام ہونا چاہیے۔ دم بھی کرواسکتے ہیں۔ حدیث کے مطابق اس دم میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جس میں شرک نہ ہو اور یہ یقین رکھے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معوذتین پڑھیں جو خصوصاً" اسی لیے اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہیں۔ آیت الکرسی کی فضیلت پر تو کیا کہوں' زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ بیت الخلاء میں شیاطین بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا داخل ہوتے اور نکلتے وقت دعا پڑھ کر جائیں۔ کھانے پینے کا خیال رکھیں۔ کیونکہ سحر کے اثرات ان پر زیادہ ہوتے ہیں جن میں قوت مدافعت کم ہو۔ اسی لیے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جس نے صبح و شام نہار منہ عجوہ کھجوریں کھائیں اس روز اس پر کوئی زہر یا جادو اثر نہیں کرسکتا۔" وہ چیزیں استعمال کریں جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمائیں۔ جیسے شہد' کلونجی' زیتون کا تیل اور سب سے زیادہ صبر سے

کام لیں اور دعا کریں۔ صدق دل سے دعا کریں۔

لوگ حسد' تکلیف دینے کے لیے یا اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے لیے جادو کرتے ہیں اور یہ یاد رکھیں کہ عموماً" کوئی اپنا ہی جادو کرواتا ہے۔ کوئی بھی آپ کو اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا جس نے جادو کیا ہے۔ بلاوجہ کسی پر شک نہ کریں۔ دعا کرتی رہیں۔ برائی کبھی چھپتی نہیں ہے۔ اللہ کبھی نہ کبھی یہ بھید کھول دیتا ہے۔ بس ضرورت یقین کی ہے۔ دل سے کی گئی دعا کی ہے۔"

شمعون کو لگا کہ وہ میاں جی کے سامنے ایک بار پھر سے آبیٹھا ہے۔ پھر سے صدق دل سے کی گئی دعا اور یقین کا حل ہی سامنے آرہا تھا۔ بار بار آرہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ ان ہی دو چیزوں کا ہی تو فقدان ہے اس کے پاس۔

وہ پردے کے اس پار بالکل خاموش بیٹھی سونیا کی کیفیت بھی محسوس کررہا تھا۔ اس کے کمزور ایمان پر بڑی دھول چھٹنے لگی تھی۔ مگر اسے قوت صرف اس کی اپنی ذات ہی مہیا کرسکتی تھی۔ وہ دونوں اجازت لے کر کھڑے ہوئے تو تمو باجی ہلکا سا مسکرائیں۔

"بس ایک بات یاد رکھو' ہر رستہ انسان کو اللہ کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ پھر چاہے انسان مرضی سے چل کر جائے یا زبردستی بلالیا جائے۔ لوٹنا اسے اپنے اصل کی جانب ہی ہے اور انسان کی حقیقت اس کے رب سے جڑی ہے۔ یقین' دعا' صبر اور کلام اللہ سے کام لو تو ہر تکلیف تم سے دور کردی جائے گی اور سکون تمہارے اندر باہر بھر دیا جائے گا۔"

انہوں نے اسے دعا دے کر رخصت کیا۔ جو دل ایمان سے خالی ہوگیا تھا۔ آج اسے پھر سے بھرا ہوا ملا۔ جب وہ گھر کی چوکھٹ سے باہر نکلی تو۔ کوئی علاج' کوئی دم نہیں کیا گیا تھا۔ محض رہنمائی اور ایمان کی تازگی کے سامان نے ہی اسے سیراب کر ڈالا تھا۔ وہ قدرے ہلکی پھلکی ہوگئی۔

ساتھ چلتا ہوا شمعون یہ سوچ رہا تھا کہ جو لوگ اللہ کے احکام پر عمل کرنے والے ہوں اُن کے الفاظ بھی کسی سحر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں کو جھنجوڑ دینے والے۔ جو لوگ عمل سے کورے ہوں اُن کے الفاظ بھی کھوکھلے ہوتے ہیں' اثر سے محروم۔

☼ ☼ ☼

بختیار بیگم نے رات میں کھانے کے بعد شمعون سے بات کرنے کے ارادے سے اسے اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کنزیٰ بھی چلی آئی تھی۔ اسے بھائی کا ساتھ دینا تھا۔ کمرے میں آنے سے قبل وہ قطعاً" اس سے ناواقف تھا کہ وہ کیا بات کرنے کے لیے اسے بلا رہی ہیں۔ بختیار بیگم نے پہلے سرسری سے انداز میں اس کی شادی کا ذکر چھیڑا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ کنزیٰ کی شادی سے قبل وہ اس بابت سوچنا نہیں چاہتا۔

"کیا تم کسی کو پسند کرتے ہو؟" بختیار بیگم کے سوال پر وہ گڑبڑا کر کنزیٰ کی طرف دیکھنے لگا تو کنزیٰ نے اثبات میں سر ہلاتے اسے تائید کرنے کا اشارہ کیا۔

"اماں۔ اس سوال کا کیا مطلب ہے۔ جب فی الحال مجھے شادی نہیں کرنا تو۔" اس نے کنزیٰ کو یکسر نظرانداز کرکے ماں سے سوال کیا۔

"وہ اس لیے کہ میں سونیا کے لیے سوچ رہی ہوں۔ تم دونوں میں بہت ذہنی ہم آہنگی ہے۔ تم اسے بہتر طریقے سے سنبھال سکتے ہو' اس صورت حال سے جس سے وہ گزر رہی ہے۔"

وہ بھونچکا رہ گیا تھا' جبکہ کنزیٰ کو ماں پر غصہ آنے لگا۔ جب وہ پہلے سے انہیں سونیا اور شمعون کے رشتے کی نوعیت بتا چکی تھی اور بھائی کی پسند کے متعلق بھی سب واضح کرچکی تھی تو اب اس سارے کھاتے کو کھولنے کا فائدہ۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' وہ خود ہی بول پڑا۔

"خدا کے لیے اماں! وہ اور میں' جس پاکیزہ رشتے میں بندھے ہیں اسے غلط رنگ مت دیں۔ سونی میرے لیے بالکل ویسی ہے جیسے کنزیٰ۔ بہن ہے وہ میری۔"

غصے کی تمازت سے اس کا چہرہ تپ گیا۔

"اچھا تو پھر عطیہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اسے بھی بہنوں کی طرح سمجھتے ہو یا کوئی اور جگہ دینے کا ارادہ ہے؟"

وہ ہولے سے مسکرادیں تو کنزیٰ ساری بات سمجھ گئی کہ یہ ساری گفتگو اسے گھیر کر سچ اگلوانے کے چکر میں کی جارہی تھی۔ اب کی بار وہ بھی ماں کے ساتھ مسکرادی۔ شمعون اس سوال پر بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔ "اس کا ذکر کہاں سے آگیا؟"

"اسی کا ذکر تو آنا چاہیے تھا بیٹا جی۔" شمعون نے کنزیٰ کو گھورا تھا۔

"اسے کیا گھور رہا ہے؟ ادھر میری طرف دیکھ کر جواب دے۔" بختیار بیگم نے اس کے کان کھینچتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"اماں۔۔۔ کان تو چھوڑیں نا۔" ماں کے ہونٹوں پر رقصاں مسکراہٹ یہ باور کرانے کے لیے کافی تھی کہ وہ سب جانتی ہیں۔

"نالائق کہیں کا۔ ایک بار بھی تو نے مجھے نہیں بتایا۔ اگر جو میں بھابھی بیگم سے سونیا کا ہاتھ مانگ بیٹھتی تو؟ وہ تو شکر خدا کا میں نے کنزیٰ سے مشورہ کرلیا اور اس نے مجھے بتایا کہ میرا نونہال کس اڑان کو بھرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔" اس کے سر پر پیار سے چپت لگاتے وہ بڑی محبت سے بولیں تو وہ کھسیا گیا۔

"دعائیں دو بہن کو جس نے تمہارا کام آسان کیا۔" کنزیٰ اتراتے ہوئے بولی تو وہ دونوں ہنس دیے۔

"مگر عطیہ سے پہلے ان کی تین جوان اولادیں ہیں۔ اتنی جلدی وہ کبھی عطیہ کی نہیں کریں گے۔" کچھ سوچتے ہوئے وہ اپنا خدشہ ظاہر کرگئیں۔

"ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ بس جب بھی کریں عطیہ کو ہی میری بھابھی بنائیں' ہے نا بھائی؟" وہ شرارت سے اسے دیکھ کر بولی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ بختیار بیگم کے چہرے پر بھی آسودہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

لاہور سے لوٹنے کے بعد پوری رات وہ ذہن میں نمو باجی کا کہا گیا ایک ایک لفظ دہراتی رہی۔ اس کی روح بیمار تھی۔ اس کی روح پر اثرات تھے۔ اس کے خیالات پر اثرات تھے۔ اس کی نظر پر اثرات تھے۔ جب ہی وہ غیر مرئی چیزیں دیکھتی تھی' محسوس کرتی تھی۔ شیطان شیطان کا ساتھ دے کر اس کی روح کو ہر آنے والے دن کے ساتھ گھائل کررہا تھا۔ اس کے پاس واحد راستہ وہی تھا جو اللہ کی طرف جاتا تھا۔ وہ پوری زندگی اپنی مرضی سے اس راستے پر نہیں گئی تھی۔ مگر اب اس تکلیف کے باعث اس راستے پر جانے پر مجبور تھی۔ جبرا" یا رضا سے جیسے بھی ہو' ہر انسان کو کبھی نہ کبھی تو اس راستے پر قدم بڑھانا ہی ہوتا ہے۔

اگلے روز بھی وہ صبح میں ان سب باتوں پر غور کرتی رہی۔ اس نے آیت الکرسی سنی۔ اس نے آیت الکرسی پڑھی۔ اس نے معوذتین سنیں۔ اس نے معوذتین پڑھیں۔ اس نے سورہ بقرہ سنی' اس نے سورہ بقرہ پڑھی۔ اس نے غسل کیا۔ اس نے عجوہ کھجوریں نہار منہ کھانا شروع کیں۔ وہ اب کوشش کرتی تھی کہ باوضو رہے۔ اس نے تلاوت قرآن شروع کی۔ دل میں تو کبھی ذہنی آزمائش ہیں۔ اس نے صبح وشام کے اذکار شروع کیے۔

اس نے کلام اللہ سے مدد طلب کی تھی۔ اب رہ گیا تھا یقین کامل' صدق دل سے کی گئی دعا۔ صبر تو بہرحال وہ کرہی رہی تھی۔ مگر اس سب کے باوجود جس چیز کے قریب نہ جانے وہ کیوں خود کو کر نہیں پارہی تھی وہ تھی نماز۔ نہ جانے کیوں اس کے پاؤں من من وزنی ہوجاتے' کبھی جو وہ نماز کی غرض سے اٹھنے لگتی تو۔

اس سب سے اتنا تو ہوا تھا کہ اب دو ہفتوں سے اسے وہ اسے ۔۔۔ نہ دکھائی دیا' نہ محسوس ہوا تھا۔ مگر اصل کمی تو اب بھی تھی جو اسے محسوس ہوتی تھی اور وہ کمی تھی اندر باہر سکون کی۔

بہت عرصے بعد اس نے یوں جائے نماز بچھائی تھی۔ کتنی دیر وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں گھری جائے

نماز پر بنے مسجد کے محراب کو تکتی چلی گئی۔ جائے نماز پر پہلا قدم رکھتے اس کے جسم میں ایک کرنٹ سا پیدا ہوا تھا۔ دوسرا قدم رکھتے بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ آج کتنے وقتوں بعد وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ اسے خود بھی یاد نہیں تھا۔ روز وہ اسے نماز کے لیے بلاتا تھا۔ فلاح کی طرف آؤ۔ مگر وہ کبھی فلاح کی طرف نہیں آئی تھی' کان لپیٹے اس کی پکار کو حتی الامکان نظرانداز کرتی رہتی تھی اور آج۔ تکبیر کہتے ہی وہ نماز پڑھنے لگی۔

"ایاک نعبدو ایاک نستعین" اسے بری طرح رونا آنے لگا تھا۔ آج وہ اپنی غرض کی خاطر ہاتھ باندھے تابعداری سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس ذات کے سامنے جس نے کبھی اسے عطا کرنے میں دیر نہ کی۔ اس کے مانگے بغیر بھی ہمیشہ دیا اور وہ جانتی تھی کہ وہ مانگے بغیر اسی طرح دیتا ہی رہے گا۔ ایسا ہی بے نیاز تھا وہ۔ سلام پھیرتے ہوئے گالوں پر بہنے والا گرم پانی گالوں سے نیچے گرنے لگا۔

"دنیا داغوں میں؟" اس کے لب آپس میں سختی سے پیوست تھے۔ دل کی آواز سننے والا اس کے بولے بغیر بھی سن رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اوپر آسمان کی طرف نظریں اٹھائے بے آواز روتی رہی۔ آنسو بہتے چلے جا رہے تھے اور وہ خاموشی سے اوپر آسمان پر تکتی چلی جا رہی تھی۔

"اللہ!" بے اختیار اس کی زبان سے پھسلا تھا۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ آج بہت وقتوں بعد اس نے اس طرح دل سے اسے پکارا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ اس تکلیف میں مبتلا تھی۔ کیوں اتنے وقت اسے خیال نہیں آیا؟ یہ تکلیف اسی کی طرف سے تو تھی اور اس تکلیف سے نکالنے والا بھی وہی تھا۔ پھر اس کو پکارنے کی بجائے کیوں غیر اللہ کو پکارتی رہی؟ کیوں اس کے در پر آنے کے بجائے دربدر ٹھوکریں کھاتی رہی؟

ثمو باجی نے کہا تھا کہ ہر تکلیف اللہ کے اذن سے ہوتی ہے اور اللہ ہی اسے دور بھی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں اور ہاتھ رفتہ رفتہ ہوا میں بلند ہوتے چلے گئے۔

"اللہ۔" اس کا دل لرزا۔

"میرے اللہ۔" اپنے ہی الفاظ اجنبی سے لگے تھے۔ کتنے وقت بعد آج اس طرح دل سے اس نے اللہ کو اپنا کہا تھا۔ صرف اپنا' دل سے اپنے اللہ کو پکارا تھا۔

"میرے اللہ! تو ہی ہر طرح کی قدرت رکھنے والا ہے' مجھے اس تکلیف سے نجات دے دے۔ اس تکلیف سے نکالنے میں میری مدد کر جس میں پچھلے پورے سال سے میں مبتلا ہوں۔ میرے سامنے سچ لے آ اللہ' میرے سامنے سچ لے آ دل کے پورے یقین سے میں تجھے پکار رہی ہوں کہ تو ہی اب مجھ پر سب کھولے گا۔" تواتر سے بہتے آنسوؤں میں شدت آگئی تھی۔

"تو ہی رازوں کا بھید جاننے والا ہے۔ اس بھید کو مجھ پر کھول دے۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اسے تو جانتا ہے۔ اللہ جس نے مجھے اس اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ کس نے میرے ساتھ یہ کیا ہے۔ جو میری روح اور میرے جسم پر یوں اثر انداز ہوا ہے۔ مجھ پر عیاں کردے اللہ' تو کر سکتا ہے' کیونکہ تو علیم ہے تو حکیم ہے تو قادر ہے۔"

پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کی قمیص کا دامن اس کے آنسو بھگو گئے تھے۔ "ایاک نعبدو ایاک نستعین" وہ اس آیت کا ورد کرنے لگی اور کرتی ہی چلی گئی۔ سورہ فاتحہ جو سورہ شفا بھی ہے۔ قرآن کو کھولنے کی چابی کیا اس کی زندگی کا بھید کھول دے گی؟ وہ نہیں جانتی تھی مگر یقین واثق تھا کہ اللہ کی مدد آئے گی' ضرور آئے گی۔

پھر اس نے کتنی ہی بار آیت الکرسی کو پڑھا۔ کتنے سو بار' وہ نہیں جانتی تھی۔ جانتی تھی تو بس اتنا کہ وہ ظہر کی نماز پڑھنے آئی تھی اور اب عصر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اگر جادو میں کہے گئے الفاظ بار بار بولنے اس کی روح پر اثر کر سکتے تھے تو اس رب کا کلام ہزاروں بار پڑھنے سے اثر نہ ہوتا؟

دور کہیں مسجد سے موذن نے عصر کی اذان دی تھی۔

"ٹھک۔" یکدم اسے عقب میں آواز سی آئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ کسی انہونی کا خیال آیا تھا۔ وہ اس وقت چھت کی کوٹھری کے عقب میں بیٹھی تھی۔ جہاں اسے نیچے سے آنے والا کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا اور آواز یقیناً کوٹھری کے اندر سے آئی تھی۔ جائے نماز وہیں چھوڑ کر' دبے قدموں' بغیر چاپ پیدا کیے وہ کوٹھری کے سامنے کی طرف آئی تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ جب وہ اوپر آئی تھی تو اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دروازہ مقفل تھا۔ مگر اس وقت اس کے کھلے ہونے کا مطلب اندر کوئی گیا تھا۔ کسی بھنبھناہٹ کی آواز پر وہ چونکی تھی۔ آگے بڑھتے اس نے دروازے سے کان لگا کر اس بھنبھناہٹ کو سننے کی سعی کی۔ الفاظ واضح نہ تھے۔ کوئی کچھ پڑھ رہا تھا۔ کسی ورد کی مانند۔ کون تھا وہ اور کیا پڑھ رہا تھا؟

"ثمو! ہمارے بہت قریبی لوگ ہم پر جادو کرواتے ہیں۔"

باجی کے الفاظ کانوں میں گونجے تھے۔ اسے خوف سے جھرجھری سی آگئی۔ اس نے دروازے کی درز سے اندر جھانکا۔ پڑھنے والے کی پشت نظر آرہی تھی۔ مکمل چادر میں ڈھکی ہوئی پشت کے سامنے دھری پرانی سی چادر جس پر وہ جو کوئی بھی تھا۔ گرہ لگاتا کچھ باندھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ چادر اسی کی تھی جو پچھلے سال کہیں کھو گئی تھی۔

نہ جانے اندر کون تھا اور کیا کر رہا تھا؟ اس نے پھر سے آیت الکرسی کا ورد شروع کیا۔ ایک ایک لفظ کا ترجمہ ذہن میں دہراتی پورے انہماک سے پڑھے چلے جا رہی تھی۔

"کیا اللہ کے اذن سے آج اسے علم ہونے جا رہا تھا؟ کیا اللہ اسے بتانے والا تھا؟"

"اللہ اگر یہاں تک مجھے لایا ہے تو علم کا وہ حصہ دے دے جو مجھ سے مخفی ہے۔ اس شخص کو میرے سامنے کردے۔ اللہ اسے میرے سامنے لے آ۔" دعا اب کی بار دل کی گہرائیوں سے نکلی' اللہ کے دربار تک گئی تھی۔ اندر کچھ پڑھتا وہ شخص اس طرح سے مڑا تھا کہ اس کا سائیڈ رخ اس کے سامنے ہوا۔

"یہ۔" اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اندر موجود شخص کو دیکھ رہی تھی جو چادر کو پھر سے ٹرنک کے نیچے چھپانے میں جتا تھا۔ اللہ نے سچ کو آج اس پر کھول دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کھیتوں کی طرف جانے والا دروازہ کھولتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ گھر بھر اپنے کاموں میں منہمک تھا۔ کسی کا دھیان اس پر نہ گیا کہ وہ کدھر کے ارادے رکھ کر یہ راستہ استعمال کیے ہوئے ہے۔ کھیتوں کے بیچ پگڈنڈیوں پر تیز تیز چلتے اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گھر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ مقامی آبادی وہاں آکر ختم تھی۔ اس کی رفتار مزید تیز ہوئی۔ رخ قریبی گاؤں کی جانب برگد کے بوڑھے درخت کے قریب اس کٹیا کی طرف تھا۔ جہاں تعویذ گنڈے اور کالا جادو کی ماہر اماں بیلی رہتی تھی۔

اماں بیلی بظاہر تو لوگوں کی مشکلات و مسائل کے حل کے لیے انہیں تعویذ لکھ کر دیتی تھی۔ مگر کسی سے اس نے سن رکھا تھا کہ وہ در حقیقت منہ مانگی قیمت پر جادو ٹونے اور جنتر منتر کرتی ہے۔ وہ سلیہ تعویذ لینے کی غرض سے ہی تیز تیز چلتا منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دن میں نکلنا قدرے مشکل کام تھا۔ تب ہی اس نے رات کا انتخاب کیا تھا۔ اپنا دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مگر اندر لگی اس آگ کا کیا جو ہر قدم رکھتے سے مزید تیزی پکڑتی چلی جا رہی تھی۔

ابھی محض مغرب کی وجہ سے ملگجا سا اندھیرا ہی پھیلا تھا۔ لہٰذا اسے با آسانی سب دکھ رہا تھا۔ تاہم واپسی پر اسے دیر ہونے کی صورت میں کھیتوں کا رستہ اپنانے پر مشکل پڑ سکتی تھی۔ گاؤں کے اس طرف

ایک کچی سڑک بھی جاتی تھی جو کھیتوں سے ہٹ کر تھی۔ مگر وہ لمبا راستہ تھا۔ دیر ہونے کی صورت کیا بہانہ گھڑا جاتا؟ خیر بہانے تو بہت سے تھے۔ وہ سارے ذہن میں تمام کہانی کی بنت کے ساتھ مسکرا دیا۔ زہریلی ہنسی ہنستے وہ اور تیزی سے قدم اٹھانے لگا تھا۔

اماں بیلی کی کٹیا تک پہنچ کر اس نے لکڑی کا وہ ٹوٹا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر جھانکا جہاں اماں بیلی کسی وظیفے میں مصروف آنکھیں بند کیے' چادر سر پر لیے مست جھوم رہی تھی۔ دروازے پر ہونے والی دستک کے باعث اس نے آنکھیں کھولیں جو انگارے برسا رہی تھیں۔

"آجا۔ اور جلدی بول تجھے کیا چاہیے؟ میرے چلہ کاٹنے کا وقت ہونے والا ہے۔" اماں بیلی کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک تھی۔ اس نے جھٹ اپنا مدعا بیان کیا۔

"ہو جائے گا تیرا کام۔ بس ذرا نوعیت مختلف ہوگی۔ دیکھ اگر تجھے یہ کام کروانا ہے تو تعویذ کے بجائے جادو سے کام لے۔ اس کے لیے تجھے مریض کا کوئی استعمال شدہ کپڑا لانا پڑے گا۔ اور لڑکی کے سر کے بال بھی باقی کام مجھ پر چھوڑ دے۔ ایک بات یاد رکھ معاوضہ میرے مطابق ہوگا۔ اب جا۔" اماں بیلی پھر سے آنکھیں موندے تیز تیز جاپ کرنے لگی اور وہ سایہ اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے لرزتے وجود کو واپس جائے نماز تک لے آئی اور برستی آنکھوں سے اس نے عصر کی نماز ادا کی۔

ذہن پر ایک ہی سوال تھا' آخر کیوں؟

پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اوپر سے وہ کس طرح اپنے گرتے پڑتے وجود کو سمیٹتی نیچے صحن میں دھری چارپائی تک لائی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ کیسا بھیانک سچ کھلا تھا۔ کسی اپنے کا پیٹھ میں چھرا گھونپنا کیا ہوتا ہے۔ یہ وہ جان گئی تھی۔ کیسا درد اٹھا تھا جس نے سال بھر کے درد کو مات دے دی تھی۔

"چائے۔" کتنی دیر سے گم صم بیٹھی سونیا کو صفیہ نے چائے کا کپ پیش کیا تو اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے صفیہ کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں کیا تھا جو صفیہ کو الجھا گیا تھا۔

"کیا ہوا' طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ کب سے یہاں چپ چاپ بیٹھی ہو۔ کچھ ہوا ہے کیا؟" وہ وہیں اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کی گلابی رنگت میں زردیاں سی گھلتی گئیں تو صفیہ کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"مغرب ہونے کو ہے' اندر چلو۔" صفیہ نے اس کی پیشانی چھو کر دیکھی تو وہ بالکل ٹھنڈی پڑی تھی۔

"صوفی!" اس کے لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔

"مجھے معوذتین سناؤ گی۔"

اس کی انوکھی فرمائش پر صفیہ لمحہ بھر کو ٹھٹکی پھر سر اثبات میں ہلاتی اس کے برابر بیٹھی معوذتین پڑھنے لگی۔ آنکھیں برس رہی تھیں اور دل گویا کان بن گیا تھا۔ ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو رہا تھا۔ برآمدے میں داخل ہوتی بختیار بیگم ٹھٹک کر رکی تھیں۔

"سونی کی طبیعت خراب ہے پھر سے؟" بختیار بیگم بھی حیرت سے کھڑی رہ گئیں۔

"بس۔" سونیا نے ہاتھ اٹھا کر یکدم اسے روک دیا۔ صفیہ نے کن اکھیوں سے اس کی جانب دیکھا جو اپنی آنکھوں کو رگڑ رگڑ صاف کر رہی تھی۔ تب ہی شمعون گھر میں داخل ہوا تھا۔

"شمعون!" وہ بے چین سی ہو کر کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا ہے سونی؟" وہ اس کے قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"اللہ نے بھید کھول دیا مجھ پر شمعون۔" وہ ہذیانی انداز میں چلاتی اس کی طرف لپکی تھی۔ وہ حیرت میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اللہ نے مجھے بتا دیا دکھا دیا سب۔" وہ اس کا گریبان تھامے بے آواز رو رہی تھی۔ اس کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا رد عمل ظاہر کرے۔

"تم اوپر جاؤ اوپر۔ کوٹھڑی میں میری چادر پڑی ہے؟

وہی کالی چادر جس پر سبز پھول ہیں جو ارباب نے مجھے لاہور سے لا کر دی تھی۔ وہ لے کر آؤ۔" اس نے اس کا گریبان چھوڑ دیا تھا وہ بے یقینی سے پیچھے ہٹا۔

وہ اس کی بات سن کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اوپر بھاگا۔ صحن اور برآمدے میں کھڑے سب لوگ بے یقینی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے مغلوب تھے۔ شمعون کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ شام کے ملگجے اندھیروں کے باعث ہر چیز تاریک ہو گئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے دروازے کے برابر لگے سوئچ کا بٹن آن کیا۔ ساری کوٹھڑی روشنی میں نہا گئی۔

تھوڑی دیر وہ یونہی کھڑا رہا پھر تمام سامان ٹٹولنا شروع کیا۔ چارپائی کے نیچے رکھے ٹرنک کو گھسیٹ کر اس نے باہر نکالا تو ٹرنک کے سب سے اوپر ہی اسے وہ چادر نظر آگئی۔

کالی چادر سبز پھولوں والی یقیناً وہی تھی جو پچھلے سال اچانک کھو جانے پر سونیا نے ہنگامہ برپا کیا تھا۔ چادر کے درمیان میں موٹی سی گانٹھ لگی تھی جس کو کھولے بغیر وہ اسی طرح اٹھا کر نیچے لے آیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی چادر کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں سراسیمگی تیر گئی۔ شمعون نے اس کی گانٹھ کو کھولنا چاہا۔

"یہ گرہ میں کھولوں گی۔" اس کے ہاتھ وہیں تھم گئے اور چادر اس کی جانب بڑھا دی۔ سورہ فلق کی تلاوت کرتے اس نے چادر تھام لی۔

"کہو میں پناہ مانگتی ہوں صبح کے رب کی' ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے اور رات کی تاریکی کے شر سے جبکہ وہ چھا جائے۔"

"سونی خبردار مت کھولنا۔" اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس کا دل جیسے بند ہو گیا' ہاتھ کھولتے کھولتے تھم سے گئے تھے۔ حلق میں پھر سے کانٹے اگنے لگے۔ "کیا ہوا ہے سونی کھولو نا' تم نے پڑھنا کیوں بند کیا؟ تلاوت جاری رکھو اور کھول دو۔" شمعون نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے ہر

خیال' ہر آواز' ہر وسوسے کو جھٹک دیا اور پھر سے تلاوت کرنے لگی۔

"اور گرہوں میں پھونکنے والوں کے شر سے' اور حاسد سے جبکہ وہ حسد کرے اور حاسد سے جبکہ وہ حسد کرے اور حاسد سے جبکہ وہ حسد کرے۔" گرہ کھل چکی تھی۔ گانٹھ کے کھلنے پر بالوں کا گچھا پچھے اینٹوں کے پکے فرش پر گرا تو سب حق دق رہ گئے۔

"یہ میرے وہ بال ہیں جن پر اثر کرایا گیا تھا۔ دکھ اس اثر کرنے کا نہیں بلکہ اثر کروانے والے کا ہے۔" اس کے لبوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔

"ممو باجی کہتی ہیں جادو عموماً بہت قریبی لوگ ہی کرواتے ہیں' وہ بالکل سچ کہتی ہیں۔" اس نے ایک جتاتی ہوئی نظر سب پر ڈالی۔

"کس نے کی ہے یہ حرکت تم جانتی ہو اسے؟" عبدالغنی صاحب دھاڑے تھے۔

"کاش کہ میں نہ جانتی ہوتی۔" وہ پلک جھپکے بنا سامنے دیکھ رہی تھی۔ شمعون نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں۔

"میں چاہتی ہوں ابو کہ اسے بولنے کا موقع دیا جائے کہ اس نے یہ کیوں کیا؟ میں وجہ جاننا چاہتی ہوں۔" اس کے لیے اس شخص کا نام سب کے سامنے لانا سوہان روح تھا مگر بہرحال اسے سال سے چلتا کھیل ختم کرنا ہی تھا۔ عبدالغنی صاحب نے بیٹی کی بات کا مان رکھنے کے لیے ہامی بھر لی۔

"میں اوپر کوٹھڑی میں آپ کو دیکھ چکی ہوں۔ اس لیے بہتر ہوگا آپ خود ہی اعتراف کرلیں۔" اس نے دانستہ نام لینے سے اعراض برتا۔ اس کے اعلان سے سب لوگوں نے ایک ہی شخص کو واضح طور پر چونکتے اور پیچھے ہٹتے دیکھا تھا اور سب گویا سنانے میں آگئے تھے۔ سب کو یقین نہیں آیا کہ وہ شخص اتنی سادہ لوح فطرت' بے ضرر سی فرحت بہار تھیں۔

"فرحت!" بختیار بیگم بہن کے مجرم ثابت ہونے پر دہل کر رہ گئی تھیں۔

"اماں؟" ان چاروں کی نظروں میں تو گویا آسمان گھوم گیا تھا۔ فرحت بہار دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بت بنی کھڑی تھیں۔

"بتائیں اماں! سچ کیا ہے؟" ثوبیہ نے دکھ سے پوچھا تھا۔ عجیب سی بے یقینی تھی۔

"کوئی اپنی بچیوں کے ساتھ بھی یوں کرتا ہے؟ گھر کی بچیوں کے ساتھ... ہماری بچیاں کیا تیری بچیاں نہیں تھیں پھر کیوں کیا یہ سب؟" سکینہ خاتون وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر ڈھے سی گئی تھیں۔

"نہیں ہیں میری بچیاں... کسی دوسرے کی بچیاں اپنی بچیاں نہیں ہوتیں بھابی بیگم! میری بچیاں اگر آپ کی بچیاں ہوتیں تو میری بچیوں کے بارے میں بھی کوئی تو سوچتا۔ چار چار یتیم بچیوں کا بوجھ کیا ہوتا ہے وہ مجھ سے پوچھیں۔ مانا کہ وہ سونیا 'کنزیٰ' جیسی خوب صورت نہیں مگر قبول صورت تو تھیں پھر کسی کے دل میں بھی کیوں ان کا خیال نہ آیا؟ یہ سامنے کھڑی میری بہن جس کا ایک ہی بیٹا ہے اس نے بھی اپنی بہن کی بچیوں کے بجائے عطیہ کو ترجیح دی۔ راحیلہ باجی نے بھی اس گھر سے رشتہ جوڑنا چاہا تو اماں نے فوراً سونیا کو آگے کر دیا۔ میری چار چار بیٹیاں کسی کو نظر ہی نہ آئیں۔ اور بھابی بیگم! آپ کے دو جوان بیٹے ہیں' ارباب کے لیے آپ نے پسند کیا بھی تو کنزیٰ کو اور بابر کے لیے اپنی بھتیجی کا سوچے بیٹھی تھیں۔ اسی لیے میرے اندر کی ماں اتنی خود غرض ہو گئی کہ اگر اس گھر سے میری کسی بیٹی کی ڈولی نہ اٹھے گی تو کوئی دوسری بیٹی بھی رخصت نہ ہو گی۔ شروعات تو میں نے کنزیٰ سے کی تھی۔ جب محمود بھابی کنزیٰ کا رشتہ لائیں مگر کنزیٰ کے خود ہی انکار کر دینے پر میں پیچھے ہٹ گئی مگر سونیا کے لیے پے در پے آنے والے رشتوں نے مجھے اس راہ پر چلنے پر مجبور کر دیا۔" ان کے زہر خند لہجے پر سب ہی ساکت تھے۔ کبھی نہ بولنے والی فرحت بہار بولیں بھی تو کیا؟ سامنے کھڑی فرحت بہار اس فرحت بہار سے کتنی مختلف تھیں جنہیں وہ سب جانتے تھے۔

"اور اس سب میں آپ کی اپنی بیٹیاں جس ذہنی اذیت کا شکار رہی ہیں اس کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا آپ کو؟ ایک بار ہم چاروں کے بارے میں تو سوچا ہوتا آپ نے۔ سونی ہم سے الگ تو نہ تھی اماں! ہم میں سے ہی تھی۔ ہمارا حصہ تھی وہ۔ ایک بار بھی رحم نہ آیا آپ کو اس معصوم لڑکی پر۔" کنول کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اس لمحے دکھ زیادہ کڑا تھا یا پشیمانی اور ذلت کا احساس۔

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میری نیت نقصان پہنچانے کی نہیں تھی۔ میں یہ سب نہیں کروانا چاہتی تھی۔ مگر شیطان نے ایسا میری عقل پر قبضہ کیا کہ میں سب بھول ہی گئی۔"

"آپ کی کوئی تاویل ہمیں مطمئن نہیں کر سکتی اماں۔ گناہ کی طرف بڑھنے والا پہلا قدم ہی بالآخر انسان کو کھائی میں دھکیلتا ہے اگر انسان اپنے اٹھتے قدموں کو وقت پر نہ روکے' آپ نے سونیا کو ہی نہیں ہمیں بھی اتنی ہی اذیت سے دوچار کیا ہے۔" ثوبیہ تڑپ اٹھی تھی۔

"جو کچھ بھی کیا۔ اپنی ممتا سے مجبور تم چاروں کی بھلائی کے لیے ہی کیا۔" وہ آگے بڑھتے ثوبیہ اور صفیہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں لیکن دونوں نے نفرت سے جھٹک دیا۔

"بھلا؟ کیسا بھلا اماں؟ کیسی ممتا؟ یہ کیسا بھلا تھا جس میں ہم چاروں بھی سال بھر سے تکلیف اور خوف میں مبتلا ہیں۔ آپ کسی اور کی قسمت کو جادو ٹونے اور اثرات سے اپنی بیٹیوں کی قسمت بنانے چلی تھیں۔ ایسے قسمتیں بدل جاتی ہیں کیا؟ ان جنات سے' ان شیطانی کاموں کے زور سے آپ نعوذ باللہ اللہ کے فیصلوں میں ردوبدل کرنے چلی تھیں۔ کیا ملا آپ کو یہ سب کر کے اماں؟ کون سے ہاتھ پیلے ہو گئے آپ کی بیٹیوں کے؟ کتنی قسمتیں بدل دیں آپ نے ہماری؟ آپ کے گناہ نے آپ کی اپنی آخرت تو برباد کی ہی ہے ہماری زندگی بھی تباہ کی ہے۔ پوری زندگی اب ہم اپنوں سے کیسے نظر ملا پائیں گے' کیسے جی پائیں گے اس گھر میں سر اٹھا کر ہم؟ جس گھر نے آپ کی اولاد کو سائبان

ہونے کا مان دیا' اسی کو تباہ کیا آپ نے۔ جس شخص نے آپ کی اولاد کو باپ کا پیار دیا' سر پر ہاتھ رکھا آپ کی یتیم اولاد کے' اسی شخص کی اولاد کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی آپ نے۔ ہم چاروں اب کیسے جی پائیں گے اماں؟ جن کی آپ جیسی ماں ہو اس اولاد کو ویسے ہی مر جانا چاہیے۔"

صفیہ کے بھل بھل گرتے آنسو اور زبان سے نکلتے الفاظ کے نشتر ان کے دل کے پار ہو گئے تھے۔ اگر قیامت آنے کا مطلب ہر طرف تباہی' ہر رشتہ ختم ہونا ہی ہے تو آج کا دن ان کے لیے قیامت ہی تو تھا جب آشیانہ خود ان کے ہاتھوں بکھر گیا تھا۔ اپنے ہر رشتے کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا ڈالی تھی۔

صحن کے وسط میں گری چادر اور بالوں کے گچھے کو اٹھا کر صفیہ نفرت سے ایک طرف لے گئی۔ مٹی کا تیل اٹھا کر سب کے سامنے اس نے چھڑکا اور تیلی دکھا کر خود پرے ہٹ گئی۔ صحن کے بیچوں بیچ چادر اور بال دھڑا دھڑ جل رہے تھے ساتھ میں ان چاروں کے دل بھی۔ وہ روتے ہوئے اس جلتی چادر کو تکتی چلی جا رہی تھی۔

"جادو ٹونا کرنے والے کے لیے ہمارے دل میں اور اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" اپنی طرف بڑھتی ماں کو صفیہ پرے دھکیلتی اندر کی جانب بھاگی تو وہ تینوں بھی اس کے پیچھے ہی تھیں۔ سب ایک سرد اور نفرت بھری نگاہ سامنے کھڑی اس عورت پر ڈال کر اندر چلے گئے جسے اپنی اولاد نے ہی نفرت و حقارت سے دھتکار دیا تھا۔

"سونی! مجھے معاف کر دے۔ میری بیٹیوں سے کہہ' مجھ سے یوں منہ نہ پھیریں۔ ان کی ماں نے ان کی محبت میں سب کیا۔ میں ان کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔" اب کی بار وہ صحن میں کھڑی سونیا کی طرف بڑھیں۔

"خالہ جی! آپ محبت میں نہیں حسد میں اندھی ہوئی ہیں۔ انسان کا حسد ہی اسے اس حد تک گراتا ہے' محبت نہیں۔" اس نے تاسف سے اپنے قریب کھڑی اس عورت کی جانب دیکھا جو حسد کی آگ میں تو پہلے سے ہی جل رہی تھی اب اسے سب کی نفرت کی آگ میں بھی جلنا تھا۔

"یقین مان' میرا دل کٹتا تھا تجھے اس حال میں دیکھ کر' مگر نجانے میرے دل و دماغ پر ایسا قبضہ کیا شیطان نے کہ میں... تو مجھے بخش دے تو میری بیٹیاں بھی مجھے بخش دیں گی۔"

روتی بلکتی وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے بنا کچھ کہے وہ اٹھ کر اندر چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی پیکنگ کر رہی تھی۔ کل صبح اسے گجرات کے لیے نکلنا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اس نے اپنا سارا سامان بیگ میں رکھنا شروع کیا۔ اپنے تمام کپڑے اور ضروری سامان اس نے بڑے بیگ میں بھر لیا تھا اور دیگر چھوٹا موٹا سامان چھوٹے بیگ میں بھرتے اس نے آخری بار جائزہ لیتے ہوئے بیگ کی زپ بند کی۔ تب ہی صفیہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ہویدا تھا کہ وہ کسی ذہنی تناؤ کا شکار ہے۔

"کیا بات ہے' سب خیریت ہے نا' یہ منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں جناب کے؟" اب وہ بیگ میں جگہ بناتی اپنا جوتوں والا تھیلا ڈال رہی تھی۔

"تم نے تائی اماں کو کیوں کہا ہے میرے اور ثوبیہ کے رشتے کے لیے جبکہ..." اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اسے پہلے سے اندازہ تھا کہ اس کے چہرے کا تناؤ اسی وجہ سے ہو گا لہٰذا اس نے خاص توجہ نہ دی تھی۔

"اس میں اتنا ایشو بنانے والی کیا بات ہے؟" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولتی بیگ کی زپ بند کرتی دونوں بیگوں کو دھکیل کر ایک طرف رکھنے لگی۔

"تم نے کیوں منع کیا ہے؟ اماں کی وجہ سے نا' انہوں نے جو کیا میں ہزار بار تم سے معافی مانگ چکی ہوں تو پھر؟" بیگ جگہ پر رکھ کر وہ اس کے سامنے آکر اس کی

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔
"کیونکہ ابھی میری منزل کوئی اور ہے اور عطیہ کا تو تم بہت پہلے سے جانتی ہو کہ وہ اور شمعون۔۔ اور میری موٹی بہن! میں وہ سب کب کا بھلا چکی ہوں۔ تم کیوں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر گلٹی فیل کرتی ہو؟ جبکہ تمہارا تو سرے سے قصور ہی نہیں۔"
"لیکن۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی جب سونیا نے اس کی بات بیچ سے ہی اچک لی۔
"کوئی اگر مگر نہیں۔ تم بس تیاری کرو دونوں جب میں اگلے ویک اینڈ پر آؤں گی تو تم دونوں کی منگنی ہوگی۔ سچ میں کتنا مزہ آئے گا۔" وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں پیوست کرتی ایک پاؤں پر گھوم گئی۔ صفیہ خاموشی سے اس کی صورت تکتی رہ گئی تھی۔ کل اس نے گجرات چلے جانا تھا اور آج اسی لیے وہ اس سے ساری بات صاف کرنے کے لیے آئی تھی مگر وہ سونیا تھی سونیا عبدالغنی جس سے وہ آج تک کبھی بحث میں جیت نہ پائی تھی۔
چار ماہ لگے تھے اسے خود کو پھر سے بالکل نارمل کرنے میں۔ شروع شروع میں گھر کا ماحول اتنا کشیدہ رہا تھا کہ در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی۔ ان چاروں کے کہنے پر فرحت بہار روتی ہوئی گھر سے چلی گئی تھیں۔ ان کے بھائی شیخوپورہ میں مقیم تھے جہاں ان کا آبائی گھر تھا۔ آہستہ آہستہ حالات بہتر ہوتے گئے تھے۔ وہ چاروں بار بار اس سے معافی مانگ چکی تھیں بالخصوص صفیہ جو ان کی بڑی بیٹی تھی۔
سونیا نے اسے گلے لگا کر صاف کہہ ڈالا تھا کہ وہ ان چاروں سے قطعاً "ناراض نہیں ہے کہ ان چاروں کا تو سرے سے کسی قسم کا قصور نہیں رہا تھا۔ مگر ماں کے گناہ نے انہیں سب کے سامنے مجرم بنا دیا تھا۔ اپنے کمرے سے نکلنا اور سب کے درمیان بیٹھنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ تب اسی نے ان چاروں کو واپس گھر کے مکینوں سے جوڑا انہیں باور کروایا کہ ان کا کوئی قصور نہیں وہ سب اس گھر کا حصہ ہیں۔ مگر ان چاروں کے اندر جو احساس ندامت پنپ رہا تھا اس نے جانے میں بہت وقت لیا۔
پھر سکینہ خاتون نے صفیہ کو بٹھا کر اس سے ارباب کے بارے میں مرضی جاننا چاہی۔ وہ ہونقوں کی طرح ان کی شکل دیکھے گئی۔ اس گھر کا اتنا احسان تھا ان سب پر کہ وہ انکار نہ کر پائی۔
سکینہ خاتون نے بھی ماں کی طرح اسے گلے لگا لیا۔ اور وہ ان کے گلے لگی یہ سوچ رہی تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اس بدنما داغوں والی لڑکی کا انتخاب کیوں کیا؟ محض ان کی ماں کی اس حرکت اور طعنوں کی وجہ سے۔ سونیا کا دل نہیں مان رہا تھا کہ اماں نے ارباب کے لیے صفیہ کا رشتہ مانگا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا ہونہار بھائی اور چیچک کے داغوں والی اس کی کزن کا کوئی جوڑ نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی اتنا پیار اول رکھنے والی کزن کے لیے اس کا کشور بھائی ہرگز قابل قبول نہیں تھا اس پر مستزاد یہ کہ اس کے نکاح کی خبر بھی اڑی ہوئی تھی۔ ان ہی دنوں وہ کسی کام کی غرض سے چھت پر گئی جہاں صفیہ موبائل پر اپنی کسی سہیلی سے بات کرتے استہزائیہ ہنسی۔
"تمنا! میں اس دور میں برص کی مریض کی مانند کسی عیسیٰ کا انتظار کروں جو آکر ہاتھ پھیرے گا تو میرا کوڑھ زدہ وجود ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر اس نے شادی بھی کر رکھی ہے تو بھی مجھے دوسری بیوی بننے پر اعتراض نہیں ہے۔ میرے جیسی لڑکی کے لیے کوہ قاف کا شہزادہ تو نہیں آئے گا جس کا باپ بھی نہ ہو جس کی ماں نے اسی گھر کو تباہ کیا جس نے اسے سہارا دیا۔"
سونیا کا دل نجانے کیوں بھر آگیا تھا۔ وہ جلدی سے نیچے چلی آئی اور ان ہی دنوں انکل زبیر نے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے عطیہ اور سونیا کا رشتہ مانگا تھا۔ سکینہ خاتون نے سوچنے کے لیے مہلت طلب کی تھی اور تب ہی بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچی تھی۔
اس نے عبدالغنی صاحب سے آگے پڑھنے کی اجازت طلب کی تھی اور انہوں نے خاموشی سے اسے اجازت دے دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھی کہ اب وہ

آگے پڑھ پائے گی۔ اس نے کسی کو بھی بتائے بغیر باہر سے گجرات یونیورسٹی کا پراسپکٹس منگوا لیا تھا اور فوراً ہی فارم پر کر کے جمع بھی کرا دیے تھے۔
اس کا ایڈمیشن ہو گیا تو اس نے سارے گھر والوں کو مطلع کیا تھا۔ سکینہ خاتون نے اسے آڑے ہاتھوں لیتے اس سے وہ لتے لیے کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی۔
"اماں! میری ایک بات مانیں گی؟" ماں کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتے اس نے بڑی لجاجت سے کہا تو سکینہ خاتون کا ماتھا ٹھنکا۔
"اماں! انکل زبیر نے جو آصف' عاطف کے رشتہ کے لیے کہا ہے آپ میرے اور عطیہ کی جگہ وہی رشتہ صفیہ اور ثوبیہ کے لیے طے کر دیں۔" سکینہ خاتون نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔
"دماغ جگہ پر ہے تمہارا؟"
"اماں میری بات آرام سے سنیں۔ ارباب بھائی اور صفیہ کا کوئی میچ نہیں ہے۔ جو شخص اپنے ماں باپ کا نہ ہو سکا وہ صفیہ سے کیا وفا کرے گا۔ اماں! اگر آپ اپنی بہو بنانا ہی چاہتی ہیں تو کنول کے بارے میں سوچیں۔ بابر اسے پسند کرتا ہے۔"
سکینہ خاتون تو حیرت سے منہ کھولے اس کی صورت ہی تکتی رہ گئیں۔
"اماں آپ کہتی ہیں نا کہ آپ اس گھر کی کسی بچی میں تفریق نہیں کرتیں تو اسے ثابت کریں۔ میری فکر مت کریں اماں۔ میں ابھی مزید پڑھنے جا رہی ہوں۔ دو سال تک آپ میرے بارے میں اس موضوع کو ایک طرف رکھ دیں۔ جہاں تک عطیہ کا تعلق ہے تو اس کی بھی آپ فکر مت کریں۔ چاچی کچھ عرصے تک خود آپ سے اس کے لیے بات کریں گی۔"
ان پر حیرتوں کے پہاڑ ہی ٹوٹ رہے تھے۔ وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ اسے کس نے بتایا یہ سب۔
"اماں! ہم سب ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ کس کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ بابر کے لیے کنول کا ہی سوچیں اور عطیہ کی آپ کو کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ کا چہیتا لاڈلا پہلے سے ہی آپ کو ساسو ماں بنا بیٹھا ہے۔" وہ ہنس دی تو سکینہ خاتون کو بھی احساس ہوا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہیں۔ سب کچھ سچ ہے۔

"اماں! بس آپ ان رشتوں کے لیے صفیہ اور ثوبیہ کے آپشن سامنے رکھ دیں۔ انکل زبیر کو تو بس اسی گھر سے رشتہ جوڑنے میں دلچسپی ہے نا۔ میں اور عطیہ نہ سہی صفیہ اور ثوبیہ ہی سہی۔ میری پیاری اماں پلیز۔" وہ پھر سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالے بڑے لاڈ سے بولی تو وہ اس کا ماتھا چوم کر نم آنکھوں سے گویا ہوئیں۔

"ایک ماں کے لیے اس کے بچوں کی خوشی سب سے مقدم ہے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" سونیا خوشی سے ان کے گلے سے جھول گئی تھی۔

اگلی صبح جاتے ہوئے سب ایک لائن میں اس سے گلے لگ لگ کر رو رہی تھیں۔ گویا وہ سات سمندر پار جا رہی ہو۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ سب سے مل کر وہ بوجھل قدموں سے چلتی ان سب کی معیت میں گیٹ تک آئی۔ باہر رکشے میں شمعون اس کا سامان بھر چکا تھا۔ اسے چھوڑنے وہی جا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب اس نے صفیہ سے چلتے ہوئے کہا۔

"صوفی۔۔ میری ایک بات مانو گی؟" صفیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چاچی کو معاف کر کے تم چاروں گھر لے آؤ۔ جب میں اگلے ہفتے گھر لوٹوں تو وہ تم ۔۔۔ سب کے ساتھ، سب کے درمیان اس گھر میں موجود ہوں۔ میں اس گھر کو پہلے کی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز میری خاطر۔ انہیں واپس لے آؤ۔ میں نے انہیں دل سے معاف کیا۔ میرے اللہ نے بھی انہیں معاف کیا۔ کیونکہ وہ بہت رحمان اور رحم فرمانے والا ہے۔"

صفیہ سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ وہ اسی طرح خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی تو سونیا نے بھی مزید کوئی بات نہ کی۔ اسے بہرحال انہیں وقت دینا تھا۔

سارے راستے وہ دل سے اللہ کا شکر ادا کرتی رہی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اپنے تئیں اپنی سب بہنوں کے لیے بہتر راستہ منتخب کر کے آئی تھی۔ اللہ نے اس کے اندر باہر سکون ہی سکون بھر دیا تھا۔

"شمعون۔ کنزیٰ کے لیے کیا سوچا ہے؟" اس نے ساتھ بیٹھے شمعون کو مخاطب کیا جو نیند سے اونگھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔ اس کا کیا سوچنا ہے۔ تائی محمودہ کی طرف سے تو پہلے ہی "ہاں" تھی۔ اس وقت میں نے اور بابا جی نے تحمل مندی سے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں انکار نہ کیا جائے ہو سکتا ہے، کنزیٰ کچھ وقت لے اور پھر سنبھل جائے۔ لہٰذا ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ حتمی فیصلہ ہم اس کا رزلٹ آنے کے بعد کریں گے۔ اب اگلے ویک اینڈ پر انہیں بھی بلایا ہے۔" وہ خوش ہو گئی تھی۔

شمعون سوچنے لگا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو دوسروں کی خوشی میں خوش ہے۔ اس سے چھوٹی بڑی گھر میں سب ہی لڑکیوں کے رشتے طے ہونے جا رہے ہیں۔

جبکہ سونیا سوچ رہی تھی کہ اس کی بہن کس قدر خوش قسمت ہے جسے اتنا پیارا دل رکھنے والا مخلص انسان ملا ہے۔ وہ اس کا بھائی نہ ہو کر بھی سگے بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ اس نے دل میں دعا کی کہ اللہ ایسا بیٹا، ایسا بھائی سب کو دے۔

☼ ☼ ☼
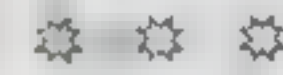
وہ پورے ہفتے بعد گھر لوٹی تھی۔ گیٹ فرحت بہار نے ہی کھولا تھا وہ جھٹ سے ان کے گلے لگ گئی۔ چار ماہ کا بن باس کاٹ کر وہ گھر لوٹی تھیں۔ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دونوں نے صاف کرتے ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کیا۔ گھر پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ آج اس گھر میں تین، تین لڑکیوں منگنی کی رسم ہونے جا رہی تھیں۔

صفیہ، کنزیٰ اور ثوبیہ کی۔ باقی دو جوڑے تو گھر کے ہی تھے۔ انہیں ابھی اس رسم میں باقاعدہ نہیں باندھا گیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے ان دونوں جوڑوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے اب جو رنگ دکھ رہے تھے

پہلے کبھی نہ دکھے تھے۔ ہر چہرہ ہی کھل رہا تھا۔ تینوں لڑکیوں پر بے پناہ روپ آیا تھا۔

منگنی کی رسم ختم ہونے کے بعد رات گئے سب اپنے بستروں پر تھک ہار کر لیٹے تو وہ وضو کر کے نماز پڑھنے اٹھی۔ برآمدے میں ٹھنڈی ہوا لگنے کے باعث بڑا سکون سا تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اس نے سوچا تھا کہ آج اس کی زندگی میں کتنا سکون بھر دیا ہے اس کے رب نے۔ اللہ نے اسے نوازا تھا آرام سے، سکون سے اور سب سے بڑی بات ایمان سے۔ آج اس کے گھر میں سب خوش تھے۔ جس میں اس کا بلاشبہ بڑا کردار تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اس کے نامہ اعمال میں چند نیکیوں کا اضافہ بھی نہ ہوتا۔ بعض اوقات انسان ہی انسان کی تباہی کا باعث بنتا ہے اور انسان ہی انسان کی ہدایت کا باعث بنتا ہے۔ مگر بلاشبہ کوئی غم یا تکلیف انسان کی زندگی میں اللہ کے اذن کے بغیر نہیں آتی۔ ضرورت صرف ایسے میں صبر کرنے اور شکر کیے جانے کی ہے۔

سکینہ خاتون نے بھی یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ان کا بڑا بیٹا تو بہت سال پہلے ہی لاہور شہر نکل گیا تھا۔ اس کا لوٹنا تو مفاد کی غرض سے تھا۔ جب وہ پورا نہ ہوا تو اب وہ شاید ہی کبھی شکل دکھائے۔ مگر بدلے میں اللہ نے انہیں شمعون کی شکل میں داماد دیا جو بیٹوں سے بڑھ کر تھا۔

اس کی سب بہنیں اندر بیٹھی ایک دوسرے کو چھیڑتی اپنے اپنے ہونے والے جیون ساتھیوں کو فرحت اشتیاق کے ناول کا ہیرو ہی ٹھہرا رہی تھیں۔ ہر ایک کے لیے اس کی زندگی کے ڈرامے میں اس کا لائف پارٹنر ہیرو ہی ہوتا ہے۔

شمعون اور بابر اپنی اپنی خواہش پورا ہونے پر بے حد خوش اور شوخ جملوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ فرحت بہار شرمندہ تھیں۔ انہوں نے ذرا سا انتظار کیا ہوتا تو اس شرمندگی کی نوبت ہی کیوں آتی۔

وہ جائے نماز لپیٹ کر وہیں باہر سیڑھیوں پر بیٹھی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک بہت گہرا اور عجیب رشتہ سا بن گیا تھا اس کا رب سے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اسے بس بے اختیار یہی احساس ہوتا تھا کہ اللہ اس کے بہت قریب ہے اور وہ اللہ کے لیے بہت خاص ہے۔ مگر اس احساس میں فخر و غرور کا عنصر نہیں عاجزی کا عنصر تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی کہ اسے پھر سے اپنے کمرے میں ان سب کے درمیان ویسی ہی پیار بھری محفل سجانا تھی جو پہلے سجتی تھی۔ عطیہ کے قریب بیٹھتے سرگوشی کرتے اس نے ذہن میں کب سے الڈتے ایک سوال کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

"مجھے ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا کہ چاچی نے کنزیٰ اور مجھے تو نشانہ بنایا، مگر تم کیسے بچ گئیں؟" عطیہ نے اسے گھور کر دیکھا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"شاید اس لیے کہ میں ہمیشہ کعب اخبار کے ان کلمات کو روز دہراتی ہوں جن کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں پابندی سے یہ چند کلمات ادا نہ کرتا تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے اور وہ کلمات یہ ہیں کہ میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں، جس سے بڑا کوئی نہیں اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام کلمات کی جس سے کوئی نیک اور بد انسان آگے نہیں نکل سکتا اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسماء حسنہ کی جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو میں نہیں جانتا ہر اس چیز کے اثر سے جس کو اللہ نے پیدا کیا اور وجود دیا اور پھیلا دیا۔"

سونیا نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ "ہر وہم، خوف، فکر سے بچنے کے لیے یہ دعا ہی کرتی ہوں اس یقین سے کہ اللہ مجھے محفوظ رکھے۔"

وہ پھر سے باقی سب کے ساتھ گفتگو میں محو ہو گئی اور اس کے لیے ایک نیا در وا کر گئی کہ کلام اللہ، دعا کوئی سی ہو شفا ہی دیتی ہے۔ بشرطیکہ یقین مضبوط اور اللہ کی ذات پر توکل مکمل ہو۔ وہ ہولے سے مسکرا کر صفیہ کے کندھے پر سر رکھتی سب کی باتوں میں شامل ہو گئی۔ زندگی پھر سے ان کے درمیان مسکرا رہی تھی۔

عظمیٰ افتخار

"اف۔۔۔ آج بھی ناکامی۔" ارجمند نے شانوں سے چادر اتار کر وجود سے الگ کی اور صوفے پر ڈھے سی گئیں۔ کاشان نے کچن کے دروازے سے ماں کو دیکھا اور پھر گھڑی کی سمت ذرا کی ذرا نظر کی۔ گھڑی رات کے آٹھ بجا رہی تھی۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے یخ پانی کی بوتل نکالی۔ پانی گلاس میں انڈیلا اور کچن سے باہر چلا آیا۔

"آپ اپنی کوشش ترک کیوں نہیں کر دیتیں اماں!" کاشان نے پانی کا گلاس ماں کی طرف بڑھایا۔ ارجمند نے ایک تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گلاس تھاما۔ کاشان نے آگے بڑھ کر پنکھے کی رفتار تیز کر دی۔

"آپ جانتی ہیں۔ مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ہیں، نمل ہے اور مہ جبیں کی یاد۔ یہ سب کافی ہیں میرے لیے۔" وہ ان کے پاس چلا آیا اور خالی گلاس ان کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو شانی! میں صرف تمہارے لیے لڑکی نہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں نمل کے لیے ایک ماں بھی ڈھونڈ رہی ہوں۔ ایک اچھی ماں۔" وہ صوفے پر پڑی چادر تہ کرنے لگیں۔

ٹھنڈے پانی کے ایک گلاس نے ہی ان کے اندر جیسے ٹھنڈک سی اتار دی تھی۔ عجیب مزاج ہوتا ہے پانی کا بھی۔ جس برتن میں بھی ڈالو۔ وہ ہی مزاج اپنا لیتا ہے۔ وہ بھی تو ایک ایسی ہی لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ مزاج شناس، جو نمل کے لیے واقعی ماں ثابت ہو۔ وہ کاشان کو کیا بتاتیں۔ ان کے دل کے اندر ایک گانٹھ بندھی ہوئی ہے۔ بہت پرانی گانٹھ۔ جو انہیں آج بھی بہت چبھتی ہے اور تکلیف دیتی ہے۔

"پھر تو آپ کو ہمیشہ ہی ناکامی ہوگی اماں۔ کیونکہ کوئی بھی عورت کسی اور کے بچے کے لیے ایک اچھی ماں ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی اور آپ کے سوالات بھی تو عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ میں تو ایک بار ہی آپ کے ساتھ جا کر پچھتایا ہوں۔"

"اگر آپ کے شوہر کی اولاد آپ کو ماں قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو آپ کیا کریں گی؟ اس بچے کو کیسے ہینڈل کریں گی۔۔۔ شادی کے بعد جب آپ کی اولاد ہو جائے گی تو آپ اپنے شوہر کی پہلی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔۔۔ کیا اس کے لیے ہمیشہ ایک کیئرنگ ماں بنی رہیں گی یا اپنی اولاد کو اس بچے پر فوقیت دیں گی۔۔۔ اب آپ خود ہی بتائیں ایسے سوالات پر سامنے والے کا کیا ری ایکشن ہوگا۔ لڑکی کم، لڑکی کے ماں، باپ آپ کو عجیب طریقے سے دیکھتے ہیں۔"

کاشان ماں کے انداز کی نقل اتارتا ہوا نہیں جتاتا ہوا کچن کی طرف واپس چلا گیا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیں۔ شانی کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک پلیٹ میں کباب اور کھیرے کے قتلے سجائے دوبارہ ماں کے سامنے موجود تھا۔

"شانی! میں ان چار مہینوں میں اب تک جن گھروں میں بھی گئی ہوں، ایک میچ میکر کے ریفرنس سے گئی ہوں اور میچ میکر کو میں ہر بات اچھی طرح بتا چکی ہوں کہ میں اپنے بیٹے کے لیے کوئی حور پری نہیں ڈھونڈ رہی۔ ایک پڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی یا عورت ڈھونڈ رہی ہوں، جو نمل کو ایک سگی ماں کی طرح ٹریٹ کر سکے۔ بس اسی لیے میرے سوالات اس نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ میں کسی کو بھی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔"

"مگر اس سب کی کیا ضرورت ہے اماں! جب آپ کی صورت میں نمل کے لیے ایک اچھی گارجین موجود ہے۔"

اس نے بات کرتے ہوئے کباب کا ایک ٹکڑا کھیرے کے قتلے کے ساتھ کانٹے میں پھنسایا اور ماں کی طرف بڑھایا۔ ارجمند نے مسکرا کر اپنے لاڈلے بیٹے کی محبت کو محسوس کیا اور منہ کھول دیا۔ ایک، دو منٹ تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ وہ ماں کو چھوٹے چھوٹے کباب کے ٹکڑے دیتا رہا۔ پھر ارجمند نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی تھیں۔

"ضرورت ہے شانی! نمل کو ماں کی ضرورت ہے دادی کی نہیں۔ آج بھی اسکول سے فون آیا تھا کہ وہ وین میں نہیں آنا چاہ رہی۔ رو رہی ہے۔ ضد باندھ لی ہے کہ دادی کو بلائیں۔ مجھے کالج کی میٹنگ ملتوی کر کے بھاگم بھاگ اس کے اسکول جانا پڑا۔ تب تک وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے وین میں گھر نہیں آنا۔ حالانکہ میں نے نمل کو راستے میں ہی بہلا لیا تھا۔ ایک ریسٹورنٹ سے اسے برگر اور جوس دلایا۔ پھر آتے ہوئے اسما کو ساتھ لیتی آئی کہ جب تک تم آفس سے آؤ، وہ نمل کا خیال رکھے کیونکہ مجھے مسز انصاری کے ساتھ لڑکی دیکھنے بھی جانا تھا۔ اسما کے ساتھ نمل بہل بھی گئی مگر میں دوپہر سے اب تک ڈسٹرب ہوں۔ وین والا اس وقت جا چکا تھا۔

ورنہ میں اس سے ضرور پوچھتی کہ نمل ہر دو سرے' تیسرے دن وین سے گھر نہ آنے کی ضد کیوں کرتی ہے؟"

کاشان پلیٹ سینٹر ٹیبل پر رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ماں کے پاس آگیا اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"او میری پیاری ماں! آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ نمل کون سی بڑی ہے۔ پانچ سال کی بچی ہی تو ہے۔ بس ضد میں آگئی ہوگی یا ہو سکتا ہے کوئی بچہ اسے وین میں ڈسٹرب کرتا ہو۔ میں خود وین والے سے بات کرلوں گا۔ پلیز آپ اس سے کچھ مت کہیے گا۔ ورنہ آپ کا نفسیات میں ڈبل ایم اے ہونا بے چارے کو پاگل ہی کردے گا۔"

ارجمند کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ بھول گئیں کہ دوپہر سے اب تک وہ گانٹھ آج پھر انہیں کتنی چبھ رہی تھی۔

"میرا نفسیات میں ایم اے ہونا خالی نہیں خوبی ہے مائی ڈیر! اور میری اس خوبی کے تمہارے ابو بھی مداح تھے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔"

"جی بالکل! یہ سارا کیا دھرا ابو جی کا ہی تو ہے۔ آپ خود ہی تو بتاتی ہیں کہ آپ تو سیدھا سادہ بی اے کرنے کے بعد ایک اسکول میں پڑھایا کرتی تھیں۔ پھر ابو جی نے ہی آپ کو نفسیات میں ایم اے کرنے کا کہا تھا۔" وہ پھر سے ماں کی نقل اتارنے لگا۔ اور ارجمند قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں اور اس کے سر پر چپت لگا کر بولیں۔

"تم نہیں سدھرو گے۔ یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے اور یہ نمل کہاں ہے سو گئی کیا؟"

"جی نمل کھانا کھا کر سو چکی ہے اور آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے پلاؤ دم دے دیا ہے۔ بس پندرہ منٹ بعد آپ ڈائننگ ٹیبل پر آجایئے گا۔"

ارجمند نے بے ساختہ ہی آگے بڑھ کر اس کی بلائیں لے لیں۔

"واہ۔ بیٹا ہو تو ایسا۔"

جواباً اس نے اپنے نادیدہ کالر فخر سے کھڑکھڑائے تھے۔

☆ ☆ ☆

موسم بدل رہا تھا پر سورج کی تپش میں کوئی خاص کمی نہ آئی تھی۔ گو کہ سورج خاصا ڈھل چکا تھا۔ مگر کول تار کی لمبی سڑک دھوپ سے جل کر تپ سی گئی تھی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پیر جوتے کے اندر سے بھی سڑک کی تپش کو سہ رہے تھے۔

وجہ گھر لوٹنے کی جلدی نہ تھی۔ گھر میں ایک ماں کے سوا تھا ہی کون اور ماں کو اس کے آنے کا بھی انتظار بھی نہ رہا تھا۔ انتظار اگر تھا تو بس جلد سے جلد اسے رخصت کرنے کا تھا۔ وہ ڈبل شفٹ میں ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ آتے آتے بھی ساڑھے پانچ اور بھی چھ بج جاتے تھے۔

اس کے قدموں میں تیزی کی وجہ وہ منظر تھا جس نے اس کے اندر جالی سی بھر دی تھی۔

ایک مرد مکان کے ساتھ بنے اونچے سے چبوترے پر بیٹھا اپنے برابر میں بیٹھی بچی کے برہنہ بازو پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ہاتھ انگلیوں سے حرکت کرتا اس کے کندھے تک پہنچتا اور کندھے سے واپس انگلیوں تک آتا۔ جبکہ اس مرد کا دوسرا ہاتھ بچی کے گرد گھیرا تنگ کیے ہوئے تھا۔ گھیرا کبھی سکڑتا اور کبھی پھیلتا۔ وہ بچی شاید چار یا پانچ سال کی تھی مگر اٹھان اچھی ہونے کے باعث اپنی عمر سے ایک آدھ سال بڑی ہی لگ رہی تھی۔ وہ ابھی شاید لمس کی زبان سے ناآشنا تھی اور زبان کے ذائقے سے بھی شاید پوری طرح روشناس نہیں ہوئی تھی۔ جھوٹی مٹھاس لیے ٹافیوں کے پیکٹ سے بہل جانے والی۔ ابھی بھی مزے سے لالی پاپ چوس رہی تھی۔

وہ چیل کی طرح جھپٹی اور بچی کو اس شخص سے علیحدہ کرلیا۔

"کون ہو تم؟ بتاؤ کیا رشتہ ہے اس بچی سے تمہارا۔" غرّایا ہوا لہجہ' سامنے بیٹھے اجنبی کو بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہونے پر مجبور کرگیا تھا۔

"میں۔ میں۔ وہ۔" وہ تھوک نگلنے لگا۔

ندا نے جھک کر چبوترے کے پاس کھڑی بچی کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا کون ہیں یہ؟"

"انکل ہیں۔ پاپا کے دوست۔" بچی کی ساری توجہ ابھی بھی لالی پاپ کی مٹھاس میں تھی۔

"تو پاپا کہاں ہیں؟" ندا نے اس آدمی کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بچی سے دوبارہ پوچھا۔

"پاپا تو۔ اپنا موبائل اندر سے لینے گئے ہیں۔"

"چلو۔ میرے ساتھ۔" اس نے بچی کو بازو سے پکڑا اور ساتھ لیے نیم وا دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ اندر' سامنے کوئی نہ تھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر ہاتھ مارنے لگی۔ کاشان تولیے سے ہاتھ صاف کرتا باہر آیا۔

"جی آپ کون؟" کاشان حیران سا تھا۔ آنے والی کا چہرہ اس کے لیے اجنبی تھا۔

"باہر گلی میں کوئی بچہ نہیں ہے اور آپ نے اس بچی کو باہر بھیج دیا' سنبھالیں اسے۔" ندا کا لہجہ درشت تھا۔

"ایک منٹ۔ ایک منٹ خاتون! آپ کو لگتا ہے کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔"

پھر وہ تولیہ سائیڈ میں رکھی کرسی پر ڈال کر بچی سے پوچھنے لگا۔ "کیا ہوا نمل بیٹا! آپ تو شیراز انکل کے ساتھ تھیں نا۔ میں تو بس دو منٹ کے لیے ہی اندر آیا تھا۔ موبائل کو چارج پر لگانے کے لیے۔ اس کی بیٹری لو تھی نا۔ پھر گرمی لگی تو منہ دھونے چلا گیا۔" نمل سے بات کرتے ہوئے کاشان نے اسے گود میں اٹھالیا۔

"جی پاپا۔" نمل کہہ کر پھر سے لالی پاپ چوسنے لگی۔

"ہونہہ۔ رہزن کو رہبر بنا کر آئے تھے آپ۔ موبائل کو چارج پر لگانے کی فکر زیادہ تھی بچی سے۔ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا۔ صرف انسان کا سگا خون ہی اس کا اپنا ہوتا ہے۔ سمجھے آپ؟"

ندا کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑی تو ٹھٹک سی گئی۔ کارنس پر ایک شادی شدہ جوڑے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر فریم میں مقید تھی۔

"مس ارجمند۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

تیس سالہ لڑکی کے اندر سے ایک گیارہ سال کی بچی جیسے نکل کر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کمرے کی چوکھٹ پار کرگئی۔ کاشان وہیں سناٹے میں گھرا رہ گیا۔ آنے والی کیا کہہ کر جا چکی تھی۔ وہ ششدر تھا۔ شیراز' نمل کے ساتھ!

اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ باہر جا کر شیراز کی موجودگی کا یقین کرتا یا اس سے سوال جواب کرتا۔ کیا ایک بیٹی کا باپ اپنے دوست سے یہ سوال کرسکتا تھا؟

ندا کے لیے آج انکشافات کا دن تھا۔ مرکزی دروازے سے نکلتے ہوئے وہ دوسری بار ٹھٹکی تھی۔ جس ٹیچر کی تصویر وہ اندر دیکھ کر آئی تھی۔ وہ ہاتھ میں سودا سلف کے شاپرز لیے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ کیسے انہیں بھولتی۔ اس کے پاس خوش گوار یادوں کا خزانہ نہیں تھا' بس چند یادیں تھیں۔ اسکول کا پہلا دن' اردو کی ٹیچر مس ارجمند اور اس کی کتابیں یا پرانے گھر میں چھت پر بنا اسٹور' جہاں اس کی ایک فرضی مگر اپنی دنیا آباد تھی۔

"آپ۔ آپ مس ارجمند ہیں نا۔" ندا کی زبان لڑکھڑائی تھی اور آنکھیں جھلمل سی ہونے لگی تھیں۔

"تم کون ہو بیٹا! میں پہچان نہیں پائی۔" ارجمند نے شفقت سے پوچھا۔ لڑکی انتیس' تیس برس کے درمیان میں تھی مگر چہرے پر ہنوز معصومیت تھی۔

"مجھے اکثر لوگ بھول جاتے ہیں۔ میں ندا رحمان

ہوں۔ اچھا ہوا آپ بھی مجھے بھول گئیں۔ جن کے دماغ میں خلل ہو۔ انہیں کوئی یاد نہیں رکھتا۔"

وہ یک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے کہتی ہی چلی گئی۔ بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا سی گئی تھی اور مزید کھڑے رہنے کی اس میں ہمت بھی نہ تھی۔

"ندا۔ ندا رحمان۔" وہ لڑکی کے تیزی سے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھ رہی تھیں۔ ماتھے پر رگ ابھر آئی تھی اور اندر موجود گانٹھ یک دم ہی چبھنے لگی تھی۔ وہ سرعت سے گیٹ پار کر گئی۔

✿ ✿ ✿

اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھا تو اس وقت تک ہٹایا جب تک کہ دروازہ کھل نہ گیا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے دروازہ کھولا۔ ندا تیزی سے اندر آئی۔ صحن میں رکھے تخت پر پرس اور دوپٹا رکھا اور واش بیسن کا نل کھول کر تیزی سے منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔ چہرے پر ابھی تک سرخی تھی۔

"ہم اس گھر کے مالک مکان نہیں ہیں کرائے دار ہیں، آئی سمجھ! بیل پر ہاتھ رکھتی ہو تو ہٹانا ہی بھول جاتی ہو۔ خیر سے اچھا گھر مل گیا ہے تو شکر مانو۔ مجھ بوڑھی کی ہڈیوں میں اتنا دم ختم نہیں کہ تمہارے ساتھ محلہ محلہ گھومتی پھروں۔"

خدیجہ بیگم اسے باتیں سنا کر چلی گئی تھیں۔ وہ ہنوز منہ پر چھپاکے مارے گئی۔ مگر پانی کی ٹھنڈک بھی اس کے اندر کی تپش کو کم نہیں کر سکی۔ تھوڑی دیر پہلے والا منظر پھر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگا تھا۔ ایک ہاتھ، انگلیوں سے حرکت کرتا کندھے تک اور کندھے سے واپس انگلیوں تک سفر کرتا اور دوسرا ہاتھ... کبھی سکڑتا، کبھی پھیلتا گھیرا۔

اس نے ایک گہری سانس لی، نل بند کیا تخت پر سے چادر اور دوپٹا اٹھایا اور اپنے کمرے میں آ کر چپ چاپ لیٹ گئی اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"کیا بات ہے۔ کھانا نہیں کھانا، یہاں کیوں آ کر لیٹ گئی ہو؟" خدیجہ بیگم تھوڑی دیر بعد پھر اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"کیوں بھوک نہیں ہے۔ کیا پھر کسی سے جھگڑا کر کے آئی ہو؟" انہوں نے جرح کی۔

"نہیں...." ندا کا قطعیت بھرا جواب آیا۔

"جھوٹ مت بولو ندا!"

"آپ کی اتنی نظر نہیں ہے اماں! کہ آپ میرے جھوٹ اور سچ کو پرکھ سکیں۔" وہ بازو آنکھوں پر سے ہٹا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انداز دھیما تھا مگر خدیجہ بیگم کو تیر کی طرح لگا تھا۔

"تم... تم ماں سے زبان چلا رہی ہو۔" وہ غصے میں آ گئیں۔

"میں آپ سے زبان نہیں چلا رہی۔ بس ایک بات کہہ رہی ہوں۔ میں نے کسی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا۔ بس گھر واپس آتے ہوئے ایک بچی کے ساتھ ایک شخص کو غلط کرتے دیکھا تو چپ نہ رہ سکی۔"

خدیجہ بیگم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ندا... ندا... خدا کے لیے یہ حرکتیں چھوڑ دے۔ عمر گزر گئی، مگر کیا خناس تیرے دماغ میں بھرا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تیرے بھائی بہن تجھ سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ باپ سر پر موجود نہیں۔ پرانے محلے میں بھی تجھے سب نفسیاتی مریض اور پاگل سمجھنے لگے تھے۔ کوئی بھولا بھٹکا رشتہ بھی نہیں آتا تیرے لیے۔ خاندان بھر میں کتنے ہی گھر تھے۔ مگر کسی کو تیری خوب صورتی نہیں بھائی۔ سب کو یہی لگتا ہے کہ تجھ میں دماغی خلل ہے۔ خدا خدا کر کے موحد نے یہ گھر مناسب کرائے پر دلوایا ہے۔ خود بھی سکون سے رہ اور مجھے بھی رہنے دے۔ تاکہ کوئی مناسب بر جلد سے جلد ملے تو تیرے ہاتھ پیلے کروں اور میں بھی کسی بیٹے کے پاس جا کر سکون کا سانس لوں۔ ہونہہ... سب کی خدائی فوجدار بنی پھرتی ہے۔" خدیجہ بیگم اسے بے نقط سنا کر چلی گئیں۔

وہ آنسو ندا کی آنکھوں سے نکلے اور گالوں پر بہتے

ہوئے تکیے میں جذب ہوگئے۔ وہ کھلے دروازے کو تکتی رہی۔ جہاں سے اس کی ماں ابھی گئی تھی اور پھر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ آنسوؤں میں اب روانی آگئی تھی۔ اس نے انھیں بہنے دیا۔

☼ ☼ ☼

"عجیب نفسیاتی مزاج کی لڑکی تھی۔ آندھی طوفان کی طرح ثمل کو لیے اندر آئی اور بے نقط سنا کر چلی گئی۔ خدا جانے کیا کچھ بکواس کرکے چلی گئی۔ ابھی تک سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ واٹ ربش!" کاشان سخت جھنجلایا ہوا تھا اور کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ ارجمند نے ایک نظر دوسرے کمرے میں پزل سے کھیلتی ثمل پر ڈالی اور دوسری نظر کاشان کے چہرے پر۔

"کیوں آئی تھی ندا اور ایسا کیا کہہ کر چلی گئی؟" ان کی آواز بظاہر بے تاثر تھی مگر اندر ایک اضطراب تھا۔

"آپ۔ آپ جانتی ہیں اسے۔ کیسے؟" کاشان حیرت زدہ تھا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں شانی! میں نے پوچھا کیوں آئی تھی وہ؟"

"وہ۔" کاشان کی زبان لڑکھڑائی۔ جو بول کر وہ گئی تھی کیا وہ ساری باتیں ماں سے کہہ دے۔

"بولو شانی! چپ کیوں ہو؟ مجھے الجھن ہو رہی ہے' کیا ہوا ہے؟" ارجمند کی پریشانی ان کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

"وہ کہہ رہی تھی کہ شیراز۔ ثمل کے ساتھ مس بی ہیو کر رہا تھا۔" اٹکتے اٹکتے من و عن وہ سب کچھ کہتا چلا گیا۔

ارجمند کو یوں لگنے لگا کہ جیسے ایک ٹرین ہے جو تیزی سے ان کے اوپر سے گزرتی جارہی ہے۔ اندر بندھی گانٹھ اب زیادہ چبھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات تیزی سے بیتی جارہی تھی مگر ارجمند کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ان کے ہاتھوں میں "ہیپی مدرز ڈے" کے موقع پر لکھا ایک مضمون دبا ہوا تھا۔ لفظوں کی سیاہی جگہ جگہ سے پھیل گئی تھی۔ کچھ لفظ مٹ بھی گئے تھے مگر وہ مضمون آج بھی انہیں ازبر تھا۔

"میری ماں۔" جو ایک پانچویں جماعت کی گیارہ سال کی بچی نے لکھا تھا۔ "جس کا نام تھا ندا رحمان۔"

اس مضمون نے ان کے اندر ایسی گانٹھ باندھ دی تھی کہ نفسیات کے مضمون میں ڈبل ایم اے کرنے کے باوجود نہ کھلی تھی۔

انہیں لگا جیسے ندا اور ثمل ایک ہی روپ کے دو نام ہو۔ ان کے کانوں میں ثمل کی پرنسپل کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انہوں نے ندا سے کل ہونے والی سرسری ملاقات کے بعد بہت دیر تک ثمل کے بارے میں سوچا تھا اور اس کی پرنسپل سے شیئر کیا تھا۔

"مسز ارجمند حسین! میرا خیال ہے کہ ثمل کو وین ڈرائیور پسند نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ثمل کو اسکول سے گھر ڈراپ کرنے کے لیے کوئی اور وین ہائر کرلیں یا پھر آپ جس طرح صبح اسے اسکول ڈراپ کرتی ہیں۔ پک کرنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی اٹھالیں۔" پرنسپل کے انداز میں جھجک تھی۔ وہ مزید کہنے لگیں۔

"آپ خود سوچیں۔ وہ بچی جو اسکول میں پورا دن اچھے طریقے سے رہے۔ جو گھر میں بھی اچھے طریقے سے رہے۔ اسے صرف چھٹی کے وقت ہی وین کا ہارن سن کر ایسا کیا مسئلہ ہو جاتا ہے کہ وہ بری طرح رونا شروع کر دیتی ہے۔ وین میں بڑے بچے اور بچیاں اکثر پیچھے بیٹھتے ہیں اور ڈرائیور رش کی وجہ سے چھوٹے بچوں اور بچیوں کو اپنے برابر والی سیٹ پر بٹھا لیتے ہیں۔"

"آپ۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" پرنسپل کی جھجک اور بھی بڑھ گئی تھی اور اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسز ارجمند حسین جم سی گئی تھیں۔ ان کی بچی پر کیا گزرتی رہی ہے۔ انہیں پتا ہی نہ چلا۔ وہ

تکلیف محسوس تو کرتی تھی مگر اظہار صرف رونے کی حد تک کر پاتی تھی اور وہ اور کاشان سمجھتے رہے کہ وہ توجہ کی متلاشی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک متوسط طبقے کی فرد تھی۔ تین بڑی بہنوں اور دو بھائیوں کے بعد چھٹے نمبر پر دنیا میں آنے والی ندا رحمان۔ اس تک آتے آتے ماں' باپ دونوں کی محبت کم ہو چکی تھی۔ سب سے چھوٹا بچہ یا تو بہت محبت سمیٹتا ہے یا پھر نظرانداز ہو جاتا ہے۔ وہ ان دونوں طرح کے احساسات کے درمیان ہی پل کر بڑی ہوئی تھی۔ اس کے اور باقی بہن' بھائیوں کے درمیان عمر کا فرق تھا۔ صنوبر' صبا' کاشفہ' موحد اور سعود کے بعد اس کا نمبر آتا تھا۔ سعود سے وہ چار سال چھوٹی تھی اور جب وہ دس سال کی ہوئی' تب صنوبر کی شادی ہو چکی تھی اور ایک سال بعد وہ صنوبر کے بچے کو گود میں اٹھائے اٹھائے گھومتی تھی۔ ایسے چھوٹے کتنے ہی ان گنت کام تھے۔ جو اس کے ذمے تھے۔ گھر کے سودا سلف میں کوئی بھی چیز کم پڑتی یا وقت سے پہلے ختم ہو جاتی۔ ماں اسے ہی نکڑ کی دکان پر بھیجا کرتی اور وہ ہمیشہ کنی کتراتی کہ سردار چاچا' چیزیں پکڑاتے پکڑاتے ہاتھ ہی کس کر پکڑ لیتا تھا۔

اوپری منزل کا ایک کمرہ ماموں کے دوست کو اماں نے کرائے پر دیا ہوا تھا۔ دو وقت کا کھانا اور ایک کمرے کا معقول کرایہ انہیں ملتا تھا۔ مگر کھانے کی ٹرے اوپر پہنچاتے ہوئے ندا کے پیر کئی بار لڑکھڑاتے تھے۔ ماموں کے دوست اسے بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ خراب نظروں سے دیکھتے تھے اور ہر جگہ ہاتھ لگاتے تھے۔ صنوبر کے میاں جنہیں وہ اشفاق بھائی' اشفاق بھائی کہتی تھی۔ جب بھی اس کے گھر آتے زور سے اس کا گال کھینچتے تھے۔ انہیں بہت پیاس لگتی تھی اور وہ ہر بار ندا سے ہی پانی منگوایا کرتے تھے۔

اسے پورے دن میں اپنے اسکول کا وقت سب سے اچھا لگتا تھا۔ وہاں ساری ٹیچرز بہت اچھی تھیں اور سب سے پیاری تو مس ارجمند تھیں۔ وہ ہمیشہ پیار سے بولتیں اور دھیمے دھیمے لہجے میں اچھی اور بری بات بتاتی تھیں۔ وہ جب بھی ندا کو مخاطب کرتیں اسے اپنی چیختی چلاتی بات بات پر ہاتھ جڑتی ماں یاد آتی تھی۔ اسکول سے گھر آکر اس کی سب سے پسندیدہ جگہ چھت پر بنا اسٹور ہوتی۔ جہاں اس کی گڑیاں تھیں۔ اس کی کتابیں تھیں۔ وہ ان سے کھیلتے کھیلتے سو جاتی مگر سونے سے پہلے یہ دعا کرنا کبھی نہ بھولتی کہ یا اللہ میاں' ماموں کے دوست غائب ہو جائیں۔ اشفاق بھائی ہمارے گھر کبھی نہ آئیں اور وہ کونے والی دکان کے سردار چاچا ہمیشہ کے لیے بیمار ہو جائیں۔ کیونکہ میری اماں میری کوئی بات نہیں سنتی یا پھر مس ارجمند کو میری امی بنا دے۔"

وہ بہت حساس تھی اور ماں' باپ کی محبت کی متلاشی اور اسی کمی نے اسے وقت سے پہلے اچھے اور برے لمس کی پہچان کرا دی تھی۔ کل مس ارجمند اس کے سامنے آئیں تو سارے برے لمس ڈنک بن کر پھر سے ابھر آئے تھے۔ کل سے آج تک وہ کتنی ہی بار ان کے بارے میں سوچ چکی تھی۔ نیند ساری رات اس کی آنکھوں پر مہربان نہ ہوئی تھی۔ دور کہیں سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ اس نے سونے کا ارادہ ترک کیا اور وضو کرنے چل دی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تمہارے لیے لڑکی تلاش کرلی ہے کاشان!" وہ ناشتے کی ٹیبل پر آکر ہی بیٹھا تھا۔ جب ارجمند نے اسے اطلاع دی۔

"یہ تو معجزہ ہو گیا اماں! کون ہے وہ؟ یقیناً" آپ کو پسند آئی ہے تو اچھی ہی ہوگی۔" کاشان بہت مطمئن انداز میں پراٹھا اور آملیٹ اپنی طرف کرکے کھانا شروع کرنے لگا۔

"ہاں۔ مجھے واقعی پسند آئی ہے۔ ندا نام ہے اس کا۔ ندا رحمان۔"

"جی۔ یہ۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" کاشان کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے ہوئے ہوا میں ہی معلق رہ

گیا۔

"پلیز اماں مجھے صبح صبح اس طرح کا مذاق پسند نہیں۔ وہ ایک مینٹلی ڈسٹرب لڑکی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا ہے نوید صاحب کے نیچے کے پورشن میں ماں بیٹی کو آئے ہوئے۔ آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں اور آپ میری شادی وہاں کرانا چاہتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تمل بغیر ماں کے اور میں بغیر بیوی کے اپنی باقی زندگی گزار لوں۔"

وحید مزا ہو کر نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ چکا تھا۔

"یہ لو۔ یہ پڑھو، پھر تمہیں خود سمجھ میں آجائے گا کہ مجھ سے زیادہ اس لڑکی کو کوئی نہیں جانتا۔"

ارجمند نے ایک کاغذ کاشان کی طرف بڑھایا۔ اس کی نگاہوں میں الجھن سی تھی۔

"پڑھو، پھر تمہیں یقیناً کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔" ارجمند نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھول کر اپنے سامنے کیا۔

"میری ماں۔"

"میں اس پر کیا لکھوں کیونکہ میرے پاس ماں تو ہیں مگر وہ میری نہیں ہیں کیونکہ وہ میری کوئی بات نہیں سمجھ پاتیں۔ وہ صنوبر آپی، صبا بجو اور کاشفہ اپیا کی ماں ہیں۔ وہ موحد بھائی اور سعود بھائی کی ماں ہیں مگر میری نہیں۔ مس ارجمند تو کہتی ہیں کہ اللہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ مگر میں یہ بات کیسے مان لوں جب میں نے ایک ماں کو ہی محبت کرتے نہیں دیکھا۔ میں سردار چاچا کی دکان پر نہیں جانا چاہتی کیونکہ وہ مجھے دکان کے اندر لے جاتے ہیں۔ میں ماموں کے دوست کو کھانا دینے بھی نہیں جانا چاہتی۔ وہ بہت گندے ہیں۔ مجھے سب جگہ ہاتھ لگاتے ہیں۔ میں اشفاق بھائی کو پانی بھی نہیں پلانا چاہتی۔ وہ بہانے بہانے سے میرے گال کھینچتے ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے گود میں بٹھاتے ہیں۔ میں امی کو بتاؤں تو وہ مجھے ہی گندا سمجھتی ہیں۔ میں روتی ہوں تو امی کہتی ہیں کہ منحوس ہے۔ جانے کس پر چلی گئی ہے۔ باپ کی روزی کھاگئی۔ میں امی کو کیسے بتاؤں گندی میں نہیں ہوں۔ میں غلط نہیں سوچتی ہوں۔ گندے یہ سب لوگ ہیں۔ یا اللہ! اگر تو ابھی مدرز ڈے والے دن بچوں کی دعا سنتا ہے تو مس ارجمند کو میری ماں بنادے۔ پلیز۔ پلیز اللہ میاں!"

کاشان نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ وہ ششدر تھا۔

"اماں۔ یہ۔" اس نے کاغذ ان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔

"یہ ندا نے لکھا تھا۔ اسی لڑکی نے جس نے تمل کی تکلیف کو پہچانا۔ اس تکلیف کو جو تم باپ ہو کر اور میں علم نفسیات پڑھانے والی نہیں سمجھ پائے۔ وہ گیارہ سال کی بچی جو آج ایک تیس سال کی لڑکی ہے۔ وہ کسی ذہنی خلجان کا شکار نہیں ہے۔

میں نے بھی تمہاری طرح جب یہ مضمون پڑھا تو میں بھی یونہی شاک رہ گئی تھی۔ پھر میں نے پرنسپل سے کہہ کر ندا کے پیرنٹس کو بلوایا تھا۔ میں انہیں بچی کی تکلیف سے آگاہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ حساس ہے۔ اپنی عمر سے بڑی لگتی ہے۔ اس لیے جلد ہی سب کی نظروں میں آجاتی ہے مگر اندر سے بہت معصوم ہے۔ اس کی معصومیت کو بچائیں مگر بجائے اس کے کہ وہ میری بات سمجھتے، الٹا مجھے اور اسکول کو ملامت کرتے، بچی کو ڈانٹتے ہوئے لے گئے اور پھر کبھی اسکول نہیں بھیجا۔

میں اس واقعے سے اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ وہ اسکول ہی چھوڑ دیا۔ اس واقعے کے بعد ایک گانٹھ سی تھی جو میرے اندر بندھ گئی تھی۔ میں مہینوں بہت ڈپریس رہی مگر چاہ کر بھی یہ مضمون تلف نہ کرسکی۔ اگر تم اور تمہارے ابو جی نہ ہوتے تو شاید میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتی۔ اب تم خود بتاؤ۔ کیا ندا سے بہتر تمل کے لیے کوئی اور ماں ہوسکتی ہے؟"

کاشان نے نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اس نے بے اختیار نفی میں گردن ہلادی۔ ارجمند کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ اس گانٹھ کے کھلنے کا وقت آگیا تھا۔

☆

"ماشاءاللہ میری بہو نے کمال کردیا۔ بیس بندوں کی شاندار دعوت کر کے خاندان کا ریکارڈ توڑ دیا۔ کسی کے گھر اس قدر سلیقہ مند اور سگھڑ بہو نہیں۔ ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں دعوت کا نام سنتے ہی۔ ان کو فیشن اور کپڑوں کے ساتھ جیولری کی میچنگ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"

نسرین بیگم نے فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے متبسم چہرے کے ساتھ ایک ہاتھ عائشہ کے کندھے پر رکھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے مہمانوں پر ایک نظر دوڑائی۔

ساس کی بات سن کر میں ان سب میں خود کو معتبر محسوس کر رہی تھی۔ میں خاموشی سے سر جھکائے سعادت مندی کا تمغہ گلے میں لٹکائے کھڑی تھی۔ ایک دھیمی اور خوش گوار مسکراہٹ میرے لبوں پر بھی تھی اور میں ماضی کی سوچوں میں گم تھی۔

☆ ☆ ☆

"امی! حد کرتی ہیں آپ۔ کسی بات کی نزاکت کا احساس تو جیسے بھلا بیٹھی ہیں۔ گھر میں چار جوان بیٹیاں ہیں اور آپ بے فکر و پرسکون ہیں۔ حیرت ہوتی ہے مجھے۔ ان کی ماں بھی نہیں ہے۔ آپ ان کی تربیت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گا؟"

پھپھو دھیمی آواز میں دادی سے مخاطب تھیں۔ وہ بھی پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔ گرمی کے موسم میں چھت پر کھلے آسمان تلے بچھی چارپائیوں پر لیٹے تمام افراد خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ پھپھو آج رات ہماری طرف رکی تھیں۔ شاید یہی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ اور اب اس وقت ماں بیٹی ساتھ چارپائی جوڑے باتوں میں مصروف تھیں۔ چاند اپنے پورے جوبن کے ساتھ ہر طرف روشنی پھیلا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

"پچھلی دفعہ جب عائشہ ہماری طرف آئی تھی۔ میری طبیعت خراب ہوئی تو میں نے اس سے کھانا بنوایا۔ وہ سالن کھا کر پتا ہے میرے میاں نے کیا کہا؟"

پھپھو کے لہجے میں فکر اور تشویش تھی۔ میں ان کے دائیں پہلو میں لیٹی تھی۔ وہ مجھے سوتا سمجھ رہی تھیں۔

"انہوں نے کہا، عائشہ اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ اسے کھانا تک بنانا نہیں آتا۔"

"اے تو تمہارے میاں کو اس سے کیا۔ اسے بولنے کی کیا ضرورت تھی۔" دادی خفا ہوئیں۔

"اب بی اے پاس لڑکیوں کو بھی اگر گھرداری نہ آئے تو لوگ حیران ہوں گے ہی۔ آخر آپ کب تک انہیں یوں گھٹنے سے لگا کے رکھیں گی۔" غصے اور پریشانی سے کہتے ہوئے پھپھو اٹھ ہی بیٹھیں۔

"بیٹی! میں اور تم کیا کرسکتی ہیں۔ یہ ان کے باپ کی اولین خواہش ہے کہ وہ بیٹیوں کو پڑھائے اور اگلے گھر سدھارے۔" پھپھو کی بات نے دادی کے دل پر بھی اثر کیا تھا۔ وہ بھی فکرمند لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک ہے امی جان۔ پڑھیں۔ کون منع کررہا

حنا بٹ

ہے لیکن گھرداری کی طرف بھی تو توجہ دیں۔ مجھے دشمنی تھوڑی ہے ان سے۔ آخر ہمارا خون ہیں یہ بچیاں۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ یہ بھی میری طرح اپنے گھروں میں سکھ ہی پائیں۔"

ان کا لہجہ کچھ دھیما ہوا۔ واقعی ان کا کہنا بجا تھا۔ سسرال میں دور دور تک ان کی میزبانی، خوش اخلاقی، سگھڑاپے اور گھرداری کے چرچے تھے۔

"ابھی بچیاں ہیں۔۔۔ میں سکھادوں گی کچھ عرصے میں۔" دادی نے پھپھو کو تسلی دی۔

"اگر آپ کی انیس بیس سال کی پوتیاں چھوٹی بچیاں ہیں تو پھر ہماری ندا کا کیا۔ وہ تو بارہ سال کی ہے مگر میری ساس نے ہر روز واویلا مچایا ہوتا ہے کہ رات کا کھانا اس سے بنواؤ۔ وہ ابھی اتنی چھوٹی ہے۔ مگر اپنی عمر سے بڑھ کے کام آتا ہے اسے اور یہ بھی نہیں کہ پڑھتی نہیں۔ اسٹڈی میں بھی اچھے گریڈز آتے ہیں۔" پھپھو کے لہجے میں بیٹی کے لیے فخر تھا۔

"ہونہہ! اچھے گریڈز۔۔۔ "بی گریڈ" بھی کوئی اچھا ہوتا ہے میرا تو اے پلس ہے۔" میں نے آنکھیں موندے حسد سے دل میں کہا۔ میں اس کی تعریف کیسے برداشت کرسکتی تھی۔

"میں نے بات کی تھی رفعت! لیکن ان کے باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر میں خاموش ہوگئی۔ نوکری کریں گی تو کچھ رنگ ڈھنگ اچھے ہو ہی جائیں گے۔ آج کل کا زمانہ یہ ہی تو مانگتا ہے۔" انہوں نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔

"امی جان! نوکری کرنے والیاں کیا سسرال میں معزز ہونے کا سرٹیفکیٹ لے لیتی ہیں۔ میری دیورانی کو ہی لے لیں۔ وہ بھی نوکری کرتی ہے۔ میرے دیور کی خواہش تھی نوکری کرنے والی بیوی سے شادی کرنے کی تو کیا اسے کام نہیں کرنا پڑتا؟ آفس کے بھی کام کرتی ہے۔ واپس آکر پھر شام کا کام ندا کے ساتھ سنبھالتی ہے۔ اپنے خرچے سے نوکرانی بھی رکھی ہوئی ہے۔ مگر ساس پھر نالاں رہتی ہے۔ اور مجھے دیکھیں! گھر بھر کی چہیتی بہو ہوں۔ بس! ساس سسر کا کام وقت پر کرنا ہوتا ہے۔ اب اس طرح کام کرنے کی عادت مجھ میں پہلے سے تھی تب ہی تو مجھے کوئی تنگی نہ ہوئی۔ مگر میری دیورانی کا تو برا حال ہو جاتا ہے۔" پھپھو نے دادی کو مستقبل کے اندیشوں سے ڈرایا۔

"بس کرو رفعت۔ ہم سمجھالیں گے عائشہ کو۔ سمجھ دار بچی ہے۔" دادی کا فقرہ میرے کانوں میں گونجا تھا۔ "اب سوجاؤ۔ تہجد کے لیے بھی اٹھنا ہے۔" دادی نے بے زاری سے کہا اور لیٹ گئیں۔

"بہرحال میں بھائی جان سے اس بارے میں ضرور بات کروں گی۔۔۔ کم از کم انہیں اپنی بڑی بیٹی عائشہ کی شادی کے بارے میں تو سوچنا ہی چاہیے۔" پھپھو بھی بڑبڑاتی ہوئی آخر لیٹ گئیں۔

"یہ کیوں اس قدر فکر مند ہیں ہمارے لیے۔" میں دل میں سوچنے لگی۔ مجھے ان کی باتیں بے انتہا ناگوار گزری تھیں۔ دل انہیں کھری کھری سنانے کو مچل رہا تھا۔ میں غصے سے نڈھال تھی۔ اسی وقت میں نے پختہ فیصلہ کرلیا کہ اب گھرداری میں ایسا سلیقہ لاؤں گی کہ انہیں اپنی کہی باتیں فضول لگیں گی۔

ہر چیز اپنے اندر خوبی اور خامی کا عنصر چھپائے ہوتی ہے۔ بھلے وہ کس قدر اور کیسی ہی دل شکن اور شکست خوردہ کیوں نہ ہو۔ تنقید اگر ذات کی ہتک کا عنصر رکھتی ہے تو بھلائی کا عنصر بھی اسی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

میں نے ان کی ڈانٹ کو بہت غصے سے سنا تھا۔ لیکن یہی ڈانٹ میرے لیے اس قدر مثبت ثابت ہوگی۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ڈائننگ روم میں کھڑے ساس کی اور سب رشتے داروں کی داد وصول کرتے ہوئے ہو رہا تھا۔ اگر پھپھو اس وقت یہاں ہوتیں تو وہ اپنے کہے گئے الفاظ کو ضرور یاد کرتیں، جو ان کی ڈانٹ میں ان ہی تک محدود تھے۔ مگر میں نے اس تنقید سے اپنے لیے مثبت صورت حال کا موتی نکال لیا۔ جس نے میری زندگی کو حسین اور آسان بنا دیا۔ آج میں بھی پھپھو کی طرح سسرال میں مقبول ہوں اور ان کی اس تنقید کے لیے ان کی شکر گزار ہوں۔

کہوں اب کیا، کہاں تک روشنی ہے
جہاں میں ہوں، وہاں تک روشنی ہے

تصور میں ہے وہ روشن سا چہرہ
حدِ وہم و گماں تک روشنی ہے

نشانی اپنے گھر کی کیا بتاؤں
چلے آؤ، جہاں تک روشنی ہے

در و دیوار کس کے منتظر ہیں
حریمِ جسم و جاں تک روشنی ہے

وہ گزرے ہیں ابھی اس رہگزر سے
مکاں سے لامکاں تک روشنی ہے

صنم پوجا کرو اب تم بھی ناصر
فقط کوئے بتاں تک روشنی ہے

ناصر زیدی

اب یہاں کچھ نہ کچھ تو ہونا ہے
ہر طرف بے کسی کا رونا ہے

کیا مقدر سے ہم کریں شکوہ
کاٹنا ہے وہی جو بونا ہے

اک انا تھی جو چھن گئی ہم سے
اور کیا اس سے بڑھ کے کھونا ہے

آنسوؤں سے لکھے نصیبے کو
آنسوؤں ہی سے ہم نے دھونا ہے

اس میں لاشے ہیں آرزوؤں کے
زادِ راہ جو عدم کو ڈھونا ہے

کل تلک زندگی تھی جو نعمت
آج دہشت کا وہ کھلونا ہے

جانے کب ختم ہوں یہ جھگڑے
جانے کب میٹھی نیند سونا ہے

بشریٰ اعجاز

ہے جس کے ہاتھ میں پتھر، اسے گماں بھی نہیں
کہ فکرِ آئینۂ جسم و جاں یہاں بھی نہیں

اب اس نے وقت نکالا ہے حال سننے کو
بیان کرنے کو جب کوئی داستاں بھی نہیں

وہ دل سے سرسری گزرا، کرم کیا اس نے
کہ رہنے کو متحمل تو یہ مکاں بھی نہیں

زمین پیروں سے نکلی تو یہ ہوا معلوم
ہمارے سر پہ کئی دن سے آسماں بھی نہیں

سفر میں چلتے نہیں عام زندگی کے اصول
وہ ہم قدم ہے مرا جو مزاج داں بھی نہیں

مرے ہی گھر میں اندھیرا نہیں ہے صرف جمال
کوئی چراغِ فروزاں کسی کے ہاں بھی نہیں

جمال احسانی

71ء کا دسمبر

یہی ظالم مہینہ تھا
چٹانیں برف اوڑھے تھیں
بڑی سفاک سردی تھی
ہماری سرحدوں پہ
دشمنوں سے جنگ جاری تھی
فتح کے خواب دل میں تھے
لبوں پر بھی دعائیں تھیں
دعائیں رنگ نہ لائیں
مشقت کام نہ آئی
خبر آئی کہ "سب کچھ ہار بیٹھے ہیں"
مقدر کے قلم نے اک شکستِ فاش
لکھ دی ہے...!
ابلتا خون، رگوں میں
برف بن کر رہ گیا تھا
نگاہوں میں تحیر جم گیا تھا
ہمارا جسم دو حصوں میں
یکدم بٹ گیا تھا
ہمارا ایک بازو کٹ گیا تھا

شمیم فاطمہ

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے ملتے ہیں تو قاتل اور مقتول (دونوں فریق) جہنم میں جائیں گے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یہ قاتل ہے (اس لیے مجرم ہے) مقتول (کے جہنمی ہونے) کی کیا وجہ ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔"

استغفار،

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

"ایک مرتبہ مجھے عراق کے کسی گاؤں میں رات ہو گئی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا۔ چوکیدار نے نکال دیا۔ میں مسجد کے باہر فرش پہ سو گیا۔ چوکیدار نے مجھے پاؤں سے گھسیٹ کر دور کر دیا۔ اس دوران ہر وقت استغفار پڑھتا تھا۔ صبح میں نے پوچھا کہ آپ کو استغفار پڑھنے کا کوئی فائدہ بھی ہوا؟ تو اس نے کہا جی میری ہر دعا قبول ہوئی سوائے اس کے کہ میری ملاقات امام احمد بن حنبل سے ہو جائے۔" میں نے کہا "میں ہی احمد بن حنبل ہوں اور تم دیکھو کہ مجھے کیسے گھسیٹ کر تمہارے پاس لایا گیا ہے۔"

عائزہ، انضواء - کراچی

محبت،

☆ محبت کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرتی جس کے ساتھ رہا جائے.. محبت تو کسی ایسے شخص کو تلاش کرتی ہے جس کے بغیر نہ رہا جائے۔

☆ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے "زندہ رہے تو پھر ملیں گے" مگر کچھ لوگوں سے مل کر ایسا لگتا ہے ملتے رہے تو زندہ رہیں گے۔

آمنہ اُجالا - ڈہرکی

اللہ کے قریب،

اگر کہیں شک بھی ہو جائے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے قریب ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ۔

(واصف علی واصف)

حرا قریشی - ملتان

شریکِ غم،

جو شخص تمہاری خوشیوں میں شریک ہوتا ہے لیکن تکالیف میں ساتھ نہیں دیتا۔ وہ جنت کے سات دروازوں سے ایک کی کنجی کھو بیٹھتا ہے۔

(خلیل جبران)

نمرہ، اقراء - کراچی

یاد رکھیں،

☆ اہمیت دُکھ کی نہیں بلکہ دُکھ دینے والے کی ہوتی ہے۔ دُور رہیے ایسے دوستوں سے جو کھیل ہی کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔

☆ جس شخص نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی، اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☆ عقل مندی اور بے وقوفی میں فرق یہ ہے کہ عقل مندی کی ایک حد ہوتی ہے۔

سعدیہ سنبل - قصور

بے سود،

فراز صاحب کے گھر کے گیٹ پر لگا ہوا میل باکس کافی پرانا ہو چکا تھا۔ فراز صاحب اسے اتار کر نیا لگانا چاہتے تھے لیکن وہ کافی مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ ایک روز وہ اسے اتارنے کے لیے زور آزمائی کر رہے تھے کہ گلی سے گزرتا ہوا ایک موٹر سائیکل سوار رک گیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"کوئی فائدہ نہیں جناب! میں نے بھی یہ طریقہ اختیار کر کے دیکھا تھا لیکن بجلی، گیس، پانی اور فون وغیرہ کے بل پھر بھی آتے رہے۔"

صدف عمران - کراچی

محبت بانو قدسیہ کی نظر میں

☆ محبت ایسی امر بیل ہے جو جس درخت پر چڑھ جاتی ہے وہ پیڑ پھر سوکھ جاتا ہے اور ایک دن اپنے آپ گر جاتا ہے۔

☆ محبت خیال کے علاوہ، وجود سے بھی کیا؟ انسان عموماً اس عکس، تصویر، امیج سے محبت کرتا ہے جو اس کا ذہن تخلیق کرتا ہے۔ محبت کیے جانا آسان کام بھی ہے اور قدرے مشکل امر بھی۔

☆ عورت کی محبت ہمیشہ اظہار کی محتاج رہتی ہے۔ ورنہ اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

☆ کچھ لوگوں کی محبت حاصل کرنے کے لیے کچھ انسانوں کو ہمیشہ اذیت کی دیاسلائی روشن کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہ آنسوؤں کے بغیر محبت کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

☆ محبت کوئی ٹرین تو ہے نہیں کہ پچھلے ڈبے کاٹ کر نئے ڈبے لگا دیے جائیں۔ اس میں تو پچھلے اور نئے کوچ یوں آپس میں ملے جلے ہوتے ہیں۔ کہ جیسے پرانی محبت نئی محبت سے بغل گیر ہو، بالکل کتاب کے اوراق کی طرح۔

☆ ماں اور بیٹے کی محبت میں کم از کم دو منزلیں نہیں ہوتیں، جن پر چل کر آدمی اپنے چاہنے والوں سے مزید پھڑ جاتا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ - گجرات

انمول موتی،

☆ پھول نے وقت سحر آسمان سے فریاد کی کہ مجھ سے میری شبنم چھینی جا رہی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ آسمان اپنے ستارے کھو رہا ہے۔

☆ اگر غلط فہمیاں دور نہ کی جائیں تو وہ نفرتوں میں بدل جاتی ہیں۔

☆ پانی جو جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ پتھر نہ بنو جو دوسروں کا راستہ روک لیتا ہے۔

☆ خدا انسان کو معاف کر دیتا ہے۔ انسان، انسان کو معاف کر دیتا ہے مگر انسان کی بھول انسان کو کبھی معاف نہیں کرتی۔

☆ اگر تم انسان ہو تو دلوں کو فتح کرنے کا ہنر سیکھو۔

☆ جو تمہیں سچا سمجھے اس سے جھوٹ بولنا سخت ترین خباثت ہے۔

آمنہ اُجالا - ڈہرکی

اعتدال پسند،

مجھے اعتدال پسندوں سے نفرت ہے اور انتہا پسندوں سے محبت۔ اعتدال پسندوں نے کامیابی اور ناکامی کے درمیان وہ راہیں تلاش کر رکھی ہیں جو گمنامی کے گڑھے میں لے جاتی ہیں۔ (خلیل جبران)

آمنہ اُجالا - ڈہرکی

جرمانہ،

ایک جوڑا ہنی مون منانے کے لیے گیا تو ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ شام میں جب وہ جوڑا سیر کے لیے گیا تو کھانا باہر ہی کھا آیا۔ جوڑا واپس ہوٹل پہنچا تو منیجر نے کھانے کا بل پیش کر دیا۔

"مگر ہم نے تو یہاں کھانا نہیں کھایا۔" شوہر نے غصے سے کہا۔

"مگر کھانا تو تیار تھا۔" منیجر نے بے نیازی سے کہا۔

اگلے دن وہ جوڑا پھر کہیں گیا اور چلتے چلتے ہی آیا۔

تو منیجر نے چائے کا بل پیش کر دیا۔
"مگر ہم نے تو چائے نہیں پی۔" شوہر نے احتجاج کیا۔
"مگر چائے تیار تھی۔" منیجر نے لاپروائی سے کہا۔
جب وہ جوڑا واپس جانے لگا تو شوہر نے ہوٹل کے مالک کو جرمانے کا ایک بل پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ان کے منیجر نے اس کی بیوی کو چھیڑا ہے۔
"مگر میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔" منیجر نے چلا کر کہا۔
"مگر وہ تو تیار تھی۔" شوہر نے بے نیازی سے جواب دیا۔

ثمرہ اقصیٰ۔ کراچی

ایک دسمبر

ایک دسمبر میرے اندر
پتھر جیسی آنکھ کی دھرتی
اور دل سات سمندر
سوچ کی لہریں شہر میں لیے
چاند سے کھے بس گمشدہ
مجھ میں آن بسا دسمبر

پروفیسر صاحب

ایک پروفیسر صاحب کا ایک دور کا عزیز فوت ہو گیا۔ وہ پروفیسر بھی تعزیت کے لیے اس کے گھر پہنچے۔ تعزیت کے الفاظ انہوں نے ادا کیے۔
"کتنی خوشی کی بات ہے۔ آج کی نشست آپ سب نے ہے۔"
ایک شخص نے انہیں کہنی ماری اور بتایا کہ یہاں سب لوگ تعزیت کے لیے آئے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے کہنا شروع کیا۔
"مجھے ابھی ابھی بتایا گیا ہے کہ آج کا یہ مجمع رنج و غم کا اظہار کرنے کے لیے مخصوص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے آج تک اتنا خوش اور پرسکون مجمع زندگی میں نہیں دیکھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے منتظمین کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی جلد از جلد ایسے سنجیدہ اجتماعات منعقد کرتے رہیں گے۔"

ندا فضہ۔ فیصل آباد

سنہری کرنیں

- پریشانی میں مذاق اور خوشی میں طعنہ نہ دو، کیونکہ اس سے رشتوں میں موجود محبت ختم ہو جاتی ہے۔
- مقابلے کا پہلا میدان تمہارا اپنا نفس ہے۔ اس سے جنگ کر کے خود کو آزما لو کہ تم آزاد ہو یا غلام۔
- جس کو اللہ نے دعا کی توفیق دی لو وہ قبولیت سے محروم نہیں رہ سکتا۔
- زندگی میں جو چاہو حاصل کر لو، بس اتنا خیال رکھنا کہ آپ کی منزلوں کا راستہ کبھی لوگوں کے دلوں کو توڑتا ہوا نہ گزرے۔
- اگر درخت اپنی سرگزشت لکھ سکتا تو اس کی سرگزشت کسی قوم کی آپ بیتی سے مختلف نہ ہوتی۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

طنزیے

- کہتے ہیں کہ بڑے درخت کے نیچے چھوٹا درخت نہیں اگ سکتا حالانکہ چھوٹے درخت کے نیچے بڑا درخت بھی نہیں اگ سکتا۔
- ہر پیدا ہونے والا بچہ سر کے بل آتا ہے مگر چلتا ہمیشہ پاؤں کے بل ہے۔
- عشق میں آدمی پاگل ہو سکتا ہے مگر پاگل پن میں عشق نہیں کر سکتا۔
- فنکار فن سے بنتا ہے، کار سے نہیں۔
- مچھر ہاتھی کو کاٹ سکتا ہے مگر ہاتھی مچھر کو نہیں کاٹ سکتا۔
- سستی شہرت حاصل کرنے پر ضروری نہیں کہ پیسے بھی کم خرچ ہوں۔
- سارے میچ جیتنے کے لیے پہلا میچ جیتنا ضروری ہے۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

خالدہ جیلانی

ایس۔ آر ۔۔۔۔۔۔ جام پور

ہجر کی رات ڈھل گئی محسن
اب تو دل سے کہو، سنبھل جائے

آسیہ جاوید ۔۔۔۔۔۔ علی پور چٹھہ

جب کبھی ٹوٹ کے روتا ہوں شب ہجراں میں
میری آنکھوں کو جو تی ہے محبت اس کی
پاؤں ٹکتے ہی نہیں میرے زمیں پر واثق
اب فضاؤں میں اڑاتی ہے محبت اس کی

ارم رضوان ۔۔۔۔۔۔ عبدالحکیم

محبت کا ثمر ملتا نہیں ہے
یہ سکہ اب کہیں چلتا نہیں ہے
ہم اہل دل، سر بازار دنیا
کھڑے ہیں، راستہ ملتا نہیں ہے

بیگم ظفر چوہدری ۔۔۔۔۔۔ خانیوال

زندگی بھر نہ جس نے لب کھولے
اپنی بیٹی کے واسطے بولی
کون تھا جس سے اپنا دکھ کہتی
آئینے پر ہی سر رکھا، رو لی

امامہ حبیب ۔۔۔۔۔۔ عبدالحکیم

خالی ہاتھ کا دکھ لیے کیوں تڑپاتا
صحرا تھا وہ شخص تو پیاس ہی دے جاتا
دل کو ہوش ہی کب رہتا تعبیروں کا
آنکھوں میں وہ بن کر خواب اتر آتا

آئینہ مچھ ۔۔۔۔۔۔ کوئٹہ

سود و زیاں کا روز حساب کیا جائے
اپنوں میں کب کھلتا ہے ایسا کھاتا
جبر میں ساری بات انا پر آتی ہے
چاہت میں تو جو جی چاہے منواتا

ارم احمد ۔۔۔۔۔۔ لاوہ

ہے تعلق تو ایک سادہ لفظ
بھید جو بھی ہے، وہ نباہ میں ہے
سر میں بھی ہو یہ لازمی تو نہیں
جو فضیلت کسی کلاہ میں ہے

سعدیہ سنبل ۔۔۔۔۔۔ قصور

روشن ہوئی اسی سے اسی سے بکھر گئی
شبنم کو آفتاب سے نسبت عجیب تھی
دل کہیں نہ رہ سکے، جو کہیں تو کہیں نہ جائے
امجد شکست دل کی حکایت عجیب تھی

سنبل ملک اعوان ۔۔۔۔۔۔ لاہور

کب سے ہم لوگ اس بھنور میں ہیں
اپنے گھر میں ہیں یا سفر میں ہیں
زندگی کے تمام تر رستے
موت ہی کے عظیم ڈر میں ہیں

دانش علی ۔۔۔۔۔۔ نارووال

کون کہاں پر چھوٹا نکلا! کیا بتلاتے ہم
دنیا کی تفریح تھی اس میں، ہمیں خسارا تھا

صفیہ عباس ۔۔۔۔۔۔ کروڑ لعل عیسن لیہ

ہر کسے ہے پُر ملال، بڑی تیز دھوپ ہے
ہر لب پہ ہے سوال بڑی تیز دھوپ ہے
چکرا کے گر نہ جاؤں میں اس تیز دھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال، بڑی تیز دھوپ ہے

ذکیہ ۔۔۔۔۔۔ رو بڑی

کوئی بھی میری طرح سے اگر دعا مانگے
خدا سے صرف دل درد آشنا مانگے
عجیب رسم چلی ہے یہ کوئے قاتل میں
جو خوں بہائے وہی شخص خوں بہا مانگے

انعم خالد ۔۔۔۔۔۔ سکھر

حالانکہ ہم کو بھی تبسم خوب سنورنا آتا ہے
آئینہ پردیس میں ہو تو ہم کیسے سنگھار کریں

حنا سلیم اعوان ۔۔۔۔۔۔ آخون باندی ہری پور

دکھ تو یہی ہے اس سے کنارا نہیں ہوا
جو شخص لمحہ بھر بھی ہمارا نہیں ہوا
میں کیا کسی کے ساتھ جیوں گا تمام عمر
میرا تو اپنے ساتھ بھی گزارا نہیں ہوا

سندس عاجز راجپوت ۔۔۔۔۔۔ سانگھڑ

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

ماریہ سید واجد علی ۔۔۔۔۔۔ کراچی

مٹھی میں کائنات بڑی دیر تک رہی
میری طرف حیات بڑی دیر تک رہی
ڈھلنے لگی تھی رات کہ تم یاد آ گئے
پھر اس کے بعد رات بڑی دیر تک رہی

عائشہ ۔۔۔۔۔۔ گوجرہ

اس کو نہ خیال آئے تو ہم منہ سے کہیں کیا
وہ بھی تو ملے ہم سے ہم ہی اس سے ملیں کیا

اینقہ انا ۔۔۔۔۔۔ چکوال

دھندلیوں نے مٹا دیے، جو بھی تھے قربتوں کے رنگ
اب میری بات بات میں رنگ تیری طلب کا ہے

سائل دعا بخاری ۔۔۔۔۔۔ بصیر پور

پیاس وہ تھی کہ سمندر سے بھی نہ بجھتے پانی
اور وہ تھا کہ اک قطرہ بھی نہ دیتا تھا
خود ہی حائل تھا، اپنے ہی درمیان وہ دعا
کسی اور سمت جانے کا رستہ بھی نہ دیتا تھا

حرا قریشی ۔۔۔۔۔۔ ملتان

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی!
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

عصمہ احمد ۔۔۔۔۔۔ بدین

میں روکنا ہی نہیں چاہتا تھا وار اس کا
گری نہیں میرے ہاتھوں سے ڈھال ویسے ہی
زمانہ ہم سے بھلا دشمنی تو کیا رکھتا
سو کر گیا ہے ہمیں پائمال ویسے ہی

نازش صابر ۔۔۔۔۔۔ سٹھیالا لودال

ہم میں تو بہت ہمت ہے درد سہنے کی
تم اتنا درد دیتے ہو تھک نہیں جاتے

مزوبار یہ خالد ۔۔۔۔۔۔ لاہور

نہ دل کا روگ تھا نہ یادیں تھیں اور نہ ہی یہ ہجر
تیرے پیار سے پہلے کی نیندیں بھی کمال کی تھیں

ارم کمال ۔۔۔۔۔۔ فیصل آباد

دل بچھڑنے کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں
بعض چہرے بڑے نایاب ہوا کرتے ہیں
نیند سے جن کی ٹھنی رہتی ہے ہر شب یارو
ان کی جھولی میں کئی خواب ہوا کرتے ہیں

مہوش مشتاق ۔۔۔۔۔۔ چیچہ وطنی

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی روئے گا تمام عمر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں

رخشندہ، عارفہ ارشد ۔۔۔۔۔۔ لیاری کراچی

یہ سال بھی، دامن رہا رو بھٹک کر گیا
تجھ سے ملے بغیر دسمبر گزر گیا
جو بات معتبر تھی سر سے گزر گئی
جو حرف سرسری تھا دل میں اتر گیا

حرا قریشی ۔۔۔۔۔۔ ملتان

رات دسمبر تیری یخ بستگی میں بھی
طلب اس کی کیوں منجمد نہیں ہوتی

سرورق کی شخصیت

ماڈل	مریم
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

امت الصبوح

خواتین کی ڈائری

سمیرا انور کی ڈائری سے

بعض دکھ چپکے چپکے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ انسان انہیں بیان کر سکتا ہے نہ کھل کر کسی کے سامنے رو سکتا ہے۔ کوئی ذرا سی بات بہانہ بن جاتی ہے اور آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اعتبار ساجد کی یہ غزل اسی کیفیت کی عکاس ہے۔

بھرے گھر میں کوئی غم خور سکھ کے سو رہا ہے
وہ اپنے سامنے اخبار رکھ کے رو رہا ہے

منڈیروں پر شکستہ کچھ دیے بکھرے پڑے ہیں
کوئی سر کو سر دیوار رکھ کے رو رہا ہے

اُسے معلوم ہے اب ڈوبنے والی ہے کشتی
وہ منہ ڈھانپے ہوئے پتوار رکھ کے رو رہا ہے

کہانی لکھتے لکھتے اس کے دل میں کیا سمائی
کہ خود کو مرکزی کردار رکھ کے رو رہا ہے

دم رخصت کسی نے مڑ کر بھی دیکھا نہ اس کو
وہ سر کو میز پر بے کار رکھ کے رو رہا ہے

ثمرہ اقرأ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم آپ سب قاری بہنوں کے لیے۔

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
جب دل کا جوالا سرد پڑے
جب شام و سحر کے صحرا میں
خوابوں کے ستارے ریت ہوئے
جب عمر رواں کے میداں میں
سب زندہ جذبے کھیت ہوئے

اس وقت مجھے محسوس ہوا
جس عشق میں ساری عمر کٹی شاید وہ نظر کا دھوکا تھا
کرنوں سے کسی کے لہجے میں تو پر تھی میری اپنی ہی
شب تاب بدن کے جادو میں خود میرے لہو کا نشہ تھا
کل رات مگر جب کھڑکی پر
مہتاب نے آ کر دستک دی
خوشبوؤں کی طرح بہنے لگی
ہر سمت کوئی سرگوشی سی
جب آنکھیں بجھنے لگتی ہوں جب دل کا جوالا سرد پڑے
اس وقت کسی کو کیا معلوم، کون اپنا کون پرایا تھا
لہجے میں نشہ تھا کس کے سبب اور کس نے کسے بہکایا تھا

حبیبہ صفدر کی ڈائری سے

خوبصورت شاعر اور خوبصورت لفظ یکجا ہوں تو ایک ہی نام ذہن میں آتا ہے۔ منیر نیازی۔ ان کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

ہم نہاں میرے تھے ان کے دل مگر اچھے نہ تھے
منزلیں اچھی تھیں میرے ہمسفر اچھے نہ تھے

جو خبر پہنچی یہاں وہ اصل صورت میں نہ تھی
تھی خبر اچھی مگر اہل خبر اچھے نہ تھے

بستیوں کی زندگی میں بے زری کا ظلم تھا
لوگ تھے وہاں کے اچھے اہل زر اچھے نہ تھے

ہم کو خوباں میں نظر آتی تھیں کتنی خوبیاں
جس قدر اچھے لگے تھے اس قدر اچھے نہ تھے

اس لیے آتی نہیں گھر میں محبت کی ہوا
اس ہوا کے لوگ سارے منتظر اچھے نہ تھے

اک خیال خام ہی مرشد تھا ان کا اے منیر
یعنی اپنے شہر میں اہل نظر اچھے نہ تھے

سمیرا یوسف کی ڈائری سے

تنہائی، بے بسی، زندگی کا بوجھ اٹھانے کی تھکن اور اپنوں کے ہاتھوں کھائے کاری زخموں کا احساس۔ اقبال عظیم کی یہ غزل آپ کی نذر۔

شکوہ بھی جفا کا کیسے کریں، اک نازک سی ڈوری ہے
آغاز وفا خود ہم نے کیا تھا، پہلی بھول ہماری ہے

دکھ تم کو جب جب پہنچا ہے خود ہم نے آنسو پونچھے ہیں
اب دل پہ ہمارے چوٹ لگی ہے اب کے تمہاری باری ہے

یہ کھیل باری جیت کے بھی تم ہم سے خفا کیوں رہتے ہو
اور ہم کو دیکھو ہم نے تو خود اپنی بازی ہاری ہے

وہ عہد تھا عیش و جوانی کا، اب عمر ہے سعی تلافی کی
پہلے بھی نیند پرائی تھی اور اب بھی شب بیداری ہے

کچھ درد نہاں کچھ فکر جہاں، کچھ شرم خطا، کچھ خوف سزا
اک بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

جو کاری زخم لگا ہے دل پر پہلے اس کی فکر کرو
یہ بعد میں دیکھا جائے گا یہ کس کی کارگزاری ہے

جو صاحب گھر گھر میری بابت زہر اگلتے پھرتے ہیں
وہ صرف میرے ہمسائے نہیں ہیں ان سے قرابت داری ہے

اس راہ سے ہو کر گزرے ہیں کچھ رہبر بھی کچھ رہزن بھی
اب نقش قدم پہچان کے چلنا آپ کی ذمہ داری ہے

ڈرامہ سیریل "قرض" کا سفیان

باتیں فارس شفیع سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"فارس شفیع۔"

2 "پیار کا نام؟"
"فارس۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"2 نومبر 1987ء/لاہور۔"

4 "اسٹار/قد؟"
"اسکارپیو/6 فٹ اور تقریباً "6 انچ۔"

5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"دو بہن بھائی' ایک ہی بہن ہے جو بڑی ہے مجھ سے۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن اور ترکی سے یہ ڈگری حاصل کی۔ ایڈور ٹائزنگ میں گریجویٹ ہوں۔"

7 "شادی پسند سے؟"
"ابھی بات نہ کریں۔ کوئی سوچ نہیں ہے اس بارے میں۔"

8 "شوبز میں آمد؟"
"اپنے ہی ٹیلنٹ سے آیا ہوں۔"

9 "پہلا پروگرام؟"
"میرے حضور" یہ ڈرامہ سیریل تھا۔

10 "وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟"
"میرے حضور" اور "من جلی" اور اب "قرض"۔

11 "پہلی کمائی/کہاں خرچ کی؟"
"اماؤنٹ تو یاد نہیں مگر اس کمائی سے اپنے ہی شوق پورے کیے تھے۔"

12 "شوبز کی برائی آپ کی نظر میں؟"
"شوبز کی برائی تو کیا بتاؤں' ہمارے ہر شعبے میں تعلیم کی کمی ہے۔"

13 "کیا بننا چاہتے تھے؟"
"یہی جو آج ہوں۔"

14 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"جب کام ہوتا ہے تو دس بجے تک اٹھنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے دیر تک سوتا ہوں۔"

15 "رات کو کب سوتے ہیں؟"
"جب میں اپنے گانے پہ کام کر رہا ہوتا ہوں تو پھر دیر تک جاگتا ہوں۔"

16 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"یہ تو خطرناک سوال کر دیا۔ سگریٹ سلگاتا ہوں۔"

17 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"کوئی بات بری نہیں لگتی بلکہ وہ تو میرے لیے رول ماڈل ہیں۔"

18 "قومی تہوار مناتے ہیں؟"
"ہاں مناتا ہوں۔ مگر اب لوگوں میں جوش و جذبہ کم ہو رہا ہے۔"

19 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"
"کوئی خاص نہیں۔ فٹ رکھنے کے لیے جم جاتا رہتا ہوں۔"

20 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"شدید بھوک میں اگر کچھ نہ ملے تو غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔"

21 "کس دن کا شدت سے انتظار کرتے ہیں؟"
"اگلے دن کا۔"

22 "شدید تھکن کے باوجود کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟"
"اپنے کمرے میں۔ باہر کہیں جانے کا موڈ نہیں ہوتا۔"

23 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"
"ہنس کر۔"

24 "بیرون ملک کس قانون سے متاثر ہوتے ہیں؟"
"میں کچھ ممالک خصوصاً" ویسٹرن کنٹری گیا ہوں مگر سب سے اچھا نظام مجھے ترکی کا ہی لگا ہے۔"

25 "میٹر کب گھومتا ہے؟"
"جب مجھے بھوک لگتی ہے۔"

26 "غصے میں آپ کی کیفیت؟"
"مجھے غصہ پسند نہیں۔ کبھی ای سے بحث ہو جائے تو غصے میں آجاتا ہوں ورنہ نہیں۔"

27 "اپنے ناپسندیدہ بندے سے آپ کا سلوک؟"
"میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اس سے بات نہ کروں۔"

28 "خواتین میں کیا بات بری لگتی ہے؟"
"مجھے تو خواتین بہت اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے کوئی برائی نہیں کر سکتا۔"

29 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"
"میں چونکہ ٹی وی پہ آتا ہوں تو ایسا تو ہو گا اور کوئی فین ہی ہو گی جو گھور رہی ہو گی۔"

30 "پرائز بانڈ لینے کا شوق ہے؟"
"نہیں۔ کبھی نہیں لیے۔"

31 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"اپنے غصے سے کہ کہیں بھوک نہ لگ جائے۔"

32 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"
"ہر چیز کی انفارمیشن۔"

33 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"
"کوئی میرے ساتھ رکھنا چاہے گا تو رکھ لوں گا۔ ویسے ابھی تو سنگل ہی ہے۔"

34 "جب شاپنگ پہ جاتے ہیں تو سب سے پہلے کیا خریدتے ہیں؟"
"میں زیادہ تر الیکٹرونک چیزیں پسند کرتا ہوں۔"

35 "آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"
"یہ تو دنیا سے جانے کے بعد ہی پتا چلے گا۔"

36 "کبھی کرائسز میں وقت گزارا؟"
"وقت اور کرائسز میری نظر میں ایک سی چیز ہے۔"

37 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"محبت کا تحفہ بہترین ہے۔"

38 "کون سی بات موڈ پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"آج کل جس طرح کے حالات ہیں' اس میں کوئی پیار محبت کی بات کرے تو موڈ پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔"

39 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"یہی جس میں میں ہوں۔ شوبز کی فیلڈ۔"

40 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ میں کس چیز پر خرچ کر رہا ہوں۔"

41 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"اپنے ہی ہوتے ہیں۔ پرائے تو کسی کنڈیشن پہ ہی آپ سے بات کرتے ہیں۔"

42 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"
"گھر پر ہی گزارنا پسند کرتا ہوں۔ گھر سے باہر جانے کے لیے بہت تیار ہونا پڑتا ہے۔"

43 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی ایک لفظ؟"

"یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔"

44 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"مجھے اپنی نانی امی کے پاس سکون ملتا ہے۔"

45 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب آپ فوراً دیتے ہیں؟"
"کسی کے بھی نہیں۔"

46 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"گیم کھیل لیتا ہوں یا پھر اپنے میوزک پہ کام کرتا ہوں۔"

47 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"
"مجھے نگیٹو رول پسند ہیں کیونکہ اس میں اداکاری کا مارجن ہوتا ہے۔"

48 "کوئی کردار جو کرکے پچھتائے؟"
"نہیں جی! ابھی ایسا کوئی کردار نہیں کیا۔"

49 "ایک کردار جو ہٹ گیا؟"
"من جلی اور قرض کا ہی حوالہ دوں گا۔"

50 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"
"نہیں کیونکہ فون کا تو یہ سکھ ہے کہ اگر کال ریسیو کرنے کا موڈ نہیں تو نہ کریں۔ بھلے کتنی گھنٹیاں بجتی رہیں۔"

51 "مہمانوں کی آمد کیسی لگتی ہے؟"
"مہمانوں پر بھی تو منحصر ہے کہ کون مہمان ہے اور خود مہمان بن کے جانا بھی اچھا لگتا ہے۔"

52 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گے؟"
"نظام میں کچھ تبدیلیاں لاؤں گا اور دفاعی بجٹ میں ضرور کمی کروں گا اور تعلیمی بجٹ میں اضافہ کروں گا کہ یہ بہت ضروری ہے۔"

53 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"اچھے خیالات۔ اچھے الفاظ۔"

54 "نصیحت جو بُری لگتی ہے؟"
"مجھے تو لفظ نصیحت ہی برا لگتا ہے۔ اگر آپ کی امی آپ کو کچھ کہہ رہی ہیں تو ٹھیک ہے۔ دوسروں کی پسند نہیں۔"

55 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"نہیں۔"

56 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"
"ان لوگوں پر جن کے پاس مجھ سے کم ہوتا ہے۔ شوٹ کے دوران ان لوگوں پر جو ہم سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔"

57 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اپنی کار میں مہنگے اسپیکر لگوائے ہیں۔"

58 "کھانے کے لیے بہترین جگہ؟ چٹائی یا ٹیبل؟"
"منحصر ہے کہ تقریب کیسی ہے۔ ویسے مجھے کار میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا شوق ہے۔"

60 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گے؟"
"اوئے ہوئے۔ قسمے بہت کچھ کروں گا آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

61 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بہت نہیں لیکن میرا گانا تو انٹرنیٹ پہ ہی چلا تھا اور فیس بک پہ۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ سوشل میڈیا نے ہمیں ان سوشل کر دیا ہے۔"

62 "فیوچر پلاننگ؟"
"میوزک اور اداکاری میں مقام بنانا۔"

63 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"دونوں ہی ہوتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مرد زیادہ ہوتے ہیں۔"

64 "ایک شخصیت جس کو آپ اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"
"اسی شخص کو اغوا کروں گا جو مجھے چاہیے ہوگا۔"

65 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"لال بیگ بہت برے لگتے ہیں اور چوہے بھی برے لگتے ہیں۔"

66 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بے وقوف ہوتے ہیں۔ غریب لڑکوں کو پیسے کا لالچ دے کر پھنسا لیتے ہیں۔"

67 "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی کی۔"

68 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"اپنے ہاتھ کا پکا ہوا۔"

69 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"کبھی نہیں کیا۔"

70 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"کافی ہیں۔"

71 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"والٹ، گاڑی کی چابی اور سگریٹ۔"

72 "آپ دوسروں سے کتنے مختلف ہیں؟"
"پتا نہیں لیکن جاب کرنے والوں میں اور ہم میں فرق ہوتا ہے۔"

73 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"کوشش کرتا ہوں اور زیادہ تر تو کر ہی لیتا ہوں۔"

74 "اپنی کوئی اچھی عادت بتایئے؟"
"اگر اپنی اچھی عادت خود ہی بتا دی تو وہ اچھی کہاں رہے گی۔"

75 "اور کوئی بُری عادت؟"
"سگریٹ نوشی۔"

76 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"دوستوں یاروں میں۔"

77 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"چھوڑا ہی ہوگا، یاد نہیں ہے۔"

78 "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"
"ابھی تک کسی پروگرام میں نہیں گیا۔ پھر صبح اٹھنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا اور جتنے خوش مارننگ شو میں سب ہو رہے ہوتے ہیں۔ میں نہیں ہو سکتا۔"

79 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب پرائیویسی نہیں رہتی۔"

80 "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"
"کروٹیں بدلنے کا ویسے ہی مجھے بہت شوق ہے۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے نہیں۔ ویسے ہی جمائیاں اور انگڑائیاں لینے میں مزہ آتا ہے۔"

81 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتے ہیں؟"
"عینک، چابی، بٹوا اور چھوٹی موٹی دوسری چیزیں۔"

82 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"زندگی ہر وقت اچھی اور بری لگتی ہے۔"

83 "کب زندگی بدلی؟"
"2003ء میں جب میں ترکی گیا تھا۔"

84 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"مجھے بالکل بھی یہ پسند نہیں کہ کوئی مجھے گہری نیند سے اٹھا دے۔"

85 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"کوشش کرتا ہوں کہ نہ بولنا پڑے۔"

86 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں؟"
"شام کے وقت۔"

87 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ میں کب گھر آرہا ہوں۔"

88 "کون سے چینل شوق سے دیکھتے ہیں؟"
"اسپورٹس اور ڈسکوری وغیرہ۔"

89 "سب سے برا جملہ کیا لگتا ہے؟"
"بہت مشکل سوال ہے۔ پتا نہیں جی۔"

91 "موبائل سروس کا آف ہونا کیسا لگتا ہے؟"
"برا تو لگتا ہے مگر اب انٹرنیٹ کے ذریعے کام آسان ہو گیا ہے۔"

92 "سی این جی کی لائن میں لگنا کیسا لگتا ہے؟"
"بہت برا لگتا ہے اس لیے میں نے کٹ نکلوا دی۔"

93 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"دس روپے۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"ابھی عروج ملا کہاں ہے۔ جب ملے گا تو سوچیں گے۔"

☆

خبر گیا وبیگ

صبا ساحر

مدح سرائی

اب تک ہم اداکاروں، گلوکاروں اور اہم شخصیات کے ہی نخرے، عشوے، غمزے دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔ ان کے مداح ان کو ایک نظر دیکھنے، آٹو گراف لینے ان سے بات کرنے کے لیے کیسے کیسے "کشٹ" اٹھاتے ہیں، مت پوچھیے، مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب "فینز" بھی اپنے اسٹارز کو "لائیک" کرنے لگے ہیں۔ جیسے اسٹائل آئیکون فیصل قریشی نے اپنے ایک مداح کو اپنے فین پیج پہ سالگرہ کی مبارک باد دی۔ ایک خاتون فین کے ہاتھوں بنی اپنی تصویر کو اپنے فین پیج پر شیئر کرکے اسے سراہا۔

بہت ساری فیلڈز میں کامیابی سے جگہ بناتی ماڈل و اداکارہ نادیہ حسین نے، جو ڈینٹسٹ بھی ہیں، فیشن انڈسٹری میں بھی نام کمارہی ہیں اور اب ایک سیلون بھی کھول چکی ہیں (چاند پر بھی جانے ہی والی ہیں) اپنے 100 فینز کی مفت ہیر اسٹائلنگ کرکے ان کی تصویریں اپنے فین پیج پر شیئر کی ہیں اور ایسے ہی بہت سے فنکار ہیں، جو اپنے پرستاروں کو خوب خوب اہمیت دینے لگے ہیں۔

اس سے قبل مشہور شخصیات کی اپنے فینز سے بدسلوکی کے بہت سے واقعات منظر عام پر آچکے ہیں ایسے میں محبت اور اپنائیت کا یہ اظہار۔۔۔؟ جی کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں، یہ محبتیں، اپنائیتیں فنکار و پرستار کے درمیان براہ راست نہیں ہیں، بذریعہ ٹوئٹر اور فیس بک ہیں۔ جنہیں اکثر ان کے "ایڈمن" چلا رہے ہوتے ہیں۔ یہ خلوص، اپنائیت اور محبت "پبلسٹی مہم" کا حصہ ہے۔ آپ کو پتا ہے نا اس گلوبل ورلڈ میں ہر شے کاروبار سے وابستہ ہے اور کاروبار اشتہار سے۔ "ایڈمن" "سیکریٹری" کا "نیا نام" ہے، نگران کا کام پرانا ہے یعنی پبلسٹی۔۔۔ کیونکہ فین پیج پر پرستاروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی دوڑ بھی لگ چکی ہے اب۔۔۔ ہم پرستاروں کا دل نہیں توڑنا چاہتے لیکن۔۔۔ بات تو سچ ہے کیا کیجیے گا کہ رسوائی کی بھی ہے۔

سادگی و پرکاری

مقبول و معروف گلوکارہ سائرہ نسیم جنہوں نے پہلا گانا چھ برس کی عمر میں گایا۔ جنہوں نے امجد بوبی، ناشاد، وجاہت عطرے اور طافو جیسے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ جنہوں نے گائیکی کو سُر، لے اور تلفظ کے ساتھ باقاعدہ سیکھا۔ جنہوں نے غالب، اقبال، میر اور خسرو کے کلام گائے۔ جنہوں نے لولی وڈ کی سپرہٹ فلموں میں پلے بیک سنگنگ کی اور جو تمغہ امتیاز سے بھی نوازی گئیں۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ "مجھے لگتا ہے، مجھے ابھی تک گانا نہیں آیا۔" (بہت دیر میں پتا چلا آپ کو، اب تو آپ کو مقبولیت مل بھی چکی ہے)

"آج کل کے سنگرز خود لکھتے، خود کمپوز کرتے، خود گاتے اور خود سنتے ہیں۔" (سب تو نہیں، ہاں کچھ سنگر مگر مشہور تو ہوگئے نا)

انہوں نے مزید کہا کہ ماضی میں انہیں فلموں میں کام کرنے کی بھی آفرز ہوئی ہیں۔ (کون سی فلمیں۔۔۔ پاکستان میں تو فلم بننے کا سلسلہ ایک عرصے سے بند ہے) مگر وہ یہ کہہ کر انکار کرتی رہیں کہ "اگر میں فلموں میں کام کرتی تو مجھ پر بھی وہی فحش گانے فلمائے جاتے جو کسی سے گن پوائنٹ پر گوائے گئے تھے۔" (آپ کا اشارہ نصیبو لعل کی طرف ہے نا) واہ سائرہ اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔ نصیبو لعل کو کہا سو کہا، ساتھ ہی ان اداکاراؤں کو بھی گھسیٹ لیا، جن پر وہ گانے فلمائے گئے ہیں۔ (مگر پلے بیک سنگنگ تو آپ نے بھی کی ہے نا؟!)

ان کے آنے سے۔۔۔

افشاں، عروسہ، ثمرہ، ہالہ، مسک تو کرکے آگے جاکر، اور پھر، بادلوں پہ بسیرا، بول میری مچھلی۔۔۔ کون سا ایک نام آپ کے ذہن میں ابھرتا ہے؟ جی ہاں۔۔۔ کراچی سینٹر کے معروف و پسندیدہ اداکار مظہر علی۔۔۔ گزشتہ عرصہ ہارٹ اٹیک کے سبب امریکہ کے شہر ہوسٹن میں عارضی تنفس کے سہارے زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کی حالت کافی نازک بتائی گئی تھی۔ وہ مسلسل امریکی ڈاکٹرز کی زیر نگرانی رہے، پھر اللہ کے کرم سے وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے میں کامیاب ہوئے۔ مظہر علی کافی عرصے سے امریکہ میں مقیم اپنا ذاتی بزنس سنبھال رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اے آر وائی کے اشتراک سے مارکیٹنگ کے شعبے سے بھی وابستہ رہے۔ ڈرامہ سیریل "افشاں" سے اپنی اداکاری کا آغاز کرنے والے مظہر علی کو ناظرین آخری دفعہ "بول میری مچھلی" میں دیکھ پائے تھے جو 2009ء میں ریلیز ہوا تھا۔ سنجیدہ اور نفیس طبیعت کے مالک مظہر علی کے مداحوں کے لیے یقیناً یہ ایک اچھی خبر ہوگی کہ وہ بہت جلد نہ صرف پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں بلکہ مختلف چینلز پہ ڈراموں کو رونق بھی بخشنے والے ہیں۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ اگر آپ محتاط نہیں ہیں تو میڈیا آپ کو ان لوگوں سے نفرت کرنا سکھادے گا جو ظلم اور زیادتی کا شکار ہیں اور ان لوگوں سے محبت جو ظلم و زیادتی کر رہے ہیں۔

(بین الاقوامی میڈیا کے ماہر استاد مالکم ایکس)

☆ امریکہ سمیت عالمی طاقتیں پاکستان کے میڈیا کو براہ راست مالی امداد فراہم کر رہی ہیں۔ صحافیوں کو امریکی دورے بھی کرائے جاتے ہیں۔ صحافیوں کو اسکالرشپ پروگرام بھی جاری کیے گئے ہیں۔ ایک طرف میڈیا میں کام کرنے والوں پر سرمایہ کاری کی جارہی ہے۔ دوسری طرف مالکان کو بھی مختلف فوائد دیے جارہے ہیں۔

(سلمان مجاہد)

☆ مجھے 1998ء میں برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ Douglas Hurd کا ”اسلام سے خطرے“ پر مقالہ سننے کا موقع ملا۔ موصوف نے اپنے خطاب کا اختتام اس جملے سے کیا کہ ”اسلام سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں کیونکہ مسلمان نہ تو متحد ہیں اور نہ ہی ان کے پاس وسائل۔“ آج ــ دنیائے اسلام شیعہ اور سنی کے علاوہ پتا نہیں کس کس میں بٹی ہوئی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مغربی دنیا کی انٹیلی جنس ایجنسیوں میں سنی اور شیعہ معاملات کے علیحدہ علیحدہ ڈائریکٹرز تعینات ہیں۔

(متاع ضمیر۔ سید احتشام ضمیر)

دنیا اور خصوصاً پاکستان میں معذور افراد میں سب سے زیادہ تعداد فالج سے متاثرہ افراد کی ہے۔ پاکستان میں اس بیماری کی بڑی وجوہات میں ہائی بلڈ پریشر، مرغن خوراک، سگریٹ نوشی اور تمباکو سے تیار کردہ خصوصاً گٹکا شامل ہیں۔ ورزش نہ کرنا اور ڈالڈا گھی کا استعمال بھی وجوہات میں شامل ہے۔ صرف کراچی میں روزانہ فالج سے متاثرہ تین سے چار سو مریض اسپتالوں میں لائے جاتے ہیں۔

(پروفیسر ڈاکٹر واسع)

افغان شورش پسندی پر مغربی مصنفین کی کچھ کتابیں میرے زیر مطالعہ ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد مجھے اپنی ناواقفیت پر ندامت محسوس ہونے لگی ہے۔ ہم جس رٹے رٹائے جملے کو دہراتے رہے ہیں کہ ”یہ ہماری جنگ ہے“ یہ وہ ہماری کج فہمی تھی۔ آج احساس ہوتا ہے کہ یہ ہماری جنگ ہرگز نہیں بلکہ امریکا کی جنگ تھی۔ وہ یہاں آئے انہوں نے اسے شروع کیا اور مشرف اور پی پی پی کی نااہل حکومت اور دفاعی اداروں کے فیصلے کی وجہ سے ہم اس میں بری طرح الجھ گئے۔

(ایاز امیر۔ جنگ)

کون سا یورپی ملک ہے جہاں خواتین پر تیزاب نہیں پھینکا جاتا۔ مگر ان پر کوئی ڈاکومنٹری فلم نہیں بنتی۔ لیکن شرمین عبید چنائے کو ایوارڈ مل جاتا ہے۔ کیوں؟

84 ویں آسکر ایوارڈ تک 3000 سے زائد ایوارڈ یافتہ فنکاروں کی فہرست میں مجھے صرف 9 مسلمان ڈائریکٹرز ملتے ہیں اور سب کے سب وہ جنہوں نے اپنے معاشرے، اپنی اقدار یا اسلام سے بغاوت کی۔

اصغر فرہادی Aseperation نامی فلم میں اسلام کے قوانین طلاق کا تمسخر اڑاتا ہے اور اعزاز پاتا ہے۔ ایک فلسطینی ڈائریکٹر فدائی حملوں کے خلاف فلم بناتا ہے تو آسکر ایوارڈ اس کی جھولی میں آگرتا ہے۔ آخر کیوں؟ نوبل امن انعام ملتا ہے تو شیریں عبادی جیسی متنازعہ خاتون کو۔ عبدالستار ایدھی کسی شمار قطار میں نہیں۔ سلمان رشدی کو شیطانی آیات لکھنے پر اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ اشفاق حسین جیسے آدمیوں کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔

(محمد بلال غوری۔ جنگ)

☆

روشن حرف وہ سارے

خدیجہ شبیر

1 :۔

یہ جو شگفتہ سے ہیں قہقہے میرے دل کو لگتے ہیں بوجھ سے
وہ جو اپنے آپ میں مست ہو مجھے اس ہنسی کی تلاش ہے

یہ شعر کافی عرصے تک میری زبان پر رہا۔ مگر وہ زبان ہی کیا جس پر کوئی ایک شعر ٹک جائے اور میری زبان پر تو بیک وقت دو، دو شعر ہوتے ہیں۔ پھر صرف ایک شعر لکھنا اچھا نہیں لگتا۔

میری خاموشیوں کا راز تو مجھے خود بھی نہیں معلوم
جانے کیوں لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں

ایک اور شعر جو آج کل میں اکثر لکھتی اور پڑھتی رہتی ہوں۔

نہ خواب نہ خیال، نہ کوئی حقیقت
کیا عجب سا خالی پن ہے مجھ میں

ریزہ ریزہ ہوتی جا رہی ہوں
ٹوٹا ہے جانے کیا مجھ میں

2 :۔ علامہ اقبال کی شاعری پڑھی بھی بہت اور لکھی بھی بہت ان کی یہ غزل میں نے کلاس 6th میں پڑھی اور یہی ان سے تعارف کی بنیاد بنی۔

تسکین نہ ہو جس سے وہ راز بدل ڈالو
جو راز نہ رکھ پائے وہ ہم راز بدل ڈالو
تم نے بھی سنی ہو گی بڑی عام کہاوت ہے
انجام کا ہو خطرہ تو آغاز بدل ڈالو
پُرسوز دلوں کو جو مسکان نہ دے پائے
سُر ہی نہ ملیں جس میں وہ ساز بدل ڈالو
دشمن کے ارادوں کو ہے زیر اگر کرنا
تم کھیل وہی کھیلو بس انداز بدل ڈالو
اقبال کرو ہمت کچھ دور سویرا ہے
چاہتے ہو اگر منزل تو پرواز بدل ڈالو

3۔ میری تقریباً ساری ہی دوستیں میری طرح باذوق ہیں۔ شعر و شاعری سے شغف رکھنے کے باوجود مجال ہے جو کبھی کوئی سیدھا شعر پڑھا ہو ایسے ایسے ارشاد فرماتی ہیں (ایک دوسرے پر) کہ شاعر حضرات سن لیں تو بے ہوش ہو جائیں اور ہوش میں لانے کے لیے دوبارہ کوئی شعر سنانا پڑے۔ اکثر صبا، رمشہ، انعم، سعدیہ کوئی شعر (جو سنے اور لکھے جانے کے قابل ہو) کہہ ہی دیتی ہیں اور ایسا کم کم ہی ہوتا ہے۔

ہاں ایک بار جب میں تھوڑی اداس تھی تو سعدیہ نے یہ شعر پڑھ کر خوش کر دیا تھا۔ (سیدھا شعر تھا تاجو لکھے جانے کے قابل بھی ہے)

تم اچھی لڑکی ہو یا مجھ کو اچھی لگتی ہو
چہرے سے اداسی دور کرو، تم ہنستی اچھی لگتی ہو

4 بہت سی غزلیں سنیں اور اچھی لگیں۔ مگر جب ”نصیر الدین نصیر“ کی یہ غزل سنی تو اس کو بھی اپنی پسندیدگی کی لسٹ میں شامل کر لیا۔ یہاں جگہ کی کمی کی وجہ سے صرف کچھ ہی اشعار لکھ رہی ہوں۔

میری زندگی تو فراق ہے، وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہ شوق سے دور ہیں، رگ جاں سے لاکھ قریں سہی
سر طور ہو، سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی وہ کہیں سہی
نہ ہو ان پہ جو میرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں ان ہی کا تھا، میں ان ہی کا ہوں وہ میرے نہیں تو نہیں سہی
اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

آپ کا باورچی خانہ

ساجدہ حنا

1۔ غذائیت تو ہر چیز میں ہوتی ہے۔ گوشت ہو سبزیاں ہوں دالیں ہوں، لیکن میں تو ہمیشہ اپنے گھر والوں کی پسند کا خیال رکھتی ہوں جو میرے بچے اور شوہر شوق سے کھاتے ہیں۔ ہمیشہ وہ چیز پکاتی ہوں۔

2۔ اگر اچانک مہمان آجائیں اور کھانے کا وقت ہو تو میں ایسا کرتی ہوں جو چیز اس وقت کھانے میں ہوتی ہے میں وہ ہی پیش کرتی ہوں اور ساتھ میں جلدی تیار ہونے والا میٹھا بنالیتی ہوں۔ وہ ہے آلو کا زردہ۔

آلو کا زردہ

اشیا:

آلو	آدھا کلو
چینی	ایک پاؤ
گھی	آدھا پاؤ
ناریل، کشمش، بادام	حسب ضرورت

ترکیب:

آلو چھیل کر کدو کش کرلیں، پھر ان کو ابال لیں چاول کی طرح ایک کنی رکھ کر پھر گھی میں چینی ڈالیں۔ تھوڑی دیر اس کو پکائیں۔ پھر اس میں ابلے ہوئے آلو ڈال کر مکس کریں اور پھر تین منٹ کے لیے دم لگادیں۔ اس کے بعد ڈش میں نکال کر اس پر بادام کاٹ کر ناریل کدو کش کرکے اور کشمش ڈال کر پیش کریں۔

3۔ ہم باہر کھانا کھانے نہیں جاتے کیونکہ میرے شوہر کو باہر کے کھانے پسند نہیں۔ بچے باہر کی چیزیں لے کر کھالیتے ہیں۔

4۔ میں کھانا پکانے کے بعد کچن ساتھ ہی صاف کر دیتی ہوں۔ مجھے گندہ کچن اچھا نہیں لگتا اور ہفتے کے بعد مکمل صفائی کرتی ہوں۔

5۔ موسم کے پکوان موسم کے ساتھ ہی اچھے لگتے ہیں۔ جیسے بارش میں بچوں کی پسند پکوڑے، چپس، آلو کے پراٹھے اور سردی میں مچھلی کی ڈش سب شوق سے کھاتے ہیں۔

6۔ ناشتے میں اکثر تو پراٹھے انڈے اور رات والا سالن ہوتا ہے لیکن اتوار کو خاص ناشتہ ہوتا ہے جیسے حلوہ پراٹھے، آلو والے پراٹھے، مولی والے پراٹھے، پیاز اور انڈے والے پراٹھے۔

پیاز اور انڈے والے پراٹھے

اشیا:

انڈے	تین عدد
پیاز	ایک عدد
نمک، مرچ	حسب پسند
آٹا	تین کپ

ترکیب:

پیاز باریک کاٹ لیں اور انڈے میں ڈال کر مکس کر لیں پھر اس سے آٹا گوندھ لیں۔ دس منٹ رکھ دیں۔ پھر اسے پراٹھے کی طرح بیل کر پکالیں۔ بہت مزے دار پراٹھے تیار ہوں۔ کے چائے کے ساتھ بہت مزہ دیں گے۔

7۔ میں کھانا بناتے وقت بے صبری نہیں کرتی اور آنچ ہلکی رکھتی ہوں۔ کھانا تیار کرتے وقت ہمیشہ پاس ہی رہتی ہوں تاکہ کھانا خراب نہ ہو اور ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔ ہمیشہ بہت اچھا کھانا بنتا ہے۔

8۔ چینی کو چیونٹیوں سے بچانے کے لیے اس میں چند لونگ ڈال دیں۔ سر درد میں پیاز کاٹ کر سونگھنے سے سر کا درد ختم ہوجاتا ہے۔
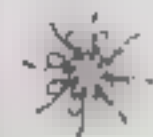
شام کی چائے ہماری طرف سے

صبا ساحر

"آج شام کی چائے ہماری طرف سے" اگر آپ کسی سے ایسا کہہ چکی ہیں یا کہنے والی ہیں تو بے دھڑک کہہ دیں، کیونکہ ہم ہیں نا آپ کے ساتھ ڈشز کے انتخاب سے لے کر تراکیب و تیاری تک۔ اپنے مہمانوں کو مدعو کریں۔ ہماری منتخب شدہ ڈشز سے فائدہ اٹھائیں اور تعریف وصول کریں۔

ٹی ٹائم رول

ضروری اجزا:

گوشت کے پارچے	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
میدہ	دو کپ
آٹا	ایک کپ
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ وضرورت

ترکیب:

پارچوں میں دہی، گرم مسالا، سرخ مرچ، لہسن پیسٹ، ادرک پیسٹ اور نمک ملا کر رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد درمیانی آنچ پر پکا کر بھون لیں۔ میدے میں آٹا، انڈا، بیکنگ پاؤڈر اور ایک چمچہ چینی ملا کر نیم گرم پانی سے سخت گوندھ لیں۔ آدھا گھنٹہ رکھنے کے بعد پتلے پتلے پراٹھے بنالیں۔ (تیار شدہ رول کی پٹیاں بھی استعمال کر سکتی ہیں۔) ٹھنڈے ہوجائیں تو ٹماٹر، سلاد پتے اور

مایونیز لگا کر پارچے رکھیں اور ٹشو پیپر کے ساتھ فولڈ کر کے کیچپ یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

اسپائسی رول بنانے کے لیے آدھا کلو بون لیس چکن میں ابلے ہوئے تین آلو اور دو انڈے ملائیں۔ ساتھ ہی نمک، سیاہ مرچ، ہری مرچ، چوپ کی ہوئی پیاز اور ایک کھانے کا چمچہ مکھن بھی ملائیں۔ سلائسز کو بیلن کی مدد سے چپٹا کریں اور تیار شدہ آمیزہ رکھ کر رول کریں۔ ہلکی آنچ پر گہرے تیل میں تل لیں۔

چکن آلمنڈ کٹلٹس

ضروری اجزا :

چکن قیمہ	آدھا کلو
ابلے آلو	تین عدد
انڈا	ایک عدد
بادام	آدھا کپ
بھنا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو چائے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمے کو تین چمچے تیل میں فرائی کر کے آلو، کترے ہوئے بادام، پسی مرچ، چاٹ مسالا، زیرہ، سویا ساس، انڈا، کارن فلور اور نمک کے ساتھ اچھی طرح مکس کر کے آدھا گھنٹہ رکھنے کے بعد حسب پسند شیپ میں کٹلٹس بنالیں اور ہلکے تیل میں فرائی کرلیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

اسپگیٹی کٹلٹس کے لیے ڈیڑھ کپ ابلی ہوئی اسپگیٹی میں ایک پاؤ مچھلی یا مرغی کا گوشت ملائیں۔ ساتھ ہی ابلے ہوئے دو آلو، سیاہ و سرخ مرچ، نمک، ہرا دھنیا اور مرچ کتر کے مکس کریں اور کسی بھی شیپ میں کٹلٹس بنالیں۔ انڈے میں ڈبو کر بریڈ کرمبز میں لپیٹیں پھر کچھ دیر فریج میں رکھ کر گہرے تیل میں تل لیں۔

منس اوپن سموسے

ضروری اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
میدہ	آدھا کلو
آٹا	ایک کپ
ثابت دھنیا اور زیرہ	ایک ایک کھانے کا چمچہ
سیاہ و سرخ مرچ	ایک ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا، ہری مرچ	حسب پسند
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمہ بھون کر سارے مسالے مکس کردیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ہرا دھنیا اور ہری مرچ کتر کر ڈال دیں۔ میدے میں آٹا، نمک اور دو کھانے کے چمچے تیل ملا کر گرم پانی سے گوندھ لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ چھوٹی چھوٹی روٹیاں بنا کر گرم تیل میں فرائی کریں اور ٹشو پیپر پر رکھ کر اضافی چکنائی جذب کریں۔ قیمہ رکھ کر تہری تہ لگائیں۔ سوئی اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

براؤن بریڈ سینڈوچ

ضروری اجزا :

چکن بون لیس	آدھا کلو
براؤن بریڈ	دس سلائس
انڈے	دو عدد
میدہ	آدھا کپ
ہری پیاز	چار عدد
ہری مرچ، ہرا دھنیا	حسب ضرورت
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ابلے ہوئے چکن کے ساتھ بھنا زیرہ، ہری پیاز، مرچ، دھنیا، نمک ملا کر چوپ کرلیں۔ سلائس کی آدھی سائیڈ پر چکن آمیزہ رکھ کر دوسری سائیڈ سے پلٹ کر ہلکا سا دبائیں۔ میدے کو انڈے میں یکجان کرلیں۔ سینڈوچز کو انڈے میں ڈبو کر درمیانی آنچ پر فرائی کریں اور گرم گرم پیش کریں۔

ایک سینڈوچ بنانا چاہیں تو چار انڈوں میں دو ہری پیاز، دو گاجر باریک چوپ کر کے نمک کے ساتھ پھینٹیں اور آملیٹ فرائی کرلیں۔ آٹھ سلائسز کے کنارے نکال کر تکون شیپ میں کاٹ لیں۔ مایونیز لگا کر آملیٹ کا تکون حصہ رکھیں۔ اوپر دوسرا تکون سلائس رکھ کر ہلکا سا دبائیں۔ جھٹ پٹ تیار ہونے والے ایک سینڈوچ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

ڈبل روٹی کا حلوہ

چھوٹی ڈبل روٹی	ایک عدد
انڈے	تین عدد
دودھ	دو کپ
چینی	ایک کپ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

ڈبل روٹی کے کنارے نکال کر سلائس کا چورا کرلیں۔ انڈوں میں چینی اور دودھ خوب مکس کرلیں۔ گرم گھی میں چار الائچی دانے کڑکڑائیں۔ ڈبل روٹی کا چورا ڈال کر سنہری کریں۔ پھر انڈے والا آمیزہ ڈال کر تب تک بھونیں جب تک حلوہ گھی چھوڑنے لگے۔ بادام کی ہوائیاں چھڑک کر پیش کریں۔

ولایتی چکن چاٹ

ضروری اجزا :

چکن بون لیس	ایک پاؤ
مُرمُرے، سیو، چیوڑا	ایک کپ
ابلے ہوئے آلو، میکرونی	ڈھائی کپ
مونگ پھلی بھنی ہوئی	چار کھانے کے چمچے
سرکہ اور کارن فلور	آدھا آدھا کپ
رائی اور اجوائن	ایک چوتھائی چمچہ
اجینوموتو، نمک، سیاہ مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب :

کارن فلور میں رائی اور اجوائن ملا کر فریج میں رکھ دیں۔ چکن میں سرکہ، ہلدی، نمک، سیاہ مرچ، لہسن پیسٹ اور اجینوموتو ڈال کر ہلکی آنچ پر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ سرونگ پلیٹ میں گوشت کے کیوبز، مُرمُرے، سیو، چیوڑا، مونگ پھلی، آلو، ٹماٹر، میکرونی، ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ کتر کر ڈالیں۔ کارن فلور شامل کر کے ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور املی کی چٹنی اور پاپڑی کے ساتھ لطف دوبالا کریں۔

مکس فروٹ چاٹ بنانا پسند کریں تو چھ کیلے، دو سیب، ایک پپیتا، کیوبز میں کاٹ کر ایک انار کے دانے اور ایک کپ انگور کے ساتھ مکس کریں۔ آدھا کپ پانی میں ایک کپ چینی پکا کر شامل کریں۔ اوپر ایک لیموں کا رس اور چاٹ مسالا چھڑک دیں۔

پلین کیک گیٹو

پلین کیک	ایک عدد
آئس کریم	آدھا لیٹر
فریش کریم	ایک کپ
جیلی	ایک پیکٹ
آئسنگ شوگر	حسب ضرورت

کیک کو ہاتھ سے چورا کرلیں۔ آئس کریم اور فریش کریم اچھی طرح ملا کر آمیزہ تیار کرلیں۔ اگر میٹھا کم لگے تو آئسنگ شوگر ملالیں۔ باؤل میں سیٹ کر کے آدھے گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ جم جائے تو جیلی سے گارنش کر کے پیش کریں۔

کیک بار اگر بنانا پسند کریں تو ایک پلین کیک کو خوب اچھی طرح میش کرلیں۔ آدھا کپ جوس یا اسکواش اور بادام کی ہوائیاں ڈال کر مکس کریں۔ بارز بنائیں، پھر پسے ہوئے کھوپرے میں کوٹ کر کے فریش کریم کے ساتھ پیش کریں۔

میری خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

ثوبیہ صفدر۔ صوابی

1 میرا نام ثوبیہ صفدر ہے۔ پشاور یونیورسٹی میں ایم ایس سی سال اول کی طالبہ ہوں۔ میں 31 مئی 1992ء کو کیپٹن کرنل شیر خان کے ضلع صوابی میں پیدا ہوئی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ میں اپنے کزنز میں سب سے بڑی ہوں۔ ددھیال میں پہلے پانچ سال تک میں اکلوتی رہی۔ اس لحاظ سے جتنا پیار میرے حصے میں آیا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ میرے پاپا' کے پی کے' کے محکمہ وائلڈ لائف میں اعلا عہدے پر فائز ہیں۔ اس وجہ سے جہاں جہاں ان کی تعیناتی ہوتی رہی' وہاں ہم بھی شفٹ ہوتے رہے۔ جیسے ایبٹ آباد' سوات' چترال اور اب دو سال سے پشاور میں ہیں۔ شمالی علاقہ جات جو سیر و سیاحت کے لیے مشہور ہیں۔ وہاں پر وائلڈ لائف کے ریسٹ ہاؤسز بنے ہوئے ہیں اور ہمیں ہر سال مری' ایوبیہ' گلیات' کاغان' گلگت' غرضیکہ تمام خوب صورت مقامات پر قیام کا موقع ملتا ہے۔

2 خوبیاں اور خامیاں۔ اس مرحلے پر میں نے اپنی فرینڈز سے رائے طلب کی کہ وہی میری شخصیت کے بارے میں بہتر تجزیہ کر سکتی ہیں۔ یونیورسٹی فیلوز کے علاوہ میری سب خالائیں' پھپھیاں اور چچیاں میری رشتے دار کم' سہیلیاں ہی ہیں۔ کرن پھپھو مجھ سے صرف دو سال بڑی ہیں اور میرے دوستوں میں دو اور تین سال کے بچے بھی شامل ہیں۔ ہاں تو کوئی میری ہائٹ' کوئی اسٹائل' کوئی آنکھوں' کوئی ہنسنے تو کوئی گال پر بننے والے ڈمپلز کی تعریف کرتا ہے۔ مزاج کے لحاظ سے بہت لونگ' کیئرنگ اور مخلص ہوں۔

میں نے سب سے پوچھا کہ کوئی خامی' کوئی بری عادت بھی تو بتائیں۔ سب کا جواب نفی میں ہے اور سب مجھ سے راضی اور خوش ہیں۔

اب جانے میں' اتنی اچھی ہوں یا یہ ان کا حسن نظر ہے۔ بہرحال۔ اللہ جی! آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنا خوش قسمت بنایا مجھے۔ اپنے ہم عمروں کی طرح میں بھی نت نئے کپڑوں' جوتوں' جیولری اور بیگز کی شوقین ہوں۔ میری امی میرے اس شوق کی تکمیل کے لیے زیادہ تر وقت مصروف رہتی ہیں۔ چپس اور چاکلیٹ بہت شوق سے کھاتی ہوں۔ پھر بھی دبلی پتلی ہوں۔

مشاغل۔ پنسل سے اسکیچز بنانا' تھوڑا بہت شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتی ہوں۔ بحیثیت مسلمان نماز' روزے کی پابندی کا ذوق و شوق بھی اللہ نے عطا کیا ہے۔ تلاوت کلام پاک' اچھی کتابیں پڑھنا اور دل لگا کر اسٹڈی کرنا۔

"پیر کامل' مصحف اور میں عبدالقادر ہوں" وہ ناولز ہیں جو دین کی طرف راغب کرتے ہیں۔ مجھے لکھنے کا شوق ہے۔ ابھی تک تو ڈائریوں میں لکھتی رہی ہوں۔ روشنی' میرا قلمی نام ہے۔ میں نے کئی افسانے اور ایک ناول "بنت آدم" کے نام سے لکھا ہے۔ میں اس کو کتابی شکل میں چھپوانا چاہتی ہوں لیکن کلثوم ہدایت جو کہ میری چچی ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ پہلے اسے خواتین ڈائجسٹ میں بھیج دو' وہاں سے معیاری اور غیر معیاری کا پتا چل جائے گا۔

ابھی تو میں فائنل ایگزیم کی وجہ سے مصروف ہوں۔ اس لیے صرف تعارف بھجوا رہی ہوں۔ فارغ ہونے پر باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ سے تعارف یا وابستگی اتنی پرانی نہیں لیکن میں اس کو ایک معیاری ڈائجسٹ سمجھتی ہوں۔

سالگرہ۔ سالگرہ تو باقاعدگی سے مناتی' بلکہ انجوائے کرتی ہوں۔ بارہ سال کی عمر تک امی اور پاپا میری سالگرہ مناتے رہے۔ جیسے کیک منگوانا' کمپنیں غبارے وغیرہ اس کے بعد انداز کچھ بدل گیا۔ کیونکہ پاپا جانی کا کہنا تھا کہ اب تم چھوٹی بچی نہیں' بلکہ بڑی بچی ہو۔ تو اب سالگرہ والے دن یعنی 31 مئی کو فیملی کے ساتھ باہر کھانا' منہ مانگے گفٹ اور نقدی وصول کرنا۔ فون پر تو سب ہی وش کرتے ہیں۔

انیسویں سالگرہ پر کچھ کچھ افسردہ بھی رہی' کیونکہ بچپن کا وری اینڈ ہوا۔ آپ سب کی طرح مجھے بھی نہیں پتا کہ زندگی میں اور کتنی برتھ ڈے منا سکوں گی۔

میں نے اتنی ساری باتیں لکھ دیں کہیں آپ بور نہ ہو جائیں۔ 28 اگست 2013ء کی رات بارہ بج چکے ہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ لکھتے لکھتے میرا ہاتھ بھی تھک گیا اور میں نے صبح سویرے اٹھنا بھی ہے شاید۔۔۔

آگے کلثوم ہدایت کی تحریر

ساتھیو!

اللہ کی پاک ذات کو ثوبیہ کا زندہ اٹھنا منظور نہیں تھا۔ چھوٹا بھائی اور بہن ثوبیہ کے ساتھ سوئے ہوئے تھے۔ کسی کے پاؤں سے گیس والو کھل گیا تھا اور پھر بجلی کے ماسکیٹو کلر سے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس کے بہن' بھائی باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جبکہ ثوبیہ باہر کا راستہ نہ پا کر واش روم میں گھس گئی۔ زندگی کی آس میں اس نے خود پر شاور کھول لیا لیکن۔۔۔ ملک الموت اپنی ڈیوٹی پوری کرنے وہاں پہلے سے موجود تھا۔ آہ۔۔۔

اس نیک فطرت اور خوش اطوار لڑکی کی قسمت میں اللہ نے آگ اور پانی کے ذریعے شہادت لکھی تھی۔ رات کے تین بجے ہمیں فون پر ثوبیہ کے کمرے میں آگ لگنے کی اطلاع ملی۔ فجر کی اذان سے پہلے سب رشتہ دار پشاور پہنچ گئے۔ جہاں ہنستی مسکراتی ثوبیہ اب ڈیڈ باڈی کی صورت میں سامنے تھی۔ سب کے اوپر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہر کوئی ثوبیہ، ثوبیہ پکار رہا تھا۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ بحکم الٰہی ہر رنگ کے کپڑوں میں خوب صورت نظر آنے والی اور ہر اچھا فیشن اپنانے والی ثوبیہ نے خاموشی سے بغیر کسی اعتراض کے سفید ان سلا لباس پہنا اور تابوت میں بند ہو گئی۔

ہر چھوٹی بڑی خوشی کے موقع پر ہم مل کر صوابی سے پشاور آتے رہتے ہیں لیکن آج۔ آج واپسی پر ہمارے ساتھ ایک ایمبولینس بھی محو سفر تھی۔ جس میں چہکتی چڑیا خاموش لیٹی سفر آخرت پر روانہ تھی۔ ایگزامینیشن ہال کے بجائے ثوبیہ اپنے گاؤں پہنچا دی گئی۔ جہاں دن گیارہ بجے بڑوں کی ثوبی اور بچوں کی آپی، آہوں، سسکیوں اور چیخوں کے درمیان اپنی دادی کے پہلو میں سپرد خاک ہوئی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

پیاری ثوبیہ۔ 21 سال کی چھوٹی سی عمر میں تو نے ایسا کون سا نیک عمل کیا کہ پروردگار نے تجھے اپنے پاس ہی بلا لیا۔

ثوبیہ۔ ! تیرے جانے کے بعد اب موت سے تو نہیں۔ البتہ زندگی سے ضرور ڈر لگتا ہے کہ جانے کس لمحے اس کا خاتمہ ہو۔ تو بھی تو قبر میں اترنے سے نو گھنٹے پہلے تک زندہ سلامت تھی۔

تمام قاری بہنوں سے درخواست ہے کہ کم از کم ایک دفعہ ثوبیہ کے ایصال ثواب کے لیے درود شریف اور استغفار پڑھے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

میں ہوں کلثوم ہدایت یعنی مسز ہدایت علی شاہ مردان سے۔ 28 اور 29 اگست کی رات ہماری فیملی کے لیے اللہ کی جانب سے امتحان ثابت ہوئی۔ مذکورہ بالا واقعے میں میری عزیز از جان ثوبیہ موقع پر جاں بحق ہوگئی۔ جبکہ اس کے جواں سال ماموں ستائیس سالہ امتیاز علی ایک ہفتہ بعد فوت ہوئے۔ ثوبیہ تھی تو میرے جیٹھ کی بیٹی لیکن اپنے سسرالی رشتے داروں میں مجھے سب سے زیادہ عزیز اور میری چھوٹی بہنوں کی طرح تھی۔

چھوٹی عید کے موقع پر یعنی مرنے سے بیس دن پہلے وہ اور میں خواتین ڈائجسٹ کے مختلف سلسلے دیکھ اور ڈسکس کر رہے تھے تو اس نے کہا کہ میں پہلے "میری خامشی" میں اپنا تعارف بھیجوں گی لیکن اس کو مہلت نہ ملی۔ اس کے پانچ پیپرز ہو چکے تھے۔ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ جب ہم اس کے بہن بھائی کی، جو کہ زخمی تھے عیادت کر کے واپس آرہے تھے تو میرے سسر صاحب نے کہا کہ کلثوم! تم ثوبیہ کا حادثہ لکھ کر ڈائجسٹ میں بھیجو۔ میں تذبذب کا شکار تھی، لیکن ان کی فرمائش بھی پوری کرنی تھی۔ سو میں نے اللہ پر توکل کر کے یہ سطریں لکھ دیں جو کہ خود ثوبیہ نے لکھنی تھیں۔ یاد رہے کہ میرے سسر ابو میری وجہ سے کبھی کبھی ڈائجسٹ پڑھ لیتے ہیں۔ افسانے اور ناول نہیں لیکن انٹرویوز اور دیگر سلسلے۔

ان کی عمر پچھتر سال ہے اور مسلم کمرشل بینک سے منیجر ریٹائرڈ ہیں۔ ثوبیہ کی وفات سے بہت غم زدہ ہیں۔ کہتے ہیں میں تو بونس کی زندگی گزار رہا ہوں لیکن ثوبیہ ان کی پوتی۔ اس کے جل کر مرنے سے غم دہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ثوبیہ کی حادثاتی موت سے ان تمام پاکستانی گھرانوں کا دکھ ہم نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا، جن کے پیارے بم دھماکوں میں مر جاتے ہیں۔

اگر آپ اپنی زندگی کامیاب گزارنا چاہتے ہیں تو جب صبح سو کر اٹھیں تو اپنے آپ سے کہیں کہ آپ اس دن کو کامیاب بنائیں گے۔

ایک فلسفی کا قول ہے۔

"صبح کو کمانڈ کرو اس لیے کہ صبح دن کو کمانڈ کرتی ہے۔"

اگر آپ آدھا گھنٹہ کم سوئیں تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ اگر آپ اطمینان سے ناشتہ کریں گے تو آپ کا ہاضمہ خراب نہیں ہوگا۔ اگر آپ وقت مقررہ پر کام پر پہنچ جائیں گے تو آپ کو غیر ضروری عجلت نہیں ہوگی اور اپنے کام کو تسلی بخش طریقے سے کر سکیں گے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات صبح کا موڈ ہے یعنی وہ ذہنی اور جذباتی رویہ جس سے آپ دن کا آغاز کرتے ہیں۔

آپ کن خیالات واحساسات کے ساتھ دن کا آغاز کرتے ہیں۔

کیا آپ کے مزاج کا پارہ کم ہے، مناسب ہے یا کافی چڑھا ہوا ہے؟

کیا آپ کی مزاجی کیفیت درست نہیں؟

کیا آپ بد مزاج اور کم سخن ہیں؟

کیا آپ اس بات سے ناخوش ہیں کہ اگلے روز بھی آپ کو کام کرنا پڑے گا؟

غیر ضروری ہیجان، بہت سی غیر ضروری تھکن کا باعث ہوتا ہے۔

بہت سے سادہ اور آسان طریقے ہیں جن کے ذریعے ہم ہیجان سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک کرسی پر بیٹھ جائیں اور زور زور سے سانس لیں اور ہر مرتبہ سانس کے زور کو کم کرتے جائیں اس سے دل کو تقویت حاصل ہوگی۔ یا کرسی پر بیٹھ کر اپنے اعضاء کو آہستہ آہستہ حرکت دیں۔

اگر ہم کوشش نہیں کریں گے تو کامیاب نہیں ہوں گے۔

جس کسی نے شک اور خوف پر فتح حاصل کرلی اس نے ناکامی پر فتح حاصل کرلی۔

☼ ☼ ☼

ثمر۔ کراچی

انٹر سائنس کی طالبہ ہوں متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھتی ہوں اور مسئلہ یہ ہے کہ میں دوسروں کے پیسے اٹھالیتی ہوں یعنی چوری کرلیتی ہوں اور کوئی پوچھے بھی تو بتاتی نہیں زبان پر آتے آتے رہ جاتا ہے بعد میں بے انتہا افسوس بھی ہوتا ہے پھر نماز میں توبہ بھی کرلیتی ہوں اور آئندہ کے لیے دعا کرتی ہوں کہ یہ نہ کروں، لیکن پھر اٹھالیتی ہوں ایسا لگتا ہے کہ پیسے نظر آتے ہی میں اندھی ہوجاتی ہوں، لیکن اس وقت اٹھاتی ہوں جب میرے پاس پیسے ختم ہوجاتے ہیں ویسے تو جتنے بھی پیسے سامنے پڑے رہیں نہیں اٹھاتی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری یہ عادت کبھی نہیں چھوٹ سکتی۔ میں رشتہ داروں کے ہاں رہتی ہوں وہاں مجھے کوئی پیسے نہیں دیتا کبھی کبھار ابو یا باجی آتے ہیں تو دے دیتے ہیں۔ ویسے مجھے چاہتے تو سب ہیں۔ ان کو جب پتا چلے گا تو بہت غلط بات

ہوگی ان کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ میرا منگیتر بھی مجھے بہت پسند کرتا ہے اگر اس کو بھی پتا چل گیا یا کسی دن میں پکڑی گئی تو میں کتنی ذلیل ہوں گی وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا ہوگا کہ میں ایسی ذلیل ترین حرکت کرتی ہوں۔

ج۔ اچھی بہن! آپ کے خط میں بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں آپ رشتہ داروں کے ہاں کیوں رہتی ہیں۔ یہ نہیں لکھا آپ نے۔ چوری ایک نفسیاتی بیماری ہے اور ایسی خواتین اور حضرات بھی چوری کرتے ہیں اور ایسی چیزوں کی چوری کرتے ہیں جن کو ان کی یا تو قطعاً" ضرورت نہیں ہوتی یا وہ ایک ہی وقت میں ایسی ہزاروں چیزیں خرید سکتے ہیں، آپ پڑھی لکھی ہیں اور آپ کو اس گناہ کا احساس بھی ہے۔

قوت ارادی سے کام لیں اور اس عادت کو ترک کردیں۔

شاہدہ۔ کراچی

تین سال پہلے میری بڑی بہن کی شادی ہمارے دور کے رشتہ داروں میں ہوئی۔ بہن کے دو بچے ہیں۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ بہنوئی کی نیت ٹھیک نہیں۔ بار بار پانی، چائے مانگنا پھر بہانے سے ہاتھ پکڑ لینا۔ مذاق کے بہانے کندھے پر ہاتھ مارنا۔ فضول قسم کی لطیفہ گوئی۔ مجھے اس قسم کی حرکتوں سے شروع سے ہی نفرت رہی ہے، کبھی کزنز کے درمیان بھی اس بے تکلفی کو گوارا نہ کیا۔

بہن امید سے تھیں، ایک دن ان کی طبیعت خراب ہوئی تو بہنوئی صاحب مجھے لینے آگئے ان کا بڑا بیٹا صرف سوا سال کا تھا۔ اسے سنبھالنے کے ساتھ گھر کا کام کاج۔ امی نے میرے منع کرنے کے باوجود مجھے بھیج دیا۔ سارا دن میں آرام سے رہتی مگر شام کو بہنوئی کی آمد پر میں بہن کے بیڈ سے چپک کر بیٹھ جاتی۔ وہ بہانے بہانے سے مجھے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کرتے، لیکن میں سنی ان سنی کردیتی۔ ایک دن انہوں نے مجھے چائے بنانے کے لیے کہا۔ بہن نے بھی اصرار کیا تو مجھے اٹھنا پڑا۔ میں کچن میں گئی تو وہ پیچھے پیچھے آگئے اور کہنے لگے "تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو تم جیسی بہت دیکھی ہیں۔ میری بات مان جاؤ ورنہ میں تمہیں خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔" یہاں یہ بتاتی چلوں کہ میری بچپن سے ہی تایا کے بیٹے سے بات طے ہے۔

میں نے بہن کو یہ بات بتائی تو وہ الٹا مجھ سے ناراض ہوگئیں کہ میں ان کے شوہر پر الزام لگا رہی ہوں۔ میں اسی شام گھر واپس آگئی۔ دو دن گزرے تھے کہ بہنوئی صاحب پھر آگئے۔ بہن کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی انہیں مسلسل الٹیاں آرہی تھیں۔ میں نے امی سے کہا وہ چلی جائیں یا بہن کو گھر بلالیں تو وہ الٹا مجھ پر برس پڑیں۔

بہنوئی صاحب کی ذومعنی باتیں بدستور ہیں۔ اب تو حوصلہ اور بڑھ گیا ہے۔ ان کی دھمکی کے بارے میں سوچتی ہوں تو جان نکلنے لگتی۔ اگر میرے منگیتر یا تایا کی فیملی سے کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگا۔

ج۔ اچھی بہن! آپ کی والدہ کا رویہ انتہائی افسوس ناک ہے اور حالات کے یہاں تک پہنچنے کی ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ وہ اگر سمجھ دار ہوتیں تو اس حد تک نوبت ہی نہ آتی۔ بہنوئی کی اس قدر بے تکلفی اور بے ہودہ مذاق قابل اعتراض ہے، لیکن اب تو بات اس سے آگے جا پہنچی ہے۔ ان معاملات میں ایک حد تک چشم پوشی کی جاسکتی ہے اس سے زیادہ نظر انداز کرنا مجرمانہ غفلت ہے، آپ کی والدہ کو آپ کی بات پر یقین نہیں ہے تب بھی انہیں آپ کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔

آپ اپنی جگہ ثابت قدم رہیں اور کسی صورت اس کے مطالبات کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں۔ اس قسم کے لوگ عموماً" بزدل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے گا۔ بہر صورت آپ کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کوئی دباؤ ہرگز قبول نہ کریں اور بہن کے گھر تو ہرگز نہ جائیں۔

☼

ارم بنگش...... کوئٹہ

س۔ موسم سرما میں میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہاتھ اور پیر ہوتے ہیں۔ ایڑیاں پھٹنے لگتی ہیں اور کالی ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے پیر گندے نظر آتے ہیں۔ کچن میں کام کرتے ہوئے بھی صابن اور ڈٹرجنٹ کا استعمال ہوتا ہے۔ جس سے ہاتھوں پر دھبے پڑجاتے ہیں۔

ج۔

اپنے برتن دھونے کی جگہ پر ایک کھلے منہ کی شیشی یا جار میں ایک لوشن بنا کر رکھ لیں جو برتن دھونے کے بعد آسانی سے انگلیاں ڈبو کر لگایا جاسکے۔ یہ بہترین اسکن ٹانک ہے اور آسانی سے گھر پر بنایا جاسکتا ہے۔

لیموں کا رس	آدھا کپ
گلیسرین	آدھا کپ
گلاب کا عرق	ایک کپ
وٹامن ای کیپسول	تین عدد

ان تمام اشیا کو ملا کر ایک محلول تیار کرلیں اور جار میں بھر کر رکھ لیں۔ برتن یا کپڑے دھونے کے بعد اپنے ہاتھوں پر ملیں۔ سردیوں کے لیے یہ بہترین لوشن ہے۔ اس سے نہ صرف ہاتھ پیر پھٹنے سے محفوظ رہیں گے بلکہ جلد میں نکھار اور ملائمت بھی آجائے گی۔

ہفتہ میں ایک بار ہاتھوں اور پیروں کا مساج بھی ضرور کریں۔ اس کے لیے آپ کو درج ذیل اشیا درکار ہوں گی۔

سرسوں کا تیل	آدھا چچ
زیتون کا تیل	آدھا چچ
گلیسرین	آدھا چچ

انہیں آپس میں ملا کر ہاتھوں اور پیروں پر اچھی طرح مساج کریں۔ (زیتون کا تیل دستیاب نہ ہو تو ناریل کا تیل بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔)

اب ایک کھلے ٹب میں گرم پانی ڈالیں اور اس میں چند قطرے لیموں کا رس، چند قطرے شیمپو، آدھا چچ نمک اور چٹکی بھر میٹھا سوڈا بھی ڈال دیں۔

اب اس گرم پانی میں اپنے ہاتھ پیر ڈبوئیں اور پانچ منٹ بعد ہاتھوں کو جالی دار کپڑے سے رگڑیں اور پیروں کی ایڑیوں کو جھانویں سے رگڑیں تاکہ مردہ کھال اتر جائے۔

اس کے بعد لیموں کا استعمال شدہ چھلکا لے کر ہاتھوں پر اور انگلیوں کی پچھلی پوروں پر رگڑیں۔ یہی عمل پیروں کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر کریں۔

روزانہ رات سونے سے پہلے صرف دس منٹ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو دیں۔

سرسوں کا تیل	دو چائے کے چمچے
لیموں کا رس	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
میٹھا سوڈا	ایک چٹکی
سرکہ	چند قطرے

یہ چیزیں ملالیں۔ بہترین اسکرب تیار ہے۔ اسے ہاتھوں اور پیروں پر رگڑیں۔ جب چینی مکمل کر ختم ہوجائے تو جالی دار کپڑے پر کوئی اچھا صابن لگا کر جھاگ بنالیں اور پاؤں پر رگڑیں پھر جو لوشن آپ نے کچن میں رکھا ہے اسے لگا کر سو جائیں۔ پاؤں کی ایڑیاں صاف شفاف اور پھٹنے سے محفوظ رہیں گی۔